انہوں نے وضعداری کا بڑا خیال رکھا۔ اور اشعار و خطوط میں بھی کئی جگہ اس پر زور دیا
ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

رعایتِ ادب آئینِ من بود ناچارا

ایک نہایت پُرلطف شعر ہے ؎

اگرچہ مے پرستم، پاسِ ہر روش دارم
چراغِ دیر و حرم نورِ چشمِ ہر کس

مرزا کے قوم اور ملک پر بڑے احسانات ہیں لیکن یہ احسانات محض ادبی نہیں۔
مرزا کا صرف یہی کارنامہ نہیں کہ انہوں نے ہماری نظم و نثر کے حوالے میں قیمتی ہیرا جواہرات کا
اضافہ کیا بلکہ ان کی عظیم الشان شخصیت اور مثالی زندگی بھی ہماری قومی روایات کا قیمتی ہیرا
اور ہے۔ داستانِ تاریخِ اردو کا مصنف ان کی نسبت لکھتا ہے "غالب، انسان، دوست،
اُستاد، مربی، مخدوم، خادم، شہری، ہر حیثیت میں بے نظیر آدمی تھے۔" اور اس میں کوئی
شک نہیں کہ بہت کم ہستیاں ہوگئیں جو اولوالعزمی، ذہانت، آزاد خیالی، وسعتِ نظری، ہمدردی،
وسیع المشربی، نفاست پسندی، اور شوخی و ظرافت میں مرزا کے ہم پایہ ہوں۔ مرزا بھی
اپنی طبیعت کی بوقلمونی سے خوب واقف تھے۔ ایک شوخ فارسی شعر میں محبوب سے کہتے ہیں ؎

دہرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم
گرفتم رحم بر سر یاد دانم نے آیدا

جس بارگاہ میں غالب کی شخصیت جلوہ گر ہے وہاں گردنیں تعظیم و احترام کے
سے جھک جاتی ہیں۔ اور مرزا کے عظیم الشان کارناموں اور ادبی ارتقا پر تحسین و آفرین کے
جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن آپ اس بارگاہ سے صرف عقیدت و احترام کے خیالات ہی

زمن جوئے در بدنکو زیستن — جگر خوردن و تازہ رُو زیستن
درشتی بہ نرمی زبوں داشتن — رسد گر ستم، غمزہ پنداشتن
بہ عجز از دروں سُو جگر سوختن — بہ ناز از بروں سُو رخ افروختن
ز دل خار خارِ غم انگیختن — خسک در گزار نفس ریختن
سمن چیدن و در رہ انداختن — دل افشردن و در چہ انداختن
شگفتن ز داغے کہ بر دل بود — نہفتن شرارے کہ در دل بود!!

مرزا نے نہ صرف غم والم اور مایوسی و ناکامی کے عالم میں بھی اپنی شوخ طبعی اور شگفتگی برقرار رکھی۔ بلکہ اقتصادی مشکلات کے باوجود خوش معاشی اور نفاست پسندی کا ایک شاندار نمونہ قائم کیا۔ اسکے علاوہ مرزا کی نفاست پسندی امورِ ظاہری تک محدود نہ تھی۔ بلکہ اسکی بنیاد بہت گہری تھی۔ اور نیک نہادی اور نکوکاری بھی اسکا جزو تھی۔ مرزا غالب ترک بچہ تھے۔ اسلئے جب ان کا کسی سے معرکہ ہوتا۔ تو وہ حریف کا منہ نہ دیکھتے رہتے۔ بلکہ اسکے خلاف سارے حربے استعمال کرتے۔ اسکے علاوہ ان کی مالی حالت اسقدر پست تھی۔ کہ اپنا رکھ رکھاؤ قائم رکھنے میں ہی ان کا سارا اندوختہ ختم ہو جاتا۔ اس سے محتاجوں کی حاجت روائی اور غمزدوں کی تسکین کے جو ارمان تھے۔ انہیں پورا کرنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن ان ارمانوں اور نیک خواہشوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا!

مضبوط ہوش و خرد، مسلسل جدو جہد، زندہ دلی، اور نیک نفسی کے علاوہ جو چیز مرزا کی زندگی میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ وہ ان کی وضعداری، حفظِ مراتب اور رکھ رکھاؤ ہے۔ مرزا ایک شاعر اور آزادہ رو انسان تھے لیکن طبقۂ شرفا کے ترجمان بھی تھے۔ اور عام جمہوری طرزِ معاشرت کی بے آئینی اور یکسانیت شاید ہی انہیں پسندِ خاطر ہوتی۔ اپنی زندگی میں

اور اس بلند مرتبہ کے حصول کے لئے جو محنت اور جدوجہد مرزا کو کرنی پڑی اسکا
اندازہ تب ہوتا ہے۔ جب ان کے ابتدائی کلام کا بعد کے اشعار سے مقابلہ کیا جائے
مرزا خود اس عظیم الشان کایا پلٹ سے واقف تھے کلیات فارسی کے مقدمہ پر کہتے ہیں

"کیست تا از من بہ پیوند اگر نارسیدہ گویم در دلش فرود آید کہ
درین سی سال ہمت را با فطرت چہ آویزش ہائے رفتے دادہ"

مرزا کی تگ و تاز کا میدان شعر و ادب تھا۔ اور انکی ہمت اور جدوجہد کے
اصل کارنامے اسی میدان میں نظر آتے ہیں لیکن عام دنیاوی زندگی میں بھی انہوں نے کوشش اور
معاملہ فہمی کا ثبوت دیا۔ اقتصادی نقطہ نظر سے ان کی سب سے بڑی مہم جاگیر کی بحالی کی تھی جو ناکام رہی
لیکن اسکی تکمیل کے لئے انہوں نے عمر بھر جو کاوش کی ہے۔ وہ کسی سے چھپی نہیں۔ سعی و کوشش کا
کوئی پہلو ایسا تھا جو انہوں نے نہ آزمایا ہو۔ کلکتہ‘ وہ اسی مقصد کے لئے گئے سال سرگرداں رہے اور
دہلی میں بھی جو کچھ ان سے ہو سکتا تھا وہ انہوں نے کیا اس بڑی کشمکش کے علاوہ عام دنیوی معاملات
میں بھی ان کا طرز عمل ایک مستعد اور ہوشمند واقف کار آدمی کا معلوم ہوتا ہے وہ میر مہدی مجروح کو
ایک خط میں لکھتے ہیں "ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے عمل میں آتا ہے"

مرزا غالب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ انکی زندگی کی اقتصادی مہم اس طرح ناکام رہی۔
کہ اس سے ایک ٹوٹے دل والا انسان بد دل اور مایوس ہو جاتا لیکن مرزا کی روزمرہ کی زندگی
میں تلخی و ناکامی کا کوئی نشان نہیں ملتا ان کے اشعار یا ذاتی خطوط میں وہ درد و غم اہل پڑا ہے
جو ان کے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا لیکن اپنی زندگی میں یا دوسروں کے سامنے انہوں نے
جس طرح رکھ رکھاؤ قائم رکھا ہے۔ اس پر ان کے اشعار اور خطوط اور معاصرانہ تذکرے گواہ ہیں۔
مثنوی ابر گہر بار میں کہتے ہیں:-

خجستہ صفات و فرشتہ سرشت | بخوئے تو نیش خویش خرم بہشت
خمد کردہ زینگونہ باوے خطاب | کہ اے چرخِ اندلیشہ را آفتاب
نبودہ بدیں ساں عیارِ سخن | تو افزودۂ اعتبارِ سخن
اگر مرغِ معنی ست عرش آشیاں | کند نیز فکرت ہمانجا نشاں

تو قفلِ خرد را کلید آمدی
نہ آساں در ینجا پدید آمدی؛

ان کی زندگی میں اس مضبوط عقل سمجھ کی کارفرمائی صاف نمایاں ہے اور کسی لحاظ سے اسے مثالی زندگی سمجھنا چاہیئے۔ جب مرزا پیدا ہوئے۔ تو سلطنت مغلیہ کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ آٹھ سال کے تھے۔ کہ لارڈ لیک نے دہلی اور آگرہ فتح کئے۔ اور شمالی ہندوستان میں کمپنی کی مستحکم حکومت قائم کر کے' ان مغل اور افغان قسمت آزماؤں کی سب قابلِ حصول آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ جن سے بیقرار ہو کر انہوں نے اطرافِ ملک میں حکومتیں قائم کی تھیں۔ یا دوسری طرح اپنے آپ کو دنیا میں سربلند کیا تھا۔ اب اس کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور اگر ہوتی بھی۔ تو مرزا کے اپنے حالات سازگار نہ تھے۔ مرزا نے یہ دیکھا۔ کہ اب دنیاوی قدر و منزلت تو میسر نہیں آسکتی۔ زیادہ سے زیادہ کسی کچہری میں محرری یا اہلمدی مل جائے گی۔ انہوں نے اپنی کوشش کی باگ اس راستے پر پھیری' جو اس سیاسی زوال اور کمپنی کے تسلط سے بھی بند نہ ہوا تھا اور شعر و سخن میں عروج حاصل کرنے کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔

کون کہہ سکتا ہے۔ کہ مرزا کا یہ فیصلہ صحیح سمجھ پر مبنی نہ تھا۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے سے وہ اپنے ہمچشموں بلکہ اپنے تمام ہمعصروں سے آگے نہیں نکل گئے؟

خوئے آدم دارم، آدم زادہ ام   آشکارا دم زعصیاں مے زنم

مرزا کے کلام کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اُن کا دل یوگیوں یا دلیوں کا دل نہ تھا بلکہ عام انسانوں کا۔ وہ شاعر تھے۔ عام انسانوں سے زیادہ حساس اور اپنے احساسات کے موثر اظہار پر قادر۔ لیکن ان کے جذبات و احساسات وہی تھے۔ جو تمام انسانوں کو بیقرار رکھتے ہیں۔ اس لئے ناظرین ان کے دل کی داستاں میں اپنی کہانی پڑھتے ہیں۔ اور لُطف اُٹھاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کی زندگی میں ایک قابلِ عزت انسان ہونے کی مسلسل کوشش ہے۔ لیکن شاید وہ روایتی اصولوں کے مطابق فرشتہ یا ولی بننا قبول نہ کرتے۔ وہ غالباً یہ حقیقت خوب سمجھتے تھے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا   مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

اگر تمام قدیم نظریوں سے قطع نظر کر کے مرزا کے واقعاتِ زندگی اور ان کی شخصیت پر غور کیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ اس میں تقدس اور ایثار و کرم اس قدر نمایاں نہیں جس قدر مضبوط عقل و ہوش اور متناسب دل و دماغ۔ مرزا طبعاً نیک تھے اور چونکہ انہوں نے طرح طرح کی مصیبتیں خود سہی تھیں انہیں دوسروں کی تکالیف کا پورا احساس تھا اور دل میں انہیں دُور کرنے کی مخلصانہ خواہش تھی لیکن یہ خواہش اس قدر قوی نہ تھی۔ جس قدر ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی وہ مضبوط ہوش و خرد کے مالک تھے اور ان کے واقعاتِ زندگی میں سب سے مستند اور بااثر رہنما ان کی عقلِ سلیم ہی ہے +

مرزا کے جاننے والے ان کی عقل و سمجھ کی خاص طور پر تعریف کرتے تھے۔ میر مہدی مجروح لکھتے ہیں ؎

زہے غالبِ آں صاحبِ عقل و رائے   فراست فزائے خرد آموز کشائے

ڈالی جائے تب بھی وہ ایک بڑا، بلند پایہ، تجربہ کار، معاملہ فہم، جہاں دیدہ بزرگ (بلکہ
گرگِ باراں دیدہ) نظر آتا ہے۔ لیکن عوام کو اس تجربہ کاری اور معاملہ فہمی کے لئے احترا
کا اظہار مقصود ہے۔ اس لئے مذہبیت اور تقدس کی سرزمین میں اسے ایک و
کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور اب اگر کوئی شخص، سعدی کا ذکر شیخ سعدی علیہ
کہکے نہ کرے۔ تو وہ مذاقِ سلیم سے بے بہرہ سمجھا جائے گا!

یہی عمل غالب کے ساتھ ہو رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ احترام و عقیدہ
کے اس غلط اظہار کے لئے نہ صرف مرزا کی زندگی کے بعض ا[illegible] سناک ا
ناقابلِ انکار واقعات سے چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ بلکہ غالب کی شگفتہ اور بوقلموں شخص
کے ساتھ بھی یہ ایک بے انصافی ہے۔ کہ اسے اِس طرح محدود اور یکرخہ طریقے سے پیش
کیا جائے۔ معتقدین چاہتے ہیں۔ کہ تقدس و ولائت کے ایک مختصر شوالے میں غالب کی
مورتی رکھی جائے۔ جس کے سامنے لوگ سرِ نیاز جھکائیں اور اعتقاد کی گردنیں خم کریں
لیکن وہ نہیں دیکھتے۔ کہ بعض مجسموں کا قد و قامت اتنا بڑا ہوتا ہے۔ کہ وہ مختصر شوالو
میں نہیں آسکتے۔ اور ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ موڑ توڑ کر شوالوں کے اندر نصب
کرنے کے بجائے، انہیں اپنے حال پر، آزاد اور بے قید چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ ان
قد و قامت اور نقش و نگار پوری شانِ دلربائی کے ساتھ نمودار ہو!

مرزا کی شخصیت میں جو غیر معمولی کشش ہے اُس کا ایک سبب ان کی بشریت
اور اس پر فخر و ناز ہے۔ ہم اقبال اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے اس امر کو واضح کر چکے
ہیں۔ کہ مرزا کے کلام میں عام انسانی مسائل اور الجھنوں کا بیان ہے۔ اور انہیں اس
امر کے اظہار میں ذرا بھی باک نہ تھا۔ کہ وہ بشری کمزوریوں سے بالا نہیں ہے

کی ہے اور ابی "نگہ پاک میں" کی مدد سے اس کی ایسی تصویر کھینچی ہے جس سے وہ تحقیقاً نہ صرف بے عیب نظر آتی ہے بلکہ اس میں مدار تری، دریا دلی رقیق القلبی، اور تقدس کے نقوش بھی نمایاں ہیں +

مولینا نے اس خاکے میں رنگ بھرا ہے اور غالب کو پورا ایک ولی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کی کتاب (اشاعت اول) میں سب ٹائیٹل ہی غالب کو غالب لکھا ہے اور مرزا کے جو اخلاق و عادات انہوں نے بارھویں باب میں جمع کئے ہیں وہ بھی حیثیت اولیا و صلحا کے ہیں۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں سادہ دل و راست گفتار "ایفائے کرم" "نئے لوگوں سے ہمدردی" "بیکر حسن اخلاق" "احسان لینا گوارا نہ تھا" "تواضع اور انکسار مقاصد خلق" "انکسار" "مروت" "بدرو شرک" "مخالفت سے عفو و درگزر" "تصوف" اور اس سلسلے میں ان کی تمام تحریر کی رجحان اس طرف ہے کہ مرزا ایک سمجھدار دنیادار نہ تھے بلکہ ایک "سادہ دل" ولی صفت انسان تھے +

مشرقی ادبیات کا بڑا اصول ہے کہ جس شخص کا زمانہ سے زیادہ احترام دکھانا ہو اسے ایک فرشتہ یا کم از کم ایک ولی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے خواہ اس مقصد کے لئے ٹھوس واقعات کو ہی کیوں نہ نظر انداز کرنا پڑے اور خواہ تقدس کا روپ دینے سے ممدوح کے اپنے خط و خال ہی کیوں نہ چھپ جائیں ،

اس رجحان کی مثال مسلک سعدی کی نسبت عام نقطہ نظر ہے اُس کی ہرلیات کو چھوڑئیے "گلستاں" کے باب پنجم اور "بوستاں" کے بعض اندراجات میں جو مارد و حمع ہے اس کی وجہ گی میں سعدی کو ولی سمجھا دل لگی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا، اور اگر اس نکتے سے قطع نظر سعدی کی باقی تصانیف اور اس کی زندگی کے کارناموں پر نظر

مافی الضمیر اور ان کے ذہنی ارتقا کی نشو و نما، نظر کے سامنے آجائے۔ کئی مباحث ایسے ہیں (مثلاً جہاں مرزا کو مغلیہ تہذیب و تمدن کا بہترین مظہر بتایا ہے) جن میں مرزا کی افتادِ طبع پر تفصیلی تبصرہ ہوا ہے۔ اندریں حالات ان خصوصیات کو دوبارہ نمایاں کرنا بظاہر غیر ضروری نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ مرزا کے اخلاق و عادات کی نسبت، ملک کے بااثر حلقوں میں ایک خاص نظریہ قائم ہو رہا ہے۔ جو نہ صرف واقعات کے خلاف ہے۔ بلکہ جس سے مرزا کی اصلی شخصیت نظر انداز ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مبحث پر علیحدہ روشنی ڈالی جائے۔

مرزا غالب کا ایک شوخ اور ظریفانہ شعر ہے ؎

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس میں انہوں نے مسائلِ تصوّف، اور معرفت کے بیان کی بنا پر ولایت کا دعوےٰ کیا تھا لیکن انہیں کیا معلوم تھا۔ کہ ان کا یہ دعوےٰ، جو محض تفننِ طبع کا اظہار تھا، فقط مسائل تصوّف کے بیان کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اخلاق و عادات کی بنا پر قبول کر لیا جائیگا!!

مرزا غالب کی نسبت اس نقطۂ نظر کے قائم ہونے میں سب سے زیادہ دخل مولینا حالی کو ہے۔ ان کی کتاب (جیسا کہ انہوں نے خود حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں اعتراف کیا ہے) غالب کی ہمدردانہ ترجمانی ہے۔ اس میں حالی نے مرزا غالب کی زندگی اور تصانیف پر کڑی تنقید نہیں کی۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس کڑی تنقید کا ابھی وقت نہ آیا تھا۔ "یادگار غالب" ایک منصف مزاج لیکن ایک عقیدتمند شاگرد کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ جس میں اس نے اپنے اُستاد، اور زمانہ کے بہترین شاعر کو عقیدت و احترام کی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش

مرزا اپنی تعریف میں بھی وہی مبالغہ روا رکھتے تھے جو مدحیہ قصائد میں ممدوح کی تعریف میں کرتے تھے۔ اسے لفظ بلفظ صحیح ماننا مذاق سلیم کو گوارا نہیں اور یہ امر افسوسناک ہے کہ کلام غالب کی موجودہ شہرت اور مرزا کے معاصرین کی مزعومہ اور مفروضہ ناشناسی سے یہ خیال بہت عام ہو گیا ہے کہ ایک شاعر کی صحیح قدردانی اس کے اپنے زمانے یا ملک میں نہیں ہو سکتی۔ اور آج ایسے شعرا پیدا ہو گئے ہیں جو نہ صرف کا ایک لفظ نہیں جانتے لیکن ایسا اردو کلام جس قوم کے نام معنون کرتے ہیں [1] یعنی ہندوستان میں تو شعر فہم کوئی نہیں رہا ان حضرت کے کلام کو اگر کوئی سمجھ سکتا ہے تو وہ جرمن قوم کے افراد میں ہم شاعرانہ تعلّی کو (اگر اسے شاعرانہ تعلّی ہی سمجھا جائے) بہت شائبہ نہیں گنتے۔ لیکن موجودہ شاعروں اور ان کے حواریوں کی یہ روش کہ ناظرین کو اپنے اشعار کی خوبیوں سے واقف کرنے کی بجائے انہیں مرعوب کرکے اور ان کی نااہلیت جتا کر داد لی جائے کسی طرح قابل تحسین نہیں اور ہمیں افسوس ہے کہ اس طرز استدلال کے عام ہونے کی ایک وجہ مرزا کی موجودہ شہرت اور یہ خیال ہے کہ اپنے زمانے میں اُن کی صحیح قدر نہیں ہوئی +

مرزا غالب کی شخصیت

ہماری کتاب میں صرف مرزا غالب کے سوانح حیات کا خلاصہ اور ان کی تصانیف پر تبصرہ نہیں اس میں ہم نے مسلسل یہ کوشش کی ہے کہ مرزا کی شخصی خصوصیات، بلکہ ان کا

[1] ملاحظہ ہو آلت (؟) ہدایت اور مرزا ماس (؟)

اس منتخب دیوان کے متعلق نہیں۔ جس کو سب شعر فہم حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ اسمیں جن اشعار کے دقیق ہونے کی شکایت ہے۔ انہیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شائع کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ اور لکھا کہ منتخب دیوان سے باہر جو میرے اشعار ملیں۔ انہیں میرا نہ سمجھا جائے۔ اگر مرزا کی اس تحریر کے بعد بھی اس مسئلے میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی۔ تو اس کا جواب نسخۂ حمیدیہ ہے۔ جس میں خارج شدہ اشعار شائع ہوئے ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا۔ تو ان پر کفر کا فتوے عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ اردو ادب ان کا ممنون ہے۔ کہ انہوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو سرخ و سپید خزف ریزوں کے جمع کرنے سے روکا۔ اور ان کی توجہ اس بحرِ شعر و سخن کی طرف کھینچی۔ جس میں غواصی کا صلہ وہ بے بہا موتی ہیں۔ جو اردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں +

سر والٹر رالے نے انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کے متعلق لکھا ہے کہ "ملٹن کا سب سے بڑا مداح ملٹن ہے۔ اور جو کوئی ملٹن کی تعریف لکھے گا۔ اُسے ملٹن کے اپنے خیالات ہی مختلف الفاظ میں ادا کرنے پڑیں گے"۔ یوں تو شاعرانہ خودنمائی میں ہمارے سب شعرا معربی شعرا سے بہت آگے ہیں۔ لیکن رالے نے ملٹن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ وہ غالب پر لفظاً لفظاً صادق آتا ہے۔ لوگ ڈاکٹر بجنوری کے "مقدس وید اور دیوانِ غالب" والے فقرے کو دہراتے ہیں۔ اور اسے حوش اعتقادی اور مبالغے کا انتہائی اظہار سمجھتے ہیں لیکن آخر بجنوری نے غالب ہی کے دو فارسی اشعار لکھ کر شاعرانہ سرہیں ان کی تشریح کر دی تھی ؎

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے　　　دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے
غالب اگر اس فنِ سخن دیں بودے　　　آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

رائے کی تائید کر رہا ہے مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور فارسی تحریر لیے اس قدر ناز تھا اور فارسی غزل گوئی میں وہ شاید خواجہ حافظ کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہم مرزا کے فارسی کلام کی قدر و قیمت خوب سمجھتے ہیں (اور اس کتاب میں ہماری مسلسل کوشش یہ رہی ہے کہ مرزا کے مصنف فارسی اشعار مختلف عنوانوں اور مختلف سلسلوں میں پرو کر ناظرین کے پیش کرتے رہیں تاکہ وہ ان جواہر بے بہا سے واقف ہوں) لیکن پھر بھی کلیات غالب دیوان کے لحاظ سے بہتر یا اس کے ہم پایہ کسی طرح نہیں سمجھا جاسکتا اور اس کے متعلق مرزا کے معاصرین امتداد لواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مولینا فضل حق نواب ضیا الدین نیّر درخشاں۔ کیجہ آہنگی جو رائے تھی وہی درست معلوم ہوتی ہے مرزا کے فارسی کلام کو تو موجودہ زمانے میں بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا اُن کی شاعری کی جو شہرت ہے وہ اُن کے مختصر دیوان ریختہ کی وجہ سے ہے عوام الناس مرزا کا یہ مصرع ؎

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ رباعی حکیم آغا جان عیش کی ہے۔ جو انہوں نے انگریزی دربار کے مشاعرے میں پڑھی تھی حکیم صاحب شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے لیکن شہرت میں ان کا وہ مرتبہ تھا جو اس رباعی سے اختلاف رکھنے والے کئی دوسرے معاصرین کو حاصل تھا اور آخر یہ نامی

لہ ملاحظہ ہو یادگار غالب صر ۲-۲۱ (اشاعت اول)

طبیعت میں پہلے کی نسبت صبر و قرار زیادہ تھا۔

اوراقِ زمانہ در نوشتیم و گزشت — در فنِ سخن یگانہ گشتیم و گزشت
مے بود دوائے ما بہ پیریِ غالب — زاں نیز بہ ناکام گزشتیم و گزشت

غالب کے معاصرین

مرزا نے اپنے اشعار اور خطوط میں جابجا اپنی محرومیٔ قسمت اور معاصرین کی قدر ناشناسی کی شکایت کی ہے۔ اس سے اور یادگارِ غالب کے بعض اندراجات سے یہ خیال عام ہو گیا ہے۔ کہ اپنی زندگی میں مرزا کی کوئی قدر نہیں ہوئی۔ حقیقتاً یہ خیال جس قدر عام ہے۔ اسی قدر غلط ہے۔ اور مرزا کے زمانے کے حالات اور اس زمانے کے تذکروں میں جتنی تحقیق کی جائے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حالاتِ زمانہ کے مطابق مرزا کی قدر شناسی میں اہلِ ادب نے کوتاہی نہیں کی۔ اور اگر مرزا اس سے مطمئن نہ تھے۔ تو اس کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ وہ اپنی تمام تصنیفات کے متعلق جو اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس سے پورا پورا اتفاق صحیح ادبی مذاق کو ناگوار تھا۔ یہ درست ہے کہ شاعری میں جب کوئی نئے راستے نکالتا ہے تو اس کی قدر آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ لیکن مرزا نے فنِ شعر میں کوئی نیا راستہ اختیار نہیں کیا۔ فقط پرانی روش میں اپنے طبعی جوہر سے کامیابی حاصل کی۔ اور اپنے کمالِ شاعری سے غزل کو انتہائی عروج پر پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ اگرچہ آجکل تعلیم اور چھاپے خانوں کی توسیع سے کلامِ غالب کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود غزل کی خوبیوں کے سمجھنے کی صلاحیت اس نسل میں جس کی ذہنی تربیت نئے اصولوں پر ہو رہی ہے۔ غالب کے معاصرین سے کچھ زیادہ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہم تمام حالات کا بالتفصیل مطالعہ کرتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے۔ کہ زمانہ غالب کی نہیں۔ بلکہ معاصرینِ غالب کی

ان کا اتنا حرج آتا تھا کہ انہیں اپنے نیک ارماں پورے کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے انہیں جس طرح دوسروں کے سامنے سرخم کرنا پڑتا تھا، اس سے مکاتیب غالب کے ناظرین واقف ہوں گے۔

یہ مرزا کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب عبدالرحیم خانخاناں جیسے شعر کے مربی موجود نہ تھے اور مغلیہ شان و شوکت کا سرچشمہ جو کبھی عرفی اور نظیری کے زمانے میں زور شور سے بہہ رہا تھا خشک ہو چلا تھا ؎

چوں کدر شد و آمدے در ملو ما ۱۵

ایسی حالت میں اگر وہ اہل من الدنیا کے اصول پر عمل کرتے اور قناعت کو اپنی سپر بناتے تو ساری زندگی ندا الحمیداں سے کٹ جاتی لیکن قومی کیرکٹر اور ابتدائی تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بہت سے گھونٹ پینے پڑے ؎

سرارمست ماکساں ریہ خاک لب ارحاکوس حسں پاک یاک

لیکن اس بے بسی کی حالت میں بھی مرزا کی آنکھیں غیروں سے محبت برقرار رہی اور بعض اوقات تو ان پر وہ قابل رحم نفسیاتی کیفیت طاری ہو جاتی جسے انہوں نے ایک شعر میں نظم کیا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اخیر عمر میں جب انہوں نے مشق فنا شروع کی۔ ان کی خواہشات میں بدلاؤ لوہاں آگیا اور اگرچہ اقتصادی مشکلات سے مرتے دم تک چھٹکارا نہ ہوا لیکن اب

اظہار کرتے ہیں۔ کہ وہ اکبر یا شاہجہاں کے زمانے میں پیدا نہ ہوئے۔ اور یہ امر بھی قرین قیاس
ہے۔ کہ اگر وہ مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں پیدا ہوتے۔ تو ان کی حسب استحقاق قدر
ہوتی۔ اور انہیں مالی مشکلات اور مصائب سے بُری طرح دوچار نہ ہونا پڑتا۔ حقیقت یہ
ہے۔ کہ جس زمانے میں مرزا پیدا ہوئے۔ اس میں مغلوں کی جو حالت تھی۔ اس کو دیکھتے
ہوئے۔ اگر مرزا اپنے کلام میں غم اور مایوسی کا اظہار نہ کرتے۔ تو وہ مغلوں کے صحیح ترجمان
ہی نہ ہوتے!

حُبِّ دُنیا کے نقصانات

مرزا میں اگر مغلوں کی قومی خوبیاں موجود تھیں۔ تو ان کی قومی خامیوں سے بھی وہ بری نہ تھے۔ ہم کہہ چکے ہیں۔
کہ لطافت پسندی اور دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت مغلوں کی ایک قومی خصوصیت ہے۔
اور جس قوم کو دنیا کی اچھی چیزوں سے رغبت ہو۔ اسے "اقلل من الدنیا" کا اصول سمجھنا اور
اخذ کرنا بڑا مشکل ہے۔ یہ زریں اخلاقی اصول جسے اختیار کئے بغیر انسان اپنی ضروریات
اور مادی دنیا کا مالک نہیں بلکہ غلام بن جاتا ہے۔ اور جس کی حکمت اور اہمیت عہدِ صحابہ
کے عربوں (اور حال کے بعض ہندو راہنماؤں) نے بخوبی سمجھی ہے۔ مغلوں نے کبھی اختیار
نہ کیا۔ اپنی حکومت کے زمانے میں تو شاید انہوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔
لیکن جاہ و حشمت ختم ہو جانے کے بعد بھی ہر ایک کی یہی کوشش رہی۔ کہ جس طرح ہو سکے۔
گزشتہ شان و شوکت کی کم از کم ایک کھوکھلی سی نقل برقرار رہے۔

مرزا بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اللہ نے ان کو نیک طبیعت اور حساس دل دیا
تھا۔ ان کے ارمان تو یہ تھے۔ کہ جس شہر میں وہ رہیں۔ اس میں کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔
لیکن ان کی اپنی ضروریات اتنی بڑھی ہوئی تھیں۔ اور نوکر چاکر، مکان، خورد و نوش پر ہی

مصیبتوں کے سامنے بےبس نہیں ہو جاتا تاہم ان حالات کا اسے بھی افسوس اور رنج ہوتا ہے لیکن وہ ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا مرزا غالب کے متعلق بھی یہ ایک امر واقعی ہے ۔ اگرچہ ان کے اشعار میں جن کا تعلق دوسروں سے ۔ یا خود ان کی اپنی ذات سے ہے مایوسی کا اظہار صاف ہے لیکن زندگی میں انہوں نے غم کے آگے سر نہیں جھکایا اور اپنی زندہ دلی برقرار رکھی ہے ۔ ایک ا الی تقصد د کے اعتبار میں ؎

درحسن رفیقاں گل تماشائے قدم ہرچند تف تسکیم سوخت بہ صحرا
در بزم حریفاں رگ مہتاب کشودم گر خود بہمہ گردوں مکم ریخت بہ صحرا

اس کے علاوہ ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ مرزا کی زندگی اور شاعری میں غم پر قابو پانے کی مسلسل کوشش ہے ؎

ندیم جم ہستی مو ہو مے من میں
آویزش محبت و تزم و طبع حواں را

مرزا کے کلام میں غم کا بیان میر تقی میر کی طرح نہیں خود راسی طلسم سے پھوڑے کی طرح پھوٹ بہتے ہیں اس میں ضبط کی مسلسل کوشش ہے ۔ اس نفسیاتی کشمکش کو خود انہوں نے ایک دلچسپ تشبیہ کی مدد سے واضح کیا ہے ؎

لسکر رہ کا ہیں نے اور سیلے یہ اظہر لے بچے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

مرزا کے غم والم کے متعلق یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے جب مغلیہ حکومت نزع کی حالت میں تھی ان کی اپنی ذاتی مصیبتوں میں بھی مغلیہ حکومت کے زوال و ادبار کو بڑا دخل تھا وہ خود بار بار اس بات پر رنج و حسرت کا

ایک عظیم الشان کام ہے۔ اسی کو اختیار کرلیا۔ "ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ بودم مرا بادل فریفت۔ کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است سخن گستری رُو بہ آورد۔ ناگزیر بسیجاں کردم و سفینہ در بحرِ شعر رواں کردم و قلم علم شد و نیر پائے شکستہ را قلم۔" مرزا اور قدیم مغل امرا اور حکمرانوں کی کوششوں کے میدان مختلف تھے۔ لیکن کیا کوئی اس امر سے انکار کرسکتا ہے۔ کہ مرزا نے اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے وہی بلند ہمتی اور اولوالعزمی دکھائی۔ جو ان کے دوسرے ہم قوموں نے ملک گیری اور نظم و نسق سلطنت میں؟ قلمروِ شعر و سخن میں مرزا کے مقاصد اسی طرح بلند نہ تھے۔ جس طرح سیاسیات کی دنیا میں مغل فاتحین کے؟ اور کیا ان کے حصول کے لئے انہوں نے اسی طرح مسلسل جدوجہد نہیں کی؟ مرزا کے ابتدائی طرزِ شاعری میں بڑے عیب تھے۔ اور جس طرح انہوں نے خود اس میں مسلسل اصلاح اور ترقی کرکے اپنے تمام پیشرو ہندوستانی شعرا سے سبقت حاصل کی ہے۔ وہ خود ان کی روحانی سربلندی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ فارسی دیوان کے اخیر میں لکھتے ہیں "گمان نبرند کہ رہ گذر تنگ بود۔ بارہ انجام لنگ۔ حاشا کہ رہرو را بدل از نگارین۔ باطہائے سرِ راہ بندے و خوے را بہمراہ نشیناں ایں مرحلہ پیوندے بودہ باشد۔

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم

کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش"

غم کا مقابلہ

مرزا کی نسبت شاید کہا جائے۔ کہ اگر وہ واقعی بلند حوصلہ تھے تو ان کی شاعری میں غم و الم کا عنصر کیوں اس قدر نمایاں ہے؟ لیکن کیا ایک باحوصلہ شخص کو غم و الم سے دوچار نہیں ہونا پڑتا؟ مصیبتوں سے بری رہنا تو ایک اتفاقی بات ہے اس میں باحوصلہ یا بےحوصلہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ باحوصلہ انسان

وہی مرتبہ ہے جو مغرب میں اہلِ روما کا۔ اور جو خصوصیتیں قدیم اہلِ روما کے کردار میں موجود
تھیں وہی مغلوں میں پائی جاتی تھیں۔ اہلِ روما کی طرح ان کی بھی تمدنی صفتیں تھیں
جو جہاں جاتیں ایسا سکہ جما لیتیں۔ انہی کی طرح ان کے عزائم اور حوصلے بلند تھے۔ انہی
کی طرح تیر اندازی عقابی نظریں تھیں۔ انہی کی طرح انہیں بھی یادِ تہذیب اور برتری کا بھی احساس
تھا۔ ہمارے شاعر نے ایک ناقدرداں حاکم کو مخاطب کرنے کے لئے فارسی قطعہ کہا۔ اس سے
اس قومی احساس کا اندازہ ہوتا ہے ؎

با ترک ستیزہ مکن اے میر سپاہ — پیداست کہ مردانگیِ ترک عیان است
گر رود سپاہی دستِ نہ کج کوش — آن را کہ شماست چہ ساخت نہ آ

بدقسمتی سے مرزا غالب اس زمانے میں پیدا ہوئے جب مغلیہ حکومت کا چراغ
ٹمٹما رہا تھا اور مغلیہ سیرت اور ذہنیت کے اظہار کے لئے وہ میدان کھلے نہیں رہے تھے
میسر نہ آئیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی عملی اور شاعری میں بھی وہ روح
جلوہ افگن ہے جس نے زیادہ سازگار حالات میں مغلوں کو مشرق سے مغرب تک ایشیا کا حکمراں
بنا دیا تھا۔ مرزا کی شخصیت یادگارِ غالب اور اردوئے معلّیٰ میں پوری طرح جلوہ گر ہے
اور اس کی عظمت اور وجاہت سے انکار کرنا ناممکن ہے۔ اولوالعزمی اور بلند حوصلگی میں
وہ بہترین مغل امرا اور ارکانِ سلطنت کے ہم پایہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مغل امرا کے حوصلہ مردانہ
کا اظہار تو میدانِ کارزار میں یا سلطنت کے نظم و نسق میں ہوتا تھا اور مرزا کی روحانی عظمت اور
سربلندی کا اظہار سخن گوئی میں ہوا۔ مرزا کو اس امر کا قوی احساس تھا کہ شعر گوئی میں کمال
حاصل کرنا بھی کارِ نمایاں ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ میرے آبا و اجداد سپہ سالار اور امرائے
کلاہ و کمر تھے مجھے یہ تو نصیب نہ ہوا میں نے سوچا کہ حقیقت سے پردہ اٹھانا بھی

اس رواداری پر تھی۔ اور یہ رواداری اور وسعتِ مشرب مرزا غالب کی بھی ایک نمایاں خصوصیت تھی عملی زندگی میں ہندوؤں اور عیسائیوں سے جو ان کے تعلقات تھے وہ سب کو معلوم ہیں۔ اشعار میں بھی جا بجا اس رواداری کی تعریف کی ہے ؎

سر از حجابِ تعین اگر بردل آید   چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش می تواں کردن

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے   مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کلام مجید میں جہاں جا بجا رواداری کی تلقین کی ہے۔ وہاں نصاریٰ کو دوسری قوموں کے مقابلے میں بالصراحت سراہا ہے۔ لیکن غالب اس زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے قبضے سے نصاریٰ کے قبضے میں منتقل ہو رہی تھی۔ اور اس تبدیل حالات سے جو شکایتیں مسلمانوں کو ہوئیں۔ انہوں نے اُن کے تمام نقطۂ نظر پر اثر ڈالا۔ اور اس زمانے میں بعض مسلمانوں نے عیسائیوں کی طرف ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس میں اسلامی رواداری یا خوش خلقی کا شائبہ نہ تھا[1]۔ غالب نے اس موقع پر بھی اپنی حکیمانہ رواداری کو ترک نہیں کیا۔ اور نہایت سخت الفاظ میں اس طرزِ عمل کی مذمت کی ؎

غالب کساں ز جہل حکیمش گرفتہ اند
بے دانشے کہ طعنہ بر اہلِ کتاب زد

اولوالعزمی اور بلند معیاری مغلوں میں رواداری اور دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی قابلیت تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنے معیار پست کر دیتے تھے۔ مغل ہندوستان میں حکمران ہو کر آئے اور حکمران ہو کر رہے۔ اور ان کی ذہنیت بھی شروع سے آخر تک حاکمانہ ہی رہی۔ اقوامِ مشرق کی تاریخ میں مغلوں کا

[1] ایک ... صاحب کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ جب انہوں نے ایک یورپین افسر سے ہاتھ ملایا۔ تو جب تک اس ہاتھ کو دھو کر پاک نہ کر لیا۔ اسے باقی جسم کو چھونے نہیں دیا۔

ضروری نہیں۔

مغل بادشاہوں کی مصلحانہ کوششیں ممکن ہے بہت نمایاں نہ ہوں لیکن غالباً اس امر سے سب اتفاق کریں گے کہ ان کے نظام حکومت میں ایک غیر معمولی توازن تھا۔ اور انہوں نے بالعموم ہر قسم کے افراط و تفریط سے پرہیز کیا۔ یہی تو میاں غالب کی طبیعت کا خاصہ تھیں۔ اور انہیں اس پر بڑا ناز تھا۔ دیوان فارسی کے مقدمہ میں کہتے ہیں ؎

نہ حیالم کہ بہ عقیدۂ خویش	از فسون کسے ہراس کنم
نہ توانم کہ از نصیحت و وعظ	عالمے را بہ خدا شناس کنم
نہ کہ اخبار پاستانے را	دلو انساہا قیاس کنم
نہ کہ زآثار ہر چہ مشہور است	اثرے تا ہ اقتباس کنم
نہ کہ از بہر حلہ ہائے بہشت	ترک آرائش لباس کنم
نہ کہ در عالم فراخ روی	عار از تہ مدہ پلاس کنم
چوں نہ من ساقیم نہ محتسم	نہ بریزم نہ مے نکاس کنم

دلو احسب رسمی در نامم
نہ بہر مدعا مکاس کنم

ایک اردو قطعہ میں کہتے ہیں ع

ہم نہ تبلیغ پہ مائل نہ غلو کے قائل

رواداری ہم لکھ چکے ہیں کہ جو لوگ مختلف طریقوں اور اصولوں کو عملی نتائج کے اعتبار سے پرکھتے ہیں ان میں قدرتاً رواداری اور متحمل مزاجی آجاتی ہے مغل بادشاہوں بالخصوص بابر ہمایوں۔ اکبر جہانگیر۔ شاہجہاں کے نظام حکومت کی بنیاد

ہمواریٔ طبعی

نفاست پسندی اور خوش معاشی کے علاوہ مغلوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہمواریٔ طبعی یا افراط و تفریط سے پرہیز ہے۔ ہندوستان میں قریباً تین صدیاں مغلوں نے حکومت کی۔ اور اس تمام عرصے میں سوائے اورنگ زیب کے (جو خاص حالات سے مجبور ہوا) کوئی بادشاہ ایسا نہ تھا۔ جس نے کسی خاص مسلک کے لئے غیر معمولی جوش یا غلو دکھایا ہو۔ مغلوں کا نظامِ حکومت کسی خاص کتابی یا قیاسی اصول پر مبنی نہ تھا۔ اسکی بنیاد عام سمجھ اور معاملہ فہمی پر قائم تھی۔ مغل عملی آدمی تھے۔ اور کتابی اصولوں کے بجائے عملی تجربہ اور مشاہدہ ان کا راہنما تھا۔ وہ دیکھتے تھے۔ کہ جو شیلے آدمی نیکوکاری کے زعم میں' یا خیالی اصولوں کی غلامی کرتے ہوئے اس طرح کی زیادتیاں اور حماقتیں کر بیٹھتے ہیں۔ جنکے سامنے عام دنیاداروں کی خطائیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اور جن سے بچنا کسی مفروضہ اصول کی پیروی کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ انسانی کاموں کی دنیا میں عجیب کیفیت ہے۔ ایک مصلح یا قانون دان جب اپنے حجرے یا گوشۂ فکر میں بیٹھ کر انسانوں کے لئے کوئی اصلاحی اصول یا قانون وضع کرتا ہے۔ تو اُسے یہ اصول انسانی ترقی اور فلاح کا یقینی ذریعہ نظر آتا ہے۔ جس کی پیروی پر تمام دُنیا کی نجات منحصر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ توقعات شاذ و نادر ہی پوری ہوتی ہیں۔ اور ان اصلاحی کوششوں کے عملی نتائج خیالی توقعات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہے۔ کہ جو انسان ان کاموں کو عملی نتائج کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ اور قیاسی اصولوں کے بجائے عملی تجربہ کو چراغِ راہ بناتے ہیں۔ اُن میں وہ غلو اور افراط و تفریط کی عادت نہیں آتی۔ جو بعض "خدائی فوجداروں" کا خاصہ ہے۔ اس کے بجائے طبیعت میں ایک طرح کا توازن' بالغ نظری' رواداری' اور انسانی کوتاہیوں کا تحمل کرنے کی عادت آجاتی ہے۔ جو قطع نظر اس امر سے کہ یہ بجائے خود بڑی خوبیاں ہیں حقیقی اور پائدار مصلحانہ کوشش کے لئے بھی

سے قیمتی ولایتی شرابوں (مثلاً شامپین اور پورٹ وائن) کا ذکر بھی ان کے خطوط اور اشعار میں ہے۔ ایک اردو خط میں لیکور کا ذکر بڑی حسرت سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"لیکور ایک انگریزی شراب ہوتی ہے قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا قوام پتلا"

مرزا کی نفاست پسندی صرف لباس، وضع قطع، غذا اور شراب تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ ان کی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں تھی۔ غالب کے سکونتی مکان کی نسبت مولانا مہر لکھتے ہیں "مکان اگرچہ اپنا کبھی نہیں ہوا اور معلوم ہوتا ہے کہ کبھی اچھا مکان نہ ملا لیکن مذاق اس باب میں بھی بے حد نفیس اور عمدہ تھا" یہی حال کتابوں کی چھپائی، بلکہ ان کی جلد بندی کا تھا۔ مرزا کے مذاقِ طباعت کی واضح ترین شہادت وہ خطوط ہیں جو انہوں نے دستنبو کی طباعت اور جلدوں کی تزئین کے متعلق مرزا تفتہ اور مرزا حاتم علی مہر کو لکھے۔ ان کتابوں کی نسبت تو شاید کہا جائے کہ چونکہ وہ حکام اعلیٰ کو جانے والی تھیں اس لیے مرزا نے ان کی طباعت اور تزئین میں خاص اہتمام کرایا لیکن مرزا نے فقط اپنی کتابوں کی اچھی طباعت کا خیال نہیں رکھا بلکہ اگر کسی شاگرد کی کتاب اچھی طرح نہ چھپتی تو انہیں دکھ ہوتا۔ تفتہ کی سنبلستان چھپی ہے طباعت اچھی نہیں۔ مرزا بے قرار ہو جاتے ہیں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:-

"اجی مرزا تفتہ

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور بیگم جان کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستان ایک معشوق خوب رو ہے، بد لباس ہے!

ایسا نہیں لکھا۔ جو زائد اور غیر ضروری ہو۔ لیکن جو باتیں قابلِ تعریف آبِ خوردنی میں ہونی چاہئیں ان میں سے کوئی نظر انداز نہیں کی۔ لکھتے ہیں۔ "پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے "کوسی" سبحان اللہ! اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے۔ کہ یہ کھیپکا شربت ہے، صاف، سبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ۔"

مرزا کی غذا کا ایک ضروری جزو شراب تھا۔ اور اس میں بھی وہ خاص نقادانہ رائے رکھتے تھے۔ دیسی شراب جو شکر کے شیرہ سے بنتی ہے۔ اس کی انہوں نے کئی جگہ مذمت کی ہے۔ ایک فارسی قصیدہ کے دو شعر ہیں سے

کنوں کہ ملک مطیع است و راہ بخیں و خار
زمن بگو بفروشندگان بادۂ ناب
شرابِ قندیِ ہندوستاں دماغم سوخت
رشیرہ خانۂ کشمیر آورند شراب!

ایک اور فارسی شعر ہے سے

بداست آنچہ بہ ہندوستاں کشند از قند
ہم از فرنگ بیار، ار نباشد از شیراز!

مرزا کے خطوں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ زیادہ تر ولائتی شراب پیا کرتے تھے۔ دیسی بہت کم اور صرف تنگدستی کی حالت میں۔ غدر کے بعد ایک خط میں بابو ہرگوبند سہائے کو لکھتے ہیں۔ "دوسرا سوال یہ ہے۔ کہ دو قسم کی انگریزی شراب ایک ٹوکاس ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام۔ یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا۔" ان دو قسم کی شرابوں کے علاوہ ان کے خطوں میں فرنچ کا کثرت سے ذکر آتا ہے۔ جس سے غالباً ان کا مطلب فرانسیسی ساخت کی میٹھی شراب

حس مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی غذا کے متعلق جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے بھی یہ پتا چلتا ہے کہ وہ پُرخور نہیں لیکن خوش خور ضرور تھے۔ وہ اسی آخیر عمر کی غذا کے متعلق خود ایک خط میں لکھتے ہیں۔

صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی قریب شام کے کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔

آموں کے متعلق غالب کا ایک پُرلطف اُردو قطعہ ہے جسے لکھ کر انہوں نے نواب علاؤالدین خاں علائی کو بھیجا تھا۔ یہ قطعہ محض دل لگی کا اظہار ہے۔ اور اس سے کوئی اہم نتائج اخذ کرنا غلطی ہوگا لیکن اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو کھانے کی چیزوں کا بڑا خیال رہتا تھا۔

ہوتی ہے یہ آنے کی برسات کے ۔۔۔ پئیں باد ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم ۔۔۔ کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو کہ مطلوب ہاں ۔۔۔ نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں ۔۔۔ ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول ۔۔۔ وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت اسو بھیڑ کا ریشہ دار ۔۔۔ کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

غذا تو خیر پھر بھی ایک اہم چیز ہوتی ہے معمولی آب خوردنی کی مختلف جامد مقتوں پر بھی مرزا کی بڑی گہری اور جامع نظر تھی۔ رام پور کے قیام کا ایک خط ہے وہاں انہیں کھانا میسر کہاں سے آتا تھا اور شاید خاص طور پر پسند بھا اس کے متعلق لکھتے ہیں: "غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں" لیکن پانی کی بڑی تعریف کی ہے اس کے متعلق ایک لہ

"(در ہندوستان) اسپ خوب نے۔ گوشت خوب نے۔ انگور و خربزہ و میوہ ہائے خوب نے۔ یخ و آب سرد نے۔ حمام و مدرسہ نے۔ شمع و شمعدان نے۔ در باغ و عمارت ہا آبہائے رواں نے۔ در عمارات او صفا و ہوا و اندام وسیاں نے۔ رعیت و مردم ریزہ و تمام پائے برہنہ میگردند۔ لنگوٹہ گفتہ یکے چیزے می بندند"۔

اس حالت اور جہانگیر اور شاہجہان کے ہندوستان میں جو فرق تھا۔ اُسکی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مغلوں کی نفاست پسندی ہی تھی۔ جس نے یہاں کے طرزِ معاشرت اور تہذیب و تمدن میں اصلاح کی کوشش کی۔ اُنہوں نے نئے نئے میوے اور پھول باہر سے لاکر ہندوستان میں عام کئے۔ نئے اصولوں پر اور نئے سلیقوں سے یہاں باغ لگوائے۔ کپڑوں میں کئی قسم کی اختراعیں کیں۔ اور انہیں تیار کروانے کے لئے۔ دلی۔ لاہور۔ آگرہ۔ احمد آباد میں پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے جاری کئے۔ خس کی ٹٹی اکبر کی ایجاد ہے۔ شورہ سے پانی ٹھنڈا کرنے کا طریقہ بھی اُس نے شروع کیا۔ فنِ مصوری کو جہانگیر اور فنِ تعمیر کو شاہجہان نے جو ترقی دی۔ اس سے زمانہ واقف ہے۔

مرزا غالب کو خدا نے وہ جاہ و جلال اور ثروت و حشمت عطا نہیں کی۔ جو مغل بادشاہوں یا امرائے سلطنت کو میسر تھی۔ لیکن جہاں تک ان سے بن پڑا۔ انہوں نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں اسی نفاست پسندی اور خوش مذاقی کا ثبوت دیا۔ جس کی مثالیں مغل حکمرانوں یا امرا نے قائم کردی تھیں۔ مرزا کی جو تصویریں موجود ہیں۔ اُن سے نہ صرف وہ بدن و بشرہ کے لحاظ سے "ایک نو وارد تورانی" معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ لباس اور وضع قطع کے معاملے میں بھی اُن کا

ؔ یادگارِ غالب ص ۱۷

غالب از خاک پاک تورانیم | لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے | بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک | در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن حق را کمینہ شاگردیم | عقل کل را ہمینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہمعیم | ہم بہ رشتن بہ ابر مانندیم
نہ معاشیکہ ہست پروردم | نہ معاشیکہ نیست خرسندیم

ہمہ بر خویشتن مے گریم
ہمہ بر روزگار مے خندیم!

ایک اور قطعے میں کہتے ہیں کہ میں افراسیاب کے واد ا زادشم کی نسل سے ہوں اسلاف میرے تلواریں اور تیر چلانے والے تھے اب ان کا تیر ٹوٹ کر میرا قلم بن گیا ہے ؎

غالب نہ گہر زدودۂ زادشمم | زاں رو بصفائے دم تیغست دمم
چوں رفت سپہگری ز آبا بہ ہنر | شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم!

مغلیہ نفاست پسندی اور خوش معاشی

مغلوں کے جسم میں ترکی خون موجزن تھا۔ مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا۔ لیکن مغلیہ روایات کی ترجمانی کا حق انہیں صرف اسی لئے نہیں پہنچتا کہ وہ نسلاً اور اصلاً اُس قوم کے فرد تھے جس کا ایک قبیلہ تخت دہلی پر حکمران تھا۔ بلکہ مرزا کی اپنی ذات میں وہ وہی خصوصیات موجود تھیں جس سے اس قوم کے بہترین افراد متصف تھے مُغلوں کی ایک نمایاں خصوصیت نفاست پسندی ہے بابر کی آمد کے وقت ہندوستان کی جو حالت تھی اس کا نقشہ اُس نے تزک بابری میں کھینچا ہے۔

مرتے وقت وصیت کی تھی۔ کہ "از اہلِ ایران بہنر مندی نیست" اور نوادر اکبر نے گوا سے پرتگیز بلا کر ان کے خیالات اور ان کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنی چاہی۔ اسی طرح برنیز کا سفرنامہ پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ اورنگ زیب نے اپنے اُستاد کو اس بات پر ملامت کی تھی۔ کہ تم نے مجھے فرنگستان اور وہاں کے باشندوں کی نسبت صحیح واقفیت نہ بہم پہنچائی۔ اور ہمیشہ یہی کہتے رہے۔ کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ ہی دُنیا میں سب سے بڑے ہیں!

حقیقت یہ ہے۔ کہ مغل "ہیچو ما دیگرے نیست" کے نشے میں کبھی بھی اس طرح سرشار نہیں ہوئے کہ وہ اپنی ترقی اور اصلاح سے غافل ہو جائیں۔ اور یہ بھی واقعہ ہے۔ کہ کوئی قوم یا قبیلہ صدیوں تک اپنی حکومت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ جبتک اس میں دُوسروں سے کسب فیض اور حالات کے مطابق بدلنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ اب اگر مرزا نے مغرب کی ان صنعتی اور سائینٹیفک ترقیوں کی تعریف کی۔ جن کی وجہ سے اسے مشرق پر بجا فوقیت ہے تو اُنھوں نے مغلیہ نقطۂ نظر کی خلاف ورزی نہیں کی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ ہندوستان کے بعض راہنما مغرب کی مادی ترقیوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے ہیں لیکن مغل مادی چیزوں کی اہمیت سے پُوری طرح واقف تھے اور ان کا اس معاملے میں وہی نقطۂ نظر ہو سکتا تھا۔ جو اُن کے ترک ہم قوموں (مثلاً مُصطفےٰ کمال پاشا) کا آج ہے۔ مرزا غالب نے بھی اس نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ اور ان کے اس اظہارِ خیال سے حقیقتاً اس رائے کی تردید نہیں، تائید ہوتی ہے۔ کہ وہ مغلیہ تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان ہیں۔

غالب خُود مغل تھا — مرزا خود ترکی نسل سے تھے۔ اور انہیں اس پر بڑا ناز تھا۔ جابجا خطوط میں اس امر کی طرف اشارہ ہے۔ کئی فارسی قطعات اس کے لئے وقف ہیں۔ ایک میں اپنی اور اپنی قوم کی خصوصیات کا ذکر بڑا لطف سے کیا ہے ؎

مغلیہ تہذیب وتمدن کا ترجمان

دع ما کدر خذ ما صفا

ہم نے اس کتاب کے شروع میں میرزا کو مغلیہ تہذیب وتمدن کا بہترین ترجمان بتایا ہے بظاہر تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو مغلیہ آئین پر آئین فرنگ کو ترجیح دے وہ مغلیہ تہذیب وتمدن کی صحیح طور پر ترجمانی کرسکے لیکن حقیقتاً اس میں کوئی جائے حیرت نہیں میرزا دور بہادر شاہی کے مغل تمدن کے خاص طور پر دلدادہ نہ تھے لیکن وہ مغل روایات کے کامیاب ترجمان تھے یعنی جو مغل روایات مغل کیرکٹر، مغلیہ طرز حکومت، مغلیہ فنون لطیفہ کی امتیازی خصوصیات ہیں وہی میرزا کی شاعری اور زندگی میں نمایاں ہیں اور ان خصوصیات کا اس سے بہتر ادبی اظہار کہیں نہیں ہوا مغلیہ حکمرانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی انتہائی شان وشوکت کے زمانے میں بھی دع ما کدر خذ ما صفا کے اصول سے غافل نہیں ہوئے اور اپنے طرز حکومت، طرز معاشرت کی اصلاح اور ترقی کے لئے انہوں نے ہر طرف سے حسب ضرورت اخذ کیا شیر شاہ سوری مغلوں کا بدترین دشمن تھا لیکن بندوبست اور مالگذاری کا جو طریقہ اکبر اور اورنگ زیب نے تمام ہندوستان میں عام کیا وہ شیر شاہ سوری اور اس کے وزیر ٹوڈرمل کا وضع کردہ تھا اسی طرح تورانیوں اور ایرانیوں میں قدیمی عداوت ہے لیکن مغلیہ تہذیب وتمدن کی ساخت میں جتنا دخل ایرانیوں کو رہا ہے تورانیوں کو بھی نصیب نہیں ہوا مغلوں نے فارسی زبان کو آسمان ادب کی بلندیوں کے لئے موزوں پایا تو ترکی کو چھوڑ کر اسے اختیار کرلیا مغلیہ فن مصوری ایرانی مصوری کا مرہون منت ہے اور اورنگ زیب

مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ غالباً ایسا نہ تھا۔ مرزا کی ساری زندگی میں کوئی خاص بات مسلمانوں کی نظر نہیں آتی۔ عقیدۂ ہمہ اوست جس کے وہ اس قدر قائل تھے۔ ہندوؤں کے بعض فرقوں میں اسی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس طرح مسلمان صوفیوں میں۔ اس کے علاوہ اگرچہ مسلمانوں کی مصیبتیں دیکھ کر انہیں دُکھ ہوتا تھا۔ لیکن وہ مصیبتیں ہی ایسی تھیں۔ کہ اگر وہ ہندوؤں پر اور بالخصوص مرزا کے ہندو دوستوں پر آتیں۔ تو مرزا کو بھی اسی طرح رنج والم ہوتا!

مرزا کو انگریز حکام یا انگریز قوم سے کوئی عناد نہ تھا۔ بلکہ غدر میں جو بے گناہ انگریز مارے گئے۔ ان کی موت کا انہیں دلی رنج تھا۔ اور وہ غدر کے کئی سال بعد تک ان کا ماتم کرتے رہے۔ ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں: "انگریز قوم میں سے جو ان رُوسیاہ کالوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ ان میں کوئی میرا اُمیدگاہ تھا۔ اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد"۔ لیکن غدر کے بعد جب حالات بدلے۔ اور نیا نظامِ حکومت قائم ہوا۔ تو اس وقت حاکم و محکوم میں جو فرق روا رکھا گیا۔ اس سے بھی اُنہوں نے چشم پوشی نہیں کی۔ اور بڑے لطیف طریقے سے اس کے متعلق ایک جگہ اپنے مافیہا کا اظہار کیا ہے۔ میر مہدی حسن مجروح کو ایک سانحہ کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"اہلِ خطہ کا حال ازروئے تفصیل مجھ کو کیونکر معلوم ہو۔؟ سُنتا ہوں۔ کہ دعوئے خون ملتی کیا چاہتے ہیں! سو دا ہو گیا ہے۔ مسودہ ہو رہا ہے۔ ملنک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اُڑ گئے۔ گورنمنٹ مدعی نہ ہوئے۔ قصاص نہ لیا۔ اب ایک ہندوستانی کے خون کا قصاص کون لے گا؟

اے سبزۂ سرِ راہ از حوریہ پاچہ نالی
درکیشِ روزگاراں گُل خوں بہا ندارد"

نواب نور الدولہ شفق کو یہ لکھتے ہیں اور دیکھئے سطروں میں کس قدر تلخی اور دلی کرب اور بے چینی اُبھری ہُوئی ہے ؎

"حضرت انہدام مساکن و مساجد کا حال میں کیا گزارش کروں؟ بانیٔ شہر کو وہ اہتمام کاہے کے سلسلے میں نہ ہوگا، جو اب والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ! قلعے میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعے میں تو آلات سے کام نہ چلا، سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی بعد مکانات سنگین اڑا دیے گئے"

فتح دہلی کے بعد ایک عرصے تک مسلمانوں کو شہر میں رہنے کی اجازت نہ تھی اس کے بعد حکم ہوا کہ جو مسلمان حاکم شہر کی مرضی کے مطابق جرمانہ ادا کریں اور ٹکٹ حاصل کریں انہیں شہر میں آنے کی اجازت ہوگی۔ مرزا اس کی نسبت طنزاً لکھتے ہیں "یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے اور ٹکٹ لے گھر برباد ہو جائے آپ شہر میں آباد ہو جائے"

غدر کے بعد دہلی کے مسلمان کچھ اس طرح مصائب و آلام میں گرفتار ہوئے کہ مرزا جو مذہبی عصبیت سے بالکل پاک تھے ان سے بھی نہ رہا گیا اور اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ انہیں بھی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ ایک اُردو قطعہ میں لکھتے ہیں ؎

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ ہے آج   تشنۂ خوں ہر مسلماں کا

ایک اُردو خط میں ہے "اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کے پر پرچم لہرائے ہیں" ان دو اقتباسات میں جو ہمدردی کا اظہار مسلمانوں کی نسبت کیا گیا ہے اس سے اور حالی کے اس بیان سے کہ جب مرزا، مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا، بعض اصحاب کو خیال ہوا ہے کہ مرزا میں اسلامی ہمدردی کا

عام اہلِ دہلی پر جو گزری۔ اس کی تفصیل تو نہیں لکھی۔ لیکن مرزا کے اپنے دوستوں پر اور ان پر خود جو بپتا یا بیتی وقت پڑا ہوا تھا۔ اس کا تھوڑا بہت ذکر کئی خطوں میں ہے۔ ایک خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں۔

"میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آ گیا ہو۔ تو کیا عجب ہے۔ بلکہ باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؛ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت؛ غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ۔ میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اوس کا بیٹا احمد مرزا اُنیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابنِ اعظم الدولہ، اوس کے دو بیٹے، ارتضےٰ خاں اور مرتضےٰ خاں، قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہ جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خاں[ل] میر احمد حسین "میکش" اللہ اللہ! ان کو کہاں سے لاؤں۔ . . ."

ایک اور خط میں ان مصیبتوں کو جو غدر میں اور غدر کے بعد اہلِ دہلی پر گزریں، ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ اس میں فوجیوں نے جو مظالم روا رکھے۔ اس کے متعلق فقط ایک سطر ہے۔ لیکن اندازہ کیجئے کہ اس ایک سطر میں اس تاجدارِ اقلیمِ سخن نے کس طرح اپنا دل کھول کے رکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں "پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اوس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اوس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر مٹ گئے۔ . . ." "فتح دہلی کے بعد جو مکانات اس شہر میں بحکم سرکار ڈھائے گئے۔ ان کے متعلق

ل انہیں قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی تھی۔ غالباً یہ وہی بزرگ تھے جن کے اصرار نے مرزا علی بخش رنجور کو آمادہ کیا۔ کہ وہ مرزا کی فارسی نثریں (پنج آہنگ) مرتب کریں۔

حق این قوم است آئین داشتن　　کس نیارد ملک بہ زین داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند　　ہند را صد گونہ آئین بستہ اند
پیش این آئین کہ دارد روزگار
گشتہ آئین دگر تقویم پارا

جب یہ مثنوی سرسید کے پاس پہنچی تو انھوں نے اسے کتاب کے ساتھ شائع نہ کیا کیونکہ
اس میں تعریف کے بجائے آئین اکبری پر تنقید کی ہوئی تھی لیکن اس مثنوی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ
مرزا جدید معاشرے کے اصول پر پوری طرح عامل تھے اسکے علاوہ حب وطن کی موجودہ صورت
جو حقیقتاً مغرب سے ماخوذ ہے۔ اس قدر نئی ہے کہ مرزا سے اسکی توقع رکھنا عبث ہے۔
مرزا کو بہادر شاہ سے کوئی خاص دلبستگی نہ تھی۔ اور نہ ہی انکے رسالے میں دور جامعہ
حب الوطنی کے آثار ملتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ان کے ہم وطنوں پر کوئی
زیادتی ہو تو اس کا مرزا کو احساس نہ ہوتا تھا غدر کے بعد اہل دہلی کو میرٹھ کے باعث
کی جو سراسیمگی پڑی تھی اس کی شکایت سے مرزا کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔ اور ان کا
دل کے پھپھولے پھوٹ رہے ہیں ان خطوط کے پڑھتے وقت ہمیں یہ خیال دکھایا ہے کہ
لکھتے وقت مرزا نے اپنے مافی الضمیر کو پوری طرح ظاہر نہیں کیا اور تمام حالات ڈر ڈر کے
لکھے ہیں حکیم غلام نجف خاں کو ایک مختصر سا خط لکھتے ہیں اور غور کیجئے کہ ان دو سطروں
حسرت و ارمان اور شکوہ و شکایات کے کیسے کیسے طوفان سمٹے ہوئے ہیں "اس وقت تک
مع عیال و اطفال جیتا ہوں بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں قلم ہاتھ میں لئے پر جی
لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے۔ ورنہ
انا للہ و انا الیہ راجعون" یہ خط جوری ۱۸۵۸ء کے بعد کا ہے اسکے بعد کے خطوں

خدمت میں درخواستیں گزارنی شروع کر دیں۔ کہ شام و روم کے بادشاہوں کے درباری شاعر ہوتے ہیں۔ مجھے کیوں نہ "کوئین پوئٹ"[1] گنا جائے ۔

مرزا معاملہ فہم تھے۔ اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے اُن کی دلبستگی کبھی اتنی گہری نہیں ہوئی۔ کہ وہ اسکی بربادی سے بے قرار ہو جاتے۔ اور اگر ایسا ہوتا بھی تو مرزا اپنے سوا کس کو اسقدر اہم سمجھتے تھے۔ کہ اس کے لئے آنسو بہاتے ؛

مرزا کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ کئی انگریزوں کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ "اسٹرلنگ" کے مر جانے کے بعد اُنہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے۔ اُسے کسی طرح رسمی یا خود غرضانہ نہیں کہا جاسکتا۔ میجر جان جاکوب کے ساتھ انکے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور جب میجر دہلی آتے تو مرزا انکے ٹھہرنے کا انتظام کرتے۔ سر جان میکلوڈ۔ میٹکاف اور طامسن نے اُنکے ساتھ بہت شریفانہ برتاؤ کیا۔ نہ صرف کئی انگریزوں سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے، بلکہ وہ انگریزی نظام کو بھی مغلیہ نظام پر ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ جب سر سیّد احمد خاں نے بڑی محنت سے آئین اکبری کی تصحیح کی اور اشاعت کے وقت مرزا کی رائے طلب کی۔ تو انہوں نے ایک مثنوی لکھی۔ جس سے ان کا مافی الضمیر بخوبی ظاہر ہوتا ہے ؎

گر ز آئین میرود با ما سخن — چشم بکشا اندریں دیرِ کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر — شیوہ و اندازِ ایشاں را نگر
تا چہ آئین ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت

[1] مرزا نے سر جان میکلوڈ فناسن کمشنر پنجاب کیلئے اپنی اردو نظم و نثر کا انتخاب کیا تھا۔ اسکے دیباچے میں لکھتے ہیں "البتہ میں اس کا مستحق ہوں۔ کہ کوئین پوئٹ گنا جاؤں۔ اور اس علاقہ سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں" (ادبی دنیا اگست ۱۹۲۷ء)

حوّۓ آدم دارم آدم زادہ ام   آشکارا دم زعصیاں میزنم

مرزا کے کلام کی یہ خصوصیت فنی نقطۂ نظر سے ایک خوبی ہے۔ چونکہ مرزا کا کلام ذاتی احساسات اور تجربہ کا بیان ہے اسلئے ان کا طرزِ بیان زیادہ موثر ہے۔ اور چونکہ اسمیں عام بشری تجربوں اور مشاہدوں کا ذکر ہے اس لئے عام لوگ بھی انہیں پوری طرح سمجھ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غالب اقبال کی نسبت زیادہ مقبول ہے لیکن افلاطونی نقطۂ نظر سے یہ خصوصیت ایک خامی بھی ہے۔ علامہ اقبال نے قصداً اپنے اشعار میں روزمرہ کی بشری زندگی کی بجائے ایک بلند تر روحانی نظام کی تصویر پیش کی تھی ؎

عرش کل گوکہ عظمت بسار خود را پردہ گرداند   چہ آید زاں عروج گرکہ با فطرت ہم آہنگ است

انہوں نے جس بلند تر روحانی نظام کی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے وہ ہمارے ملکہ شاید شاعر کے اپنے ذاتی تجربے سے بالاتر ہی لیکن کیا عجب ہے کہ مستقبل میں کوئی اللہ کا مقبول بندہ اس تصویر سے متاثر ہو کر اس نظام کو خیالی دنیا سے واقعات کی دنیا میں لے آئے اور اقبال نے جو شاندار خواب دیکھا ہے وہ پورا ہو جائے!!

غالب اور وطنیت

مرزا کے چند مدّاحوں نے انکے اشعار سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ وہ بڑے محبِ وطن تھے حقیقتاً یہ خیال محض مرزا کے حالاتِ زندگی اور انکے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا بلکہ مرزا کی افتادِ طبیعت کے غلط اندازے پر مبنی ہے مرزا فی الحقیقت خود غرض کبھی نہ تھے بلکہ سرکاری کبھی تھے انکی طبیعت کا تمام رجحان خیال پرستی نہیں بلکہ واقعیت پسندی کی طرف تھا ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور انکے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو تو مرزا نے فوراً ملکہ وکٹوریہ کی

تخیلات اور خیالی تصویروں کو "آپ بیتی" نہیں کہا جا سکتا۔

مرزا کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ اُن کے کلام میں بیشتر انہی کیفیتوں اور روحانی مرحلوں کا بیان ہے۔ جن کا تجربہ انہیں خود بطور ایک انسان کے ہوا۔ اُن کے کلام اور ان کی اپنی شخصیت میں وہ بُعد ہرگز نہیں۔ جو اقبال کے کلام اور اقبال کی شخصیت میں ہے۔ ان کا کلام ان کی اپنی آپ بیتی ہے۔ انہوں نے اقبال کی طرح ایک بلند تر روحانی نظام پیش کرنا اپنی زندگی کا مقصد نہیں بنایا۔ بلکہ جن جذباتی کیفیتوں اور روحانی منزلوں سے انہیں سابقہ پڑا۔ ان کو اپنے اشعار میں نظم کر دیا۔ مرزا کی اس خصوصیت کا اندازہ نہ صرف ان کی شخصیت اور ان کے کلام کے موازنہ سے ہو سکتا ہے۔ بلکہ مرزا نے بڑی صاف گوئی سے ان روحانی خوبیوں سے انکار کر دیا۔ جن سے وہ محروم تھے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

به ملکِ جم نه دہم مصرعۂ نظیری را　　کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

معترضین جب ان لن ترانیوں کا شاعر کی اپنی زندگی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تو انہیں قرآن مجید کی سورۂ شعرا یاد آجاتی ہے۔ جس میں شعرا کا بڑا عیب یہ بتایا گیا ہے۔ کہ وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں لیکن مرزا اس نقص سے بہت حد تک بری ہیں۔ وہ گفتار اور کردار اور خیال اور عمل کو ہم آہنگ کرنے پر بڑا زور دیتے ہیں ؎

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گو　　گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود!

جو منزلیں ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ ان کی نسبت وہ صاف صاف کہہ دیتے ہیں ؎

پایۂ من فرو تر افتادہ است　　سہرِ خود بہ بستاں نمے خواہم!!

ایک اور شعر ہے ؎

اس میں انہوں نے اپنی جد وجہد برقرار رکھی لیکن ناموافق حالات کا بھی انہیں پورا احساس تھا اور اس کی تشریح انہوں نے اپنے اشعار میں کی۔ ایک فارسی شعر میں اپنی نسبت کہتے ہیں سہ

نوادئے کہ دراں حصر راعصا حست است

نسیہ می سپرم راہ گرچہ یا حست است

ان کا اب یہ عملی نقطہ نظر ہو گیا کہ انتہائی کامیابی اور عروج کے جو خواب دیکھتے تھے ان کا پورا ہونا تو قضا و قدر پر منحصر ہے لیکن اپنی طرف سے ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور اپنی بساط کے مطابق اصلاحی کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔ ایک نہایت بلند پایہ فارسی شعر ہے سہ

مُعدو کمل طور سیدہ گرچہ درحرگاہ حویش

ہر کس امورد چراغے چوں تمنائے رسد

غالب اور اقبال میں ایک اہم فرق | اقبال اور غالب میں ایک لطیف لیکن اہم فرق یہ ہے کہ اقبال کے کلام میں انسانی ارتقا کی کئی ایسی منزلوں کا بیان ہے۔ جو شاعر کے ذاتی تجربے سے بالاتھیں اور جن کا احساس اسے محض بطور ایک مفکر کے ہُوا اقبال ایک فلسفی تھا جس نے خودی کی نشو و نما کے تمام طریقوں اور پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ اور وہ تمام طریقے جو حصول مقصد کے لئے مفید نظر آئے اُن کی اپنے اشعار میں تعریف کر دی۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ اُن تمام طریقوں کا اسے ذاتی تجربہ ہو بعض طریقوں کا اسے خود تجربہ ہو گا بعض اس نے دوسرے ذرائع (مثلاً نیٹشے رومی) سے اخذ کئے اور بعض کی تشکیل میں تخیل کو دخل تھا یہ صحیح ہے۔ کہ اسے ان سب طریقوں کا قوی احساس ہوگا۔ جب وہ انہیں اس خوبی سے نظم کر سکتا۔ لیکن اقبال کی بعض تعلیمات اور خیالی تصویریں اور اس کی اپنی زندگی میں اتنا بُعد تھا۔ کہ ان

اور اخلاق اور مذہب کی معراج ہیں اور "محض شاعر" ہونے کے باوجود "پیمبرانہ" حوصلہ پیدا کریں۔

غالب کی واقعیت پسندی

اقبال کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں کہ اس نے قصداً زندگی کی تلخ حقیقتوں کو تفصیل سے بیان نہیں کیا فی نفسہٖ تو یہ ایک خوبی ہے۔ لیکن اس کے ایک دو مضر نتیجے بھی پیدا ہوئے ہیں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اقبال کے بعض نوجوان مداحوں نے اس کے اشعار سے جو رجائیت اخذ کی ہے وہ کھوکھلی اور نقصان دہ ہے۔ درحقیقت اس کھوکھلی رجائیت کا باعث تو ان نوجوانوں کی اپنی سطحیت اور زندگی کے نشیب و فراز سے ناواقفیت ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ اقبال کے کلام میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ذکر بہت تھوڑا ہے۔ اس لئے اس کا بادی النظر سے مطالعہ کرتے وقت یہ خیال ہوتا ہی ایک قدرتی امر ہے کہ زندگی میں تلخ حقیقتوں کی تعداد ہی تھوڑی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں انسان کی ارتقائی کوششوں کا ذکر بڑی سہل انگاری سے ہوا ہے۔ اور جن سے یہ غلط خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ انسانی ارتقا کی انتہائی منزلیں طے کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ؎

جہانے را کہ گرد و ستم جہانے دیگرے جستم

مرزا غالب کا کلام اس نقص سے بری ہے۔ اس میں زندگی کی زیادہ مکمل اور زیادہ صحیح تصویر پیش کی گئی ہے اور انسانی زندگی کی مشکلات اور تلخیوں کا بھی پوری طرح ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ مرزا کی اپنی زندگی میں بہت سی ناکامیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا اس لئے جب وہ اپنے اولوالعزمانہ ارادوں کا ذکر کرتے تب بھی وہ جوش میں آپے سے باہر نہ ہو جاتے۔ اقبال کا ایک مشہور شعر ہے ؎

نشئہ را رونقِ ہنگامۂ ہندو خوانند   بادہ را شمع طرب خانۂ ترسا بینند

چونکہ انہیں تمام طریقوں سے پوری پوری واقفیت ہے۔ اس لئے وہ کسی ایک کی مخالفت نہیں کرتے۔ اور دنیا کی تمام چیزیں انہیں اچھی ہی نظر آتی ہیں ؎

راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند   نقش کج بر ورقِ شہپر عنقا بینند

ان کی تیسری خصوصیت جود و عطا اور دوسروں سے نیکی کرنے کا شوق ہے ؎

خوں خورند و جگر از غصہ بدنداں گیرند   خویش را چوں لبِ سر مائدہ تنہا بینند

وہ دنیا سے اپنا دل نہیں لگاتے۔ اور اسکے واقعات کو بطور ایک تماشائی کو دیکھتے ہیں ؎

دل نہ بندند بہ نیرنگِ درِیں دیر دو رنگ   ہر چہ بینند بعنوان تماشا بینند

لیکن پھر بھی وہ دنیا کی دلآویزیاں اور اس کی کشش خوب سمجھتے ہیں ؎

بہ دار یاد کہ دنیاست نمودِ بے بود   ایں دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

مندرجہ بالا اشعار پر کسی طویل تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ان میں اقبال اور غالب کے مختلف مطمحِ نظر بڑی وضاحت اور دلآویزی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور چونکہ دونوں میں بڑی عظمت اور شانِ محبوبی ہے۔ اس لئے اہلِ نظر دونوں سے محظوظ اور فیضیاب ہوں گے۔ لیکن غالب کی نسبت ہم کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اس کا مطمحِ نظر دیکھتے ہوئے۔ اس بات کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔ کہ جن خوبیوں اور خاصیتوں کی اس کے دل میں قدر تھی انہیں بڑی حد تک اس نے خود اپنی ذات میں اخذ کرلیا تھا۔ اور دوسرے ہمیں یہ بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ اس کے اشعار ایک مدحیہ قصیدے سے ماخوذ ہیں۔ جب ہم قدیم شاعری کی تنگ دامانی کا خیال کرتے ہیں۔ تو کیا ہمیں اس شاعر کے ذہنِ رسا اور طبع بلند کی داد نہیں دینی چاہیئے۔ جس نے ان پابندیوں کے باوجود اپنی شاعری کو ان حقائق کا ترجمان بنالیا۔ جو فلسفہ

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ رزم و بزم اور جلوت و خلوت میں حالات کے مطابق
اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں اور دونوں میں ہی اپنی امتیازی شان برقرار رکھتے ہیں۔ اقبال
نے اس وصفِ ہمہ گیری کی اور بھی کئی جگہ تعریف کی ہے ؎

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

اور ؎ در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح — در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم

ان پاک بندوں کی تیسری خصوصیت سادگی اور اقلیم میں اندیشہ کے اصول کی پیروی ہے بڑے بڑے ملکوں
کے بادشاہ ان کے زیرِ نگیں ہیں لیکن وہ خود خرقہ پہنتے ہیں۔ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں

ع ز شاہاں باج ستانند و خرقہ مے پوشند

غالب نے اپنے اشعار میں جن بزرگوں کی مدح کی ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت
دوربینی یعنی مآل اندیشی اور صحیح سمجھ ہے وہ ایک واقعہ کو دیکھ کر اس سے مستقبل میں پیدا ہونے
والے تمام نتائج کا اندازہ کر لیتے ہیں ؎

تیرے کہ ز ساگاہ ملک جہاں جست — رحمے کرد بر نشتر رگِ خارا سپید
قطرہ کہ ز آئینہ گہر جوا جست — صورت آلہ بر چہرۂ دریا سپید

ان کی دوسری بڑی خصوصیت دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے اور ان کے ساتھ رواداری برتنے کی
قابلیت ہے۔ وہ تمام طبقوں کی خوبیوں اور خصوصیتوں سے واقف ہیں اس لئے وہ کسی
ایک پر بک پھول نہیں چڑھاتے ؎

ہر چہ گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند — ہر چہ گوید عرب از وامق و عذرا شنوند
مست گردند اگر زمزمۂ مجنوں گردند — بخروشند اگر محملِ لیلیٰ بینند

زندہ دلی کا عنصر مرزا سے زیادہ تھا لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ ایسے اشعار میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی ارادتاً ان کی شکایت نہیں کرتے۔ ز لوز عجم میں کئی اشعار ہیں جن سے ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے ؎

شناخت معاشر ہوس افتد مدام خویش	عشقے کہ نمود بے خواست ار شورش یارب ہا
لبے کہ دل حیر دار ہر جگر سوزی است	در سینہ سکن اورا، آلودہ مکن لب ہا

بسمرو سدا ز شعاں در سار نامہ و فراق	عشق تا آہے کشد از حدیث خویش آگاہ نیست

دی مع بچہ نامی اسرار محبت گفت	اشکے کہ زود چو عہدی از مادہ شکوں ہے

اور ؎

باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم
در جنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست

اقبال و غالب کا مطمح نظر

علامہ اقبال کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں کہ ان کا مقصد سرزمین مشرق میں ایک ذہنی اور روحانی انقلاب پیدا کرنا تھا انہوں نے اپنی تمام شاعرانہ قوتیں اس امر کے لئے وقف رکھیں کہ وہ اپنے سامعین کو ایک بلند تر روحانی نظام کی طرف بلائیں۔ اُن کی روحانی اور ذہنی کوتاہیوں

لہ مولانا غالب بھی بعض اشعار میں اس اصول کی تعریف کی ہے ؎

ہمیں بس نیست کہ بہ جلوہ بہار تر	داغ گداز نالہ بگاہ آبیار تر

مت

سدہ بسط سے آئینہ شدی گوہر	دگر سر کر میں ہر قطرہ چشم پیلم ہے

لیکن یہ سب ابتدائی زمانے کے اشعار ہیں جب ان کے پہلو نہیں ٹوٹے ہے!

نیرا غمیست بسرمایۂ گرانئ کوہ | مرادمیست بہ نیروئے تیشۂ فرہاد
من و بلائے تو نظیر ادیم و تاب سہیل | من و جفائے تو شاگرد و سیلئے اُستاد
من و ستم دلِ رنجور و التفاتِ طبیب | من و خطر رگِ مجنوں و نشترِ فصاد

ایک اور فارسی شعر ہے ؎

شود روا نئے طبعم فزوں ز سختی دہر
بسنگ تیز تواں کرد تیغِ بُرّاں را

مرزا نے مشکلات کا مردانہ وار اور بڑی ہمت سے مقابلہ کیا ؎

می ستیزم با قضا از دیر باز | خویش را بر تیغ عریاں می زنم
لعب با شمشیر و خنجر میکنم | بوسہ بر ساطور و پیکاں می زنم

لیکن انہیں تلخ تجربے نے سکھا دیا تھا۔ کہ سب مشکلات انسانی بس کی نہیں ہوتیں۔ اور زندگی میں کئی ایسے مرحلے آجاتے ہیں۔ جہاں قضا و قدر کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔
انہوں نے دہلی کے قید خانے میں جو ترکیب بند لکھا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے ؎

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود
چہ کنم چوں بہ قضا زہرۂ جنگم نبود

ایک اور فارسی شعر میں اسی طرح کے کسی اور مایوسی لمحے کا اظہار ہے ؎

نتواں کرد با فلک پرخاش | خرد خُردہ داں نمی خواہم

غالب کو اس طرح کے تلخ لمحے بہت سے دیکھنے پڑے۔ اور ان کے بیان کی وجہ سے ان کے اشعار میں حزن و الم اور مایوسی کا اظہار کثرت سے ہے۔
اقبال کی نسبت یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں شگفتگی اور

امید افرا فلسفہ کے شاعر کو کسی چیز سے سروکار نہیں رکھنا چاہیئے یہ حضرات اس نقطۂ نظر کو
واقعات کی کسوٹی پر پرکھنے کی ہمت گوارا نہیں کرتے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جو لوگ زندگی کے تلخ
خوشگوار پہلوؤں سے آشنا رہنا چاہتے ہیں وہ دنیا میں کوئی قابل ذکر عملی کام نہیں کر سکتے۔
جب تک وہ اپنے خیالات یا خیالی فلسفہ کے نشہ میں مست رہتے ہیں تب تک تو کوئی الجھن
پیدا نہیں ہوتی لیکن جونہی وہ خیالات سے گزر کر کوئی عملی کام شروع کرتے ہیں اور انہیں
کسی مایوسی یا ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو چونکہ وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتے وہ
اس کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں کر سکتے اور جلد ہی ہمت ہار دیتے ہیں اسکے برخلاف جو لوگ
زندگی کے تاریک پہلو سے بھی واقف ہیں۔ اور جانتے ہیں۔ کہ اس اہم عملی کام کرنے میں
لا اتفاق مشکلات اور مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کی کوششوں میں ایک طرح کا
توازن ہوتا ہے وہ ان مشکلات اور ناکامیوں کے لئے تیار ہوتے ہیں اور ان کے سامنے
بے بس نہیں ہو جاتے اقبال اس قسم کی کھوکھلی رجائیت کے خواہ کے بعض نوجوان مدح خواں کو
لیتے ہیں اور جس کی بنیاد محض انسانی زندگی سے ناواقفیت پر مبنی ہے بہت خلاف تھے
وہ جانتے تھے۔ کہ اس سے انسانی روح کی ارتقائی کوششوں میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔
وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ

نیست تلخاب من بے حاصل غم و سود بے!

زندگی کی مشکلات اور مصیبتوں کی نسبت مرزا کا نقطۂ نظر بھی کسی کم ہمتی یا مردانگی پر
مبنی نہیں ان کا شروع سے ہی خیال تھا کہ مشکلات سے انسان کو سبق سیکھنا چاہیئے
اور ان سے اپنی اصلاح میں مدد لینی چاہیئے ایک ابتدائی فارسی قصیدہ میں کی تشبیب ہے؎

توائے ستارہ روانی کہ رسم اور آزاد توائے سپہر سمی کہ رسم اور بیداد

خاص طور پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اقبال کہتے تھے۔ کہ زندگی کا لطف ہی ان مشکلات کا مقابلہ کرنے میں ہے۔ زندگی میں مشکلیں اور الجھنیں ضرور ہیں۔ لیکن ان کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ اور اپنی تگ ودو برابر جاری رکھنی چاہئے ؎

از من حکایتِ سفرِ زندگی مپرس
درساختم بدرد وگر نشنم غزلسرائے!

اقبال کے کلام میں کئی پُراثر اشعار ہیں۔ جن میں حکیمانہ فلسفہ کا اظہار ہے۔ پیامِ مشرق میں کہتے ہیں ؎

سحر می گفت بلبل، باغباں را | دریں گل جز نہالِ غم نہ ریزد
به پیری می رسد خارِ بیاباں | ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

زبورِ عجم میں ارشاد ہوتا ہے ؎

در بنگرِ فقیر و بکاشانۂ امیر | غمہا کہ پشت را بجوانی کند دوتائے

ایک اور غزل کے دو اشعار ہیں ؎

فنا را بادۂ ہر جام کردند | چہ بیدردانہ او را عام کردند
تماشاگاہِ مرگِ ناگہاں را | جہانِ ماہ و انجم نام کردند

ایک بلند پایہ غزل میں کسی سے خطاب ہے ؎

بہ جہانِ دردمندان تو بگو چہ کار داری | تب و تابِ ما شناسی؟ دلِ بیقرار داری؟
چہ خبر ترا از اشکے کہ فرو چکد ز چشمے | تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری؟
چہ بگو نمت ز جانے کہ نفس نفس شمارد | دمِ مستعار داری؟ غمِ روزگار داری؟

اقبال کے بعض نوجوان مداحوں کا خیال ہے۔ کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ذکر کرنا یا ان سے واقف ہونا عیب ہے۔ ان کے نزدیک سوائے عمل اور جدوجہد کی تلقین اور

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کے اشعار میں غم کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم غالب کو قنوطی شاعر نہیں کہہ سکتے (اور زندگی کے متعلق غالب کا قنوطی یا رجائی کوئی بھی معین فلسفہ نہ تھا) تاہم میرا کے اشعار انکے دلی صدمات کا اظہار ہیں اور جن مایوسیوں اور ناکامیوں سے انہیں سابقہ پڑا ان کا اظہار ان اشعار میں صاف صاف آگیا ہے۔ اقبال کا معاملہ اس بارے میں بالکل مختلف تھا زندگی کے متعلق ان کا ایک معین فلسفہ تھا۔ رجائی۔ اور اس کا اظہار اُنہوں نے اپنے کلام میں بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ مشرقی شعرا کے المیہ معاملات سے انہیں نفرت تھی وہ اسرارِ خودی میں ان شعرا کی نسبت لکھتے ہیں ؎

گریۂ طفلانہ در پیمانہ اش — کلفت آبے متاعِ خانہ اش
سر خوش از دریوزہ میخانہ ہا — حلوۂ دزد از دلِ کاشانہ ہا
ناخوشے افسردہ آزردۂ — از نگہ کوب نگہباں مردۂ
از عمارِ ماسد لے کا ہیدۂ — در نلک ہمدر تشکو دیرلب جیدۂ
پست تحت ودیر دست دُول ہما — نامراد و نا امید و نامراد
شیلوش از عمل تو سرمایہ بُرد — لطف خواب از دیدۂ ہمسایہ بُرد

وائے بر عشق کہ نالہ اے او فسرد
در حرم زائید و در بتخانہ مُرد

لیکن اقبال کی نسبت یہ عام خیال کہ ان کی شاعری میں غم کا عنصر یا زندگی کی مشکلات کا سایہ سراسر مفقود ہے غلط ہے۔ اقبال کا زندگی کے متعلق یہ نقطہ نظر تھا کہ یہ غموں اور دکھوں سے خالی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے۔ کہ انسانی زندگی میں غم و الم کا بھی حصہ ہے اور جو انسان شخصی ارتقا کی منزلیں طے کرنا چاہتا ہے۔ اسے تو مشکلات اور مایوسیوں سے

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد!

مرزا غالب لکھتے ہیں ؎

دراں پاک میخانۂ بے خروش | چہ گنجائشِ شورشِ ہائے و نوش
سیہ مستیٔ ابر و باراں کجا | خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ | غم ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار | چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ اینش کجا | فریبد بسوگند و بینش کجا
بُرد حکم و نبود لبش تلخ گو | دہد کام و نبود دلش کامجو
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو | بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزؤ مندِ دلالۂ | نہ دل تشنۂ ناوِ پرکالۂ

از ینہا کہ پیوستہ میخواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلاست دل!

مرزا کی شوخی کسی حد تک ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے لیکن پھر بھی ان اشعار میں شخصی احساسات کا جو اظہار ہے۔ وہ اقبال کے اشعار میں نہیں۔ اور اقبال کا قطعہ ان کے مقابلے میں پھیکا معلوم ہوتا ہے ÷

اقبال اور غالب کا فلسفۂ زندگی

اقبال اور غالب کے درمیان ایک اور اہم فرق فلسفۂ زندگی کے متعلق ہے۔ غالب کی نسبت

گاہے گاہے جہاں درد مندوں کے غم و مصائب کا بھی ذکر کر لیتے تھے لیکن مستزاں کا طائر فکر حکمت اور فلسفہ کی ان بلندیوں پر بھی گرم پرواز رہتا جہاں سے یہ جہان ایک دُھندلا سا ستارہ نظر آتا تھا۔

بہشت اقبال اور غالب کے طرز شاعری میں جو فرق ہے۔ اُس کی ایک دلچسپ مثال اُن کے وہ اشعار ہیں۔ جو انہوں نے بہشت کے متعلق لکھے ہیں۔ بہشت کے متعلق رسمی نقطۂ نظر تو یہی ہے کہ اسے تمام خوبیوں اور آسائشوں کا مخزن سمجھا جائے لیکن تنوع اور جدت پسند طبیعتیں اس میں بھی عیب نکال سکتی ہیں بیدل نے کہا تھا ؎

گویند بہشت است و ہمہ راحت جاوید حائیکہ بدامے نہ تپید دل چہ مقام است

غالب اور اقبال دونوں نے اس معاملہ میں رواجی نقطۂ نظر سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ اور بہشت کی نسبت اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے بظاہر تو اس اظہار رائے میں دونوں ہمخیال معلوم ہوتے ہیں کیونکہ دونوں مطمئن نہیں لیکن اس ہمخیالی میں بھی دونوں کا اختلاف طبائع نمایاں ہو گیا ہے۔ اقبال کی مایوسی ایک فلسفی کی مایوسی ہے اور غالب کی مایوسی ایک عاشق مزاج شاعر کی۔

اقبال لکھتے ہیں ؎

کجا ایں روز گارے شیشہ بازے بہشت ایں گنبد گرداں ندارد
ندیدہ درد زنداں یوسفِ او زلیخائش دلِ نالاں ندارد
خلیلِ او حریفِ آتشے نیست کلیمش یک شبِ ہجراں ندارد
سحر سر در تیغت نبودتی او خطر از نطرۂ طوفاں ندارد
یقیں زادہ کمیں لوک گمر نیست وصال اندیشۂ ہجراں ندارد

واقف ہیں لیکن زندہ افراد سے اور ان کی گوناگوں بشری حماقتوں اور الجھنوں اور مصیبتوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ انسانی بستی پر نظر ڈالتے ہیں لیکن اتنی بلندی سے کہ انہیں اس بستی کے رہنے والوں کے خد وخال نظر نہیں آتے۔ انہیں اس کا کوئی افسوس نہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد دنیا اور دنیا کے رہنے والوں کی ترجمانی نہیں ؎

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند
چہ آید زاں غزلخوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

ان کا مقصد تو اپنے تخیل کی مدد سے ایک ایسی بلند تر حقیقت کا بیان ہے۔ جس کی کشش سے متاثر ہو کر ان کے پیرو اس دنیا میں ایک جہانِ تازہ کی بنیاد ڈال دیں ؎

آں ہنرمندے کہ بر فطرت فزود رازِ خود را بر نگاہِ ما کشود
حورِ او از حورِ جنت خوشتر است منکرِ لات و مناتش کافر است
آفریند کائناتِ دیگرے قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

غالب اور اقبال کے درمیان بڑا فرق بہت حد تک تو اس اختلافِ مقاصد کی وجہ سے ہے لیکن اس میں اختلافِ طبائع اور مختلف تعلیم و تربیت کو بھی بڑا دخل ہے۔ اقبال فلسفی تھے۔ اور مرزا محض شاعر۔ اقبال کے پیشِ نظر زیادہ تر وہی مسائل تھے۔ جن سے فلسفیوں کو دلچسپی ہے اور مرزا کے اشعار میں بیشتر وہ مضامین ہیں۔ جو مشرقی شعرا کو مرغوب ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال حقائق و واقعات کو بلند حکیمانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے اور مرزا ذاتی جذبات اور احساسات کی روشنی میں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مرزا اپنے فکرِ فلک پیما کی مدد سے ان مسائل پر بھی نظر ڈال لیتے تھے۔ جو فلسفیوں کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ اور ان کی زیادہ توجہ روزمرہ کے عام بشری مسائل پر ہی رہتی۔ اس کے برعکس اگرچہ اقبال

بینی حیراں مرد درو دست   کہ رسن تہمت شعر و سخن بست ا
بکوئے دلبراں کارے ندارم   دل ما ہے غم یارے ندارم
نہ خاک من غبار رہگزارے   نہ در خاکم دلی بے اختیارے
بحرِ ل ایں ہمداستانم   رقیب و قاصد و درباں ندانم

اقبال اور غالب کے درمیاں یہ ایک بڑا اصولی فرق ہے۔ غالب محض شاعر تھا اس نے اقبال کی طرح اپنے پیغام سے ایک نئی دنیا پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اسکے علاوہ اس نے عام شعرا کی طرح اپنے دل کی داستاں بیاں کی ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے

بکوئے دلبراں کارے ندارم   دلی زارے غم یارے ندارم

اس کی شاعری کا بیشتر حصہ محبت اور اس کی گوناگوں کیفیتوں کا بیاں ہے اور اسے "رقیب و قاصد و درباں" کی شناسائی سے کوئی عار نہیں - یہ صحیح ہے۔ کہ وہ اپنے بہترین لمحوں میں "حرِ ل ایں" کے ساتھ ہمداستاں ہو جاتا ہے۔ اور اس کا ذہن بسا اس سرزمین سے واقف نہیں جہاں شاعری اور فلسفہ اور مذہب کی حدیں مل جاتی ہیں لیکن وہ اس سرزمین کی نسبت عام انسانی دنیا کے حالات سے زیادہ واقف ہے اور وہ زیادہ انہیں کا ذکر کرتا ہے اس کی شاعری میں بیشتر عام انسانی خواہشوں، امنگوں اور ناکامیوں کا ذکر ہے۔ اور اں کی نسبت اس کی واقفیت اقبال سے زیادہ گہری اور صحیح ہے۔

اقبال کا معاملہ اس سے مختلف ہے وہ اس دنیا کے غم و الم اور اس کی پیچیدگیوں سے ناواقف نہیں لیکن انسان اور انسانی مسائل کی نسبت اں کا نقطۂ نظر فلسفیانہ ہے شاعرانہ یا حسیاتی نہیں۔ وہ بنی نوعِ انسان کی بنیادی خوبیوں اور خامیوں سے

مضمون آفرینی کا رواج تھا۔ غالب نے اسی رنگ کا تتبع کیا۔ اور اگرچہ انہوں نے بیدل کی پیروی ترک کر دی۔ لیکن پھر بھی انہوں نے جن شعرا کی پیروی کی۔ وہ سعدی اور حافظ کی نسبت فغانی شیرازی سے قریب تر تھے۔ اقبال نے حافظ کے فلسفۂ زندگی پر تنقید کی ہے۔ لیکن زبان اور طرز ادا کے معاملے میں انہوں نے حافظ کی پیروی کی ہے۔ اور اُن کی بہترین غزلوں میں حافظ کی سہل ممتنع شیرینی۔ سادگی اور دلآویزی ہے +

شاعری کے متعلق دونوں کا نقطۂ نظر

اس اختلاف کے علاوہ غالب اور اقبال میں ایک اہم اختلاف فنِ شاعری کے متعلق نقطۂ نظر میں ہے۔ غالب کے لئے شعر گوئی محض دل لگی یا جودتِ طبع کا اظہار نہ تھی۔ وہ اسے حقیقت سے پردہ اُٹھانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ یہ بھی ایک اہم اور قابلِ قدر کام ہے۔
"ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ بودم ۔ مرا بداں فریفت کہ آئینہ زدودن و صورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است"

غالب کا شاعرانہ مطمحِ نظر بلند تھا۔ لیکن اقبال کا مطمحِ نظر ان کی نسبت بدرجہا بلند اور عام شاعروں کے نقطۂ نظر سے اصولاً مختلف تھا۔ انہوں نے "شمع اور شاعر" کی تصنیف (فروری ۱۹۱۲ء) کے بعد فنِ شاعری کو بطور شاعری کے نہیں بلکہ "جزوے از پیغمبری" سمجھ کر اختیار کیا ہے ؎

کہہ گئے ہیں شاعری "جزویست از پیغمبری"
ہاں سُنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

اور ؎

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے ۔ زندہ کر دے سوزِ دل کو جوہرِ گفتار سے

انہیں اس بات سے سخت نفرت ہے۔ کہ کوئی انہیں محض "شاعر" کہے ؎

اقبال اور غالب کے مختلف حالات اور ماحول کی وجہ سے مندرجہ بالا اختلافات کا پیدا
ہونا ضروری امر تھا لیکن ان کے علاوہ دونوں میں ایسے اختلافات بھی تھے جن کا سبب اتفاقی اثرات
تھے۔ مرزا غالب کی اقبال کی طرح مغربی ادبیات تک رسائی نہ تھی لیکن تمام فارسی شعرا کا کلام ان کے
سامنے تھا اور انہوں نے اس سے بالخصوص ہندوستان کے فارسی شعرا سے کسب فیض کیا۔ لیکن
حسن اتفاق ہے کہ انہوں نے فارسی کے سب سے بڑے شاعر کی کماحقہ قدر نہیں کی۔ اور اس کی
خوبیوں کو نہیں سمجھا۔ حافظ کا ذکر غالب کے کلام میں چار پانچ جگہ آیا ہے لیکن سوائے ایک آدھ
دفعہ کے بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا کہ ان کے دل میں حافظ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ایک
غزل کا مقطع ہے ؎

غالبم تشنۂ تلخابہ نہ ہیچو حافظ — مائل شاہد و ساقی نہ ماہا یا ہو

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

آنکہ پیرایہ حافظ بودہ است — غالب آشفتہ نوا آں نیز ہم

حقیقت یہ ہے کہ فارسی شعرا بالخصوص متغزلین میں فقط حافظ ہی ایک ایسا شاعر ہے
جس کی شاعری ایک خاص ملک یا خاص طرز شاعری کے شائقین کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا
کے لئے ہے۔ اس کے اشعار میں انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کا بیان ہے۔ زلف و خال
اور گل و بلبل کا ذکر فقط اس قدر ہے جس قدر ملح فی الطعام۔ اس کے علاوہ حافظ کی دلنشین
شاعری کی زبان بے تکلف الفاظ اور تکیہ کلاموں سے پاک۔ چاہیئے تو تھا کہ غالب اس کی
خوبیاں سمجھتے اور اس کا رنگ اختیار کرتے لیکن غالب نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی
وہاں بیدل اور عرفی اور حزیں مقبول تھے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری کی روایات ظہوری کے
بعد قائم ہوئیں اور اس وقت عراقی کے زیر اثر ہندوستان بلکہ ایران میں بھی مشکل گوئی اور

ایک ہی رُوح تھے۔ صحیح نہیں +

اقبالؔ اور غالبؔ میں ایک ظاہری فرق توفنی اور ادبی ہے۔ دونوں مختلف ادبی فضاؤں میں پلے۔ اور دونوں نے مختلف ادبی روایات کا تتبع کیا۔ غالبؔ کے پیش نظر شاعرانہ اظہار کے ذرائع بہت محدود اور ناقص تھے۔ یعنی غزل اور قصیدہ، یا زیادہ سے زیادہ مثنوی اور رُباعی۔ شاعرانہ مضامین کا میدان اس سے بھی تنگ تھا۔ قدیم زمانے سے شعرا ایک تنگ دائرے میں شعر گوئی کرتے آئے تھے۔ اور اس سے باہر نکلنا کفر تھا۔ اگر کوئی جدت پسند شاعر عام روش سے ہٹنا چاہتا۔ تو نہ اسکے سامنے کوئی صحیح نمونہ تھا۔ نہ شاعرانہ خوبیاں پرکھنے کے لیے کوئی صحیح معیار۔ نتیجہ یہ کہ مروجہ اسلوب شاعری ترک کرنے سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا۔ اور شاعر کسی مہمل بلکہ مضر انفرادیت (مثلاً طرزِ بیدل یا ریختی) میں گرفتار ہو جاتا +

اقبالؔ اس معاملے میں بڑے خوش قسمت تھے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب کی بہترین درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی۔ السنہ شرقیہ کے علاوہ مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی اور جرمن کے بہترین شعرا کے نمونے اُن کے سامنے موجود تھے۔ نئے اصنافِ شاعری اور نئے خیالات کے خلاف جو تعصب تھا۔ اُسے بہت حد تک حالیؔ اور کسی حد تک غالبؔ نے کم کر دیا تھا۔ اور اقبالؔ کو اس معاملے میں بڑی آزادی تھی سہ

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت   منتے بر قدمم راہ روان است مرا!

نتیجہ یہ کہ ان کے کلام میں مشرق اور مغرب کی بہترین خصوصیات ہیں مضامین میں بے حد تنوع اور شگفتگی ہے۔ اصنافِ شاعری میں بھی ان کے وسیع مطالعہ کا اثر نمایاں ہے۔ اور پیام مشرق میں کئی ایسی شاعرانہ طرزیں ہیں۔ جو قدیم مشرقی شاعری میں معدوم ہیں۔ اور جنہیں شاعر نے مغربی یا جدید ایرانی شاعری سے اخذ کیا +

کرنا بہت مشکل ہے اور عین اس وقت جب مولینا حالی نے اس رائے کو نقل کیا پنجاب کی
سرزمین پر ایک نوجوان نشو ونما پا رہا تھا جو اس پیشینگوئی کو آگے چل کر غلط ثابت کرنے والا تھا
اقبال اور غالب میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر پورا
عبور حاصل تھا۔ دونوں کی شخصیت کا بہترین اظہار ان کے فارسی کلام میں ہے دونوں کو
خدا نے زبردست دل و دماغ دیا تھا اور رفعت تخیل دونوں کے اشعار کی خصوصیت ہے۔
دونوں کی طبیعت جدت پسند تھی اور دونوں عام روش سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے دونوں
گہری سوچ کے عادی تھے۔ اور ان کے اشعار میں حکیمانہ عمق اشکال کی حد تک موجود ہے۔
دونوں معاصرین کی [illegible] کے مقابلے میں زبان اور محاورہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور دونوں
نئی نسل کو خاص طور پر پسند ہیں +

اقبال اور غالب میں سطحی مشابہت اس حد تک نمایاں ہے کہ سر عبدالقادر بانگ درا
کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اردو اور فارسی کی شاعری سے
جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں
جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ
کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

علامہ اقبال کے متعلق سر عبدالقادر کی رائے جس ادب اور احترام کی مستحق ہے وہ ظاہر ہے لیکن
ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے سطحی مشابہتوں پر زیادہ توجہ دی ہے۔ ہم نے ان میں سے چند
مشابہتیں سطور مندرجہ بالا میں گنا دی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری مشابہتوں کے
باوجود غالب اور اقبال کی شخصیتیں بالکل مختلف ہیں اور اُن کی نسبت یہ کہنا کہ وہ تقابلیں میں

گمرہانِ رہِ تقلید بصیرت بُودند   شکر کین قافلہ را راہبرے پیدا شد

چند تاریک نشینی شبِ ہجراں فیضی

خیز کز صبح سعادت اثرے پیدا شد

بدایونی فیضی کے اشعار کے متعلق کہتا ہے۔ کہ الفاظ کی استخوان بندی اچھی ہے لیکن درد اور اثر سے خالی ہیں۔ یوں تو فیضی کے متعلق بدایونی کا اظہارِ خیال شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن کم از کم اس معاملے میں بدایونی کی رائے صحیح ہے۔ فیضی کے اشعار میں زور اور جوش کی کمی نہیں۔ لیکن درد و اثر تھوڑا ہے۔

ہندوستانی شعرا (بالخصوص میر تقی میر) کے کلام میں سوز و الم کی اس حد تک فراوانی ہے۔ کہ ایک شخص جس کا کلام حزنیہ عنصر سے خالی ہو۔ غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ شاعر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بیگانہ رہے۔ باعمداً ان سے آنکھیں بند کر لے۔ فیضی کے اشعار سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اس نے زندگی کو شاہی دربار کے جھروکوں سے دیکھا تھا۔ اور زندگی کی وہ تلخ حقیقتیں جن کا صحیح مطالعہ نظر کو گہرائی، دل کو گداختگی اور طبیعت کو توازن دے دیتا ہے اُس کی نظر سے دُور رہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اسکے کلام میں وہ عمق اور تاثیر نہیں۔ جو غالب کے کلام میں ہے۔ جس نے زندگی کے تلخ اور خوشگوار، دونو پہلو دیکھے تھے۔ اور دونو کی صحیح ترجمانی کی تھی۔

اقبال اور غالب

مولٰینا حالی نے جب ۱۸۹۷ء میں یادگارِ غالب لکھی۔ تو انہوں نے مرزا غالب کی نسبت نواب ضیاء الدین کا ایک قول نقل کیا۔ کہ "ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین (یعنی امیر خسرو) سے ہوئی۔ اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔" لیکن ادبی معاملات میں صحیح پیشینگوئی

غالب نے کیا ٹھیک کہا ہے ؎

چوں اصل کار در نظر ہمتیں نکند | سیارہ خود سروشی جستجو گرفت

عہدِ اکبری کا ترجمان

فیضی اور غالب دونوں مغلیہ دور کے شاعر تھے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایک مغلیہ حکومت کے زمانۂ عروج کا ترجمان ہے۔ اور دوسرا اس کے زوال کا نوحہ خواں دونوں کی شاعری اس اختلافِ حالات کا آئینہ ہے غالب کے اشعار میں مایوسی اور ناکامی کا اظہار بہت صاف ہے اور فیضی میں خوشی، خود اعتمادی، حماسیت، اور ناز و فخر کا جوش و خروش نمایاں ہے ؎

امشب کہ سپہر بے ملال است | در طبع زمانہ اعتدال است
رخشِ اُمید در نشاط است | بہرام ہراس در دوال است
ہم گردن وصل سربلند است | ہم فرق فراق پائمال است
طاؤس جمال خوش خرام است | شہباز ہوس کشادہ بال است

فیضی بنود خوش ملا
پیغام دل اندریں حال است

ایک اور پُرزور اور پُرمعنی غزل ہے ؎

دہر را مژدہ کہ روز دگرے پیدا شد | کہ ز خورشید سحر خیز ترے پیدا شد
خفتہ کتاب است تب تعرّض پیدا شد | گرد آفاق مسالک دگرے پیدا شد
آسماں دید شبے دور جہانگیر نہاد | گفت خورشید مرا ہمسرے پیدا شد
اے کہ از تیر اقبال نظرے خواہی | چشم بکشائے کہ صاحب نظرے پیدا شد
نیست یک ذرہ ز خورشید میسر پنہاں | کہ ز خورشید یکے دیدہ ورے پیدا شد

قریب لانے کے دُور تر لے جاتے ہیں۔

فیضی اور اقبالؔ کے نقطۂ نظر میں کمی یہ ہے۔ کہ انہوں نے جس قوت کو عقل مان کر اس کی مذمت کی ہے۔ اسے عقل کی مکمل صورت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ انہوں نے عقل کی جو صورتیں قرار دی ہیں۔ ان میں کوتاہیاں ہیں۔ لیکن عقل سمجھ مکمل اس صورت میں ہوگی۔ جب یہ اپنی خامیوں سے بھی واقف ہو۔ اور ان سے جو بُرے نتائج نکلنے والے ہیں۔ اُن کا پہلے سے اندازہ کر کے سدِباب کر سکے۔ غالبؔ جس خرد اور دانشوری کا مداح ہے۔ دُور بینی اور مآل اندیشی اس کا جزوِ لاینفک ہے۔ اُس کی نظر کام کے ہر پہلو پر جاتی ہے۔ فقط ظاہری یا منطقیانہ یا سطحی پہلوؤں پر نہیں۔ جو لوگ اس صحیح سمجھ سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ وہ تنقیدی یا متاملانہ نقطۂ نظر سے گمراہ نہیں ہو جاتے۔ ان کی نظر کام کے عملی اور آخری نتائج پر ہے۔ اور وہ ان کا پورا دھیان رکھتے ہیں ؎

راہ زین دیدہ وراں جُوئے کہ از دیدۂ دری　　نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند

راہ زین دیدہ وراں پرس کہ در گرم روی　　جادہ چُون نبضِ نہاں در تنِ صحرا بینند

جو لوگ فیضیؔ یا اقبالؔ کی طرح باقاعدہ منطقی یا فلسفی ہوتے ہیں۔ انہیں اپنا ذہن ایک خاص طریقے پر استعمال کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی کوشش کا میدان قیاسی اصولوں تک محدود رہتا ہے۔ عملی دُنیا سے اسے گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ طریق کار عملاً بہت مفید نہیں رہتا۔ اور "چیا بکئے تعقل" سے جو بڑی بڑی امیدیں باندھی جاتی ہیں وہ پوری نہیں ہوتیں۔ فیضیؔ اور اقبالؔ کے اشعار میں اس ناکامی کا اعتراف ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ کہ جو لوگ اپنی ذہنی کوششیں اس طریقہ تک محدود نہیں کرتے۔ اور "چیا بکئے تعقل" سے غیر معمولی توقعات بھی نہیں رکھتے۔ ان کا بھی عقل کے متعلق یہی نقطۂ نظر

عادت ہے جس سے عمل کی قوت شل ہو جاتی ہے اقبال کی شاعری میں عشق ایک زبردست احساس ہے جس سے متاثر ہو کر انسان کوئی عمل کرتا ہے اور عقل سوچ و پیچ اور تذبذب کی کیفیت پیدا کرتی ہے جس سے انسان کام کا اونچ نیچ سمجھتا ہے لیکن جس سے اس کام کرنے کی خواہش کمزور ہو جاتی ہے اقبال کو جس عقل سے شکایت ہے اُس کی کارفرمائیاں شکسپیئر نے ہیملٹ کے کیرکٹر میں نمایاں کی ہیں ؎

To do or not to do, that is the question!

اقبال کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

انہوں نے ایک اور نظم میں نظیری کا شعر تضمین کر کے اپنا نقطہ نظر واضح کیا ہے ؎

ہر کجا راہ دہد اسپ بداں تازکہ ما بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدیم

اقبال جس عقل کے خلاف ہیں۔ اُس کی طرفداری کرنا مشکل ہے لیکن کیا یہ صحیح نہیں۔ کہ عقل کا یہ مفہوم بہت محدود ہے، جہاں تک عقل کا عمل سے تعلق ہے عقل نہ صرف ایک کام کے اونچ نیچ پر متاملانہ نظر ڈالتی ہے بلکہ اس کام کے کرنے کا عملی اور احسن طریقہ بتانا بھی اسی کا کام ہے عشق کی مثال سٹیم یا بجلی کی طرح ایک طاقت کی ہے جس سے کسی کام کرنے کی قوت حاصل ہوتی ہے اور عقل یہ بتاتی ہے کہ اس طاقت سے کس طرح کام لیا جائے۔ پیغمبروں کا اور خاص طور پر خوش نصیب آدمیوں کا معاملہ مختلف ہے۔ انہیں تو الہام سے یا چشم باطن کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک کام کرنے کا احسن طریقہ کونسا ہے لیکن عام انسان اگر اپنی عقل سمجھ کو کام میں نہ لائیں۔ تو وہ صحیح طور پر کسی کام کو مکمل نہ کر سکیں یا ایسے کاموں میں اپنی تمام قوت صرف کر دیں جو بجائے انسان کو منزل مقصود سے

اے الٰہی لعقل دُورِ اندیشش — نالک از اہرمن شناختہ ام

لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ تنقیدی نقطۂ نظر کو حد سے بڑھا دینے اور حس تناسب کو ہاتھ سے کھو دینے سے انسان اصل مقصد سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس سے مختلف طریقوں کی غلطیاں تو نظر آجاتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا شبہاتی اسلوبِ خیال استوار ہو جاتا ہے جسکی موجودگی میں تسکین یا کسی ایک طریقے کے متعلق اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ فیضی کی بھی یہی حالت ہوئی تھی کہ وہ اپنی روحانی بے چینی سے بے تاب ہو کر پکار اُٹھتا ہے ؎

تاریکئ عقل در کشاکش دارد — از شمع رضا فروغ تسلیم دہ

فیضی کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اسے شروع میں عقل، بالخصوص اپنی عقل پر بڑا بھروسہ تھا۔ اور امید تھی۔ کہ اس سے "عقدۂ دین و دول" حل ہو جائینگے۔ لیکن ایک تو خرد و دانش اور پھر جس تنقیدی نقطۂ نظر کو فیضی عقل سمجھا ہوا تھا۔ اُس کی کوتاہیاں ظاہر تھیں۔ خالص تنقیدی اور منفیانہ نقطۂ نظر کسی عظیم الشان حقیقت تک پہنچنے میں مدد نہیں دے سکتا مذہبی معاملات میں تو خاص طور پر یہ اصول مسلمہ ہے۔ کہ جو شخص شک سے شروع کرتا ہے۔ وہ بالعموم اسی وادی میں سرگرداں رہتا ہے۔ روحانی تسکین اور سربلندی کے لئے اپنے روحانی تجربہ اور مشاہدہ (چشم باطن) پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ "خردِ خردہ بیں" پر نہیں۔ فیضی نے بھی بالآخر اس حقیقت کو پالیا۔ اور "عقل" کی راہنمائی سے جو اُسے مایوسی ہوئی اُس کا اظہار اس کے اشعار میں ہے۔ لیکن مرزا غالب نے نہ ہی روحانی معاملات میں وہ تنقیدی اور منفیانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جو فیضی کا تھا اور نہ ہی انہیں اس طرح کی مایوسی ہوئی۔

اقبال کے نزدیک بھی عقل کی حیثیت منفیانہ ہے لیکن جس عقل کے وہ شاکی ہیں۔ وہ ایک تنقیدی قوت نہیں جس سے روحانی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ تفکر و تامل کی وہ

خرد جستہ ٔ زندگانی بود　　خرد راہ پیری جوانی بود
فروغ سحرگاہ رُوحانیاں　　چراغ شبستان یونانیاں
نخستین نمودار ہستی گرائے　　خرد بود کا مد سیاہی ردائے
خرد جو کہ ار خود بود مرگ من
بہ ہستی خرد بس بود برگ من!

مرزا نے صرف خرد اور دانش کی اپنے اشعار میں جابجا تعریف کی ہے بلکہ انکی تصنیفات اور احوال زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ خدا نے خرد اور دانشوری سے انہیں حصہ وافر دیا تھا اور جن لوگوں کو ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ۔ وہ ان کی اس خوبی کی خاص طور پر تعریف کرتے ہیں ۔ میر مہدی مجروح کلیات غالب کے آخر میں لکھتے ہیں ؎　　تو قفل خرد را کلید آمدی
بہ آساں دریں جا پدید آمدی!

انوری اور فیضی دونوں بلند پایہ فلسفی تھے اور مصداق ؎
جو حال حد سے گزرا وہ مشکل مسلہ ہوا

عقل و منطق کی فراوانی بھی فلسفیوں اور منطقیوں کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے لیکن عقل و خرد کے متعلق ان کا اور غالب کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ جس عقل کے وہ شناکی ہیں وہ غالب کی خرد اور دانش سے بالکل مختلف ہے فیضی کے نزدیک عقل ایک طرح کی تنقیدی قوت ہے جس سے وہ صحیح و غلط اور حق و باطل کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہے ؎
فیضیم کہ دل دقیقہ شناس　　نقش ستر دلش شناختہ ام
آنچہ باید شناخت دانا ما　　بہ یقیں نے بظن شناختہ ام

اشعار میں اُس نے عقل کی کوتاہیوں کی شکایت کی ہے۔ ایک فارسی رُباعی ہے ؎

یارب ز کرم امیدِ بے بیم دہ　　علمے کہ رضائے تست تعلیم دہ

تاریکئ عقل در کشاکش دارد　　از شمع رضا فروغ تسلیم دہ

ایک اور شعر میں عقل کی کوتاہیوں کا ذکر ہے ؎

اے کہ بمعراجِ عقل آمدہ سر بلند

رو کہ در دیوان عشق جائے تو نیست آمدہ

ایک فارسی رباعی میں یہ اظہار اس سے بھی صاف صاف اور زوردار لفظوں میں ہُوا ہے ؎

چندانکہ بعقل گیرودار است مرا　　صد گونہ گرہ بکار و بار است مرا

اے عقل برو کہ از تو کارم نشود　　دے بخت بیا کہ با تو کار است مرا

فیضی کے علاوہ اقبال نے بھی جا بجا اپنے اشعار میں عقل کی کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے برخلاف اس کے غالب نے کئی جگہ عقل بالخصوص خرد اور دانش کی تعریف کی ہے۔ کئی جگہ تو یہ اظہار ضمناً اور سرسری سا ہے۔ مثلاً مثلاً جہاں عقل کو "نہفتہ داں" کہا ہے۔ یا "کاروبارِ مردم ہشیار" اور "فرزانۂ بیدار مغز" کا ذکر تعریف کے پیرائے میں کیا ہے۔ لیکن ابرِ گہر بار میں متعدد اشعار صراحتاً خرد کی تعریف میں ہیں ؎

سخن گرچہ گنجینۂ گوہر است　　خرد را ولے تابشِ دیگر است

ہمانا بشبہائے چوں پرِ زاغ　　نہ بینی گہر جز بروشن چراغ

بہ پیرایشِ ایں کہن کارگاہ　　بدانش نواں دید آئینِ نگاہ

بود بستگی را کشاد از خرد　　سرِ مرد خالی مباد از خرد!!

آگے چل کر یہ اظہار اور بھی زوردار ہو گیا ہے ؎

ایک فارسی قطعہ میں بہشت اور دوزخ کے متعلق بھی ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن سے
کلام غالب کے ناظرین بخوبی واقف ہیں ؎

اے محیط مواعظ کمال ملت و دیں　　دریغ گوہر وعظ ترا مصارف نیست
نہ پیش من سخن از دوزخ و بہشت مگو　　کہ گوش ہوش حریفاں بریں مطارف نیست
خدائے را ز من احوال حشر و نشر مپرس　　کہ سادہ لوح محبت الوالمعارف نیست

غلام صوفی صافی ستوم کہ مے گوید
بہشت و دوزخ بجز بسط و قبض عارف نیست

مرزا غالب نے ایک دو جگہ فقہی مسائل کی نسبت بڑے جلے کٹے فقرے لکھے ہیں۔
فیضی نے بھی ایک قطعہ میں اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے اسی نسبت لکھتے ہیں ؎

ایا حریف نادریں بزمگاہ فیضی را　　گماں مبر کہ رحیل تہی سبو یالست
کشیدہ بادہ تحقیق در حدائق علم　　ز تا چہار خرد دستہ نو یالست
نکو و دقت معانی کہ مرغ پر نہ زند　　بجائی تعقل دو اسپہ پو یالست
مگر مسائل فقہ مقلداں ہوا　　کہ علم خیلہ گماں[1] و ہمہ ہو یالست
متاخرات فرائض کہ کس محابادش　　ازو مپرس کہ آں علم مردہ شو یالستا

عقل و خرد

فیضی کے کلام سے خیال ہوتا ہے کہ جید عالم تھا اور طبیعت بھی عالمانہ فکر کتابی پائی تھی اپنی عقل سمجھ پر ناز بہت زیادہ تھا اور خیال تھا کہ اسکی مدد سے دنیا جہاں کے سارے عقدے حل ہو جائیں گے لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی اور کئی

[1] مخدوم الملک جو عہد اکبری کے شیخ الاسلام تھے سال کے شروع میں اپنا سارا مال بیوی کو ہبہ کر دیتے اور سال کے ختم ہونے سے پہلے پھیر دیتی تاکہ دونوں زکوٰۃ سے بچ جائیں!!

بہت سے ہیں۔ جن میں کعبہ کے متعلق طنزیہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک غزل کا شعر ہے ؎

آنکہ مے کرد مرا منع بہ پرستیدنِ بُت — درحرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

کعبہ و تعلیم آدابم مکن — گرم رو را فرصتِ احرام نیست
کاروانِ کعبہ شد منزل نشیں — رہروانِ عشق را آرام نیست

کئی جگہ یہ مضمون نظم کیا گیا کہ کعبہ کو گرا کر اس کی جگہ ایک نئی عمارت تعمیر کرنی چاہیئے ؎

گر کعبہ شود ویراں سہل است کہ عشق از تو — کاخے دگر افرازد طرحے دگر اندازد!

ایک غزل میں اس خیال کو بڑے زوردار طریقے سے ادا کیا ہے ؎

بیا کہ روئے بمحراب گاہِ نور نہیم — بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
خطیم کعبہ شکست و اساسِ قبلہ بریخت — تا تازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم
علو طاقِ حرم تا بچند مصلحت است — کہ داغِ عشق بہ پیشانیِ غرور نہیم

ایک اور غزل میں یہ اظہار اور بھی تفصیل سے ہے ؎

گو عشق کہ زنجیرِ درِ کعبہ گدازیم — وز بہرِ پرستش صنمے چند بسازیم
از پردہ درِ کعبہ بریشم بستانیم — بر چنگ بربندیم و بمسجد بنوازیم
ویں کعبہ کہ حجاج برافراختہ آں را — انداختہ چوں دیر اساسے بفرازیم
از بادۂ گلرنگ بہ سجادۂ طاعت — نقشے بنگاریم و بساطے بطرازیم
وز سنگِ سیہ مہرہ بسازیم و محراب — با مغبچگاں شعبدۂ چند بسازیم
پے کردنِ جمازہ دریں راہ ثواب است — بر قافلۂ کعبہ رواں مست بتازیم
بامِ درِ میخانہ بہ از صد عرفات است — ما با ہمہ سازیم و بسالوس نسازیم!

فیضیؔ دربارِ مغلیہ کا اُس زمانے میں ملک الشعرا تھا جب مغلوں کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور مرزا غالب دربارِ مغلیہ سے اس زمانے میں وابستہ ہوئے جب مغلیہ حکومت نزع کی حالت میں تھی۔ اس اختلاف حالات کا عکس ان دونوں کی شاعری میں نمایاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود چند ایک خصوصیات فیضیؔ اور غالبؔ میں مشترک ہیں ان خصوصیات میں سب سے اہم مذہب کے متعلق ایک آزاد خیالی ہے جو فیضی میں تو تشکک کی حد تک جا پہنچی ہے ؛

فیضی کی آزاد خیالی | فیضی اُس زمانے میں پیدا ہُوا جب ہندوستان میں اسلام کے نام پر دو بااثر علما (مخدوم الملک اور صدر الصدور) نے بڑا جابرانہ احتساب جاری کر رکھا تھا ہر وہ شخص جس سے ان بزرگوں کو کوئی شکایت ہوتی اسکے خلاف مدعی ہونے کا فتویٰ عائد کرکے حدِ شرعی جاری کی جاتی فیضی ابوالفضل اور انکے باپ شیخ مبارک کو اس سلسلے میں بہت پریشان کیا گیا ان بزرگوں نے جس حد تک اسلام کی صحیح پیروی کی اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی جو اکبری دینِ الٰہی کے سب سے بڑے دشمن تھے وہ بھی ان بزرگوں کو "علماء سو" کہتے ہیں لیکن فیضی بیچارہ کے ظلم و تشدد کا یہ اثر ہُوا کہ وہ مذہب اسلام سے ہی کسی قدر برگشتہ ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اسلام فی الواقع وہی طریقہ ہے جس کی یہ بزرگ پیروی کرتے ہیں۔ تو اس اسلام سے کفر اچھا ہے

زباں کشیدہ مدار الفضلائے محتسب زبا شہود کند رد دعوئے گران ایمانی
اگر حقیقت اسلام در جہاں این است ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

مذہب کے متعلق آزادانہ نقطہ نظر کا فیضی نے کئی جگہ اظہار کیا ہے۔ ایسے شعر

رواج ہو گیا تھا۔ اس مشکل گوئی کی وجہ سے کلام میں غیر ضروری الجھنیں اور غیر شاعرانہ مضامین آ گئے ۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے ۔ کہ جب تک شعرا نے اپنے تئیں سادہ اور عام مضامین تک محدود رکھا۔ تب تک ان کے کلام میں حکیمانہ عمق اور بلند پروازی بھی نہیں آئی ۔ اور یہ کمی کلیات خسرو میں نظر آتی ہے ؎

خسرو نے کئی بلند پایہ مثنویاں لکھی ہیں۔ اور مثنوی نگاری میں ان کا مرتبہ غالب سے بہت بلند ہے ۔ لیکن قصیدہ نویسی میں شاید مرزا امیر خسرو سے آگے نکل گئے ہیں ۔ خسرو کے کئی قصیدے با اثر ہیں ۔ اور طرح طرح کی صنعتوں سے مرصع ہیں ۔ لیکن ان میں وہ رفعت تخیل اور حکیمانہ خیالات نہیں جو مرزا کے قصائد میں ہیں ۔ مرزا نے اپنے بہترین قصیدوں کی تشبیبیں مضامین فطرت یا زندگی کے متعلق حکیمانہ مسائل بیان کرنے کیلئے وقف رکھیں ۔ اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے ۔ لیکن خسرو کی تشبیبیں اس قدر بلند پایہ نہیں ۔ ان کے بعض قصیدے تعداد اشعار کے لحاظ سے بھی مختصر ہیں ۔ اور بالعموم ان میں وہ بلندی اور رفعت نہیں ۔ جو مرزا کے بہترین قصائد کو ممتاز کرتی ہے ؎

فیضی خسرو کے علاوہ ایک اور ہندوستانی جس کے فارسی اشعار کا ذکر مرزا نے قدر سے احترام سے کیا ہے ۔ دربار اکبری کا ملک الشعرا فیضی تھا ۔ فیضی بہت پُر گو شاعر تھا۔ اُس نے مہابھارت اور بھاگوت گیتا کا فارسی مثنوی میں ترجمہ کیا ۔ اکبر کے حکم سے خمسہ نظامی کا جواب لکھنا شروع کیا تھا لیکن پانچوں کتابیں مکمل نہ کر سکا ۔ آج کل فیضی کی مثنویاں بہت کم پڑھی جاتی ہیں ۔ لیکن غزلیں آج بھی مقبول ہیں ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ۔ کہ اس کے کلام میں کئی باتیں ہیں ۔ جو اور شعرا کے ہاں بہت کم ملتی ہیں ؎

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری　　ہر چند وصفت میکنم در حسن ازاں زیباتری
آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام　　بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری
خسروؔ غریبست و گدا افتادہ در شہر شما　　باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

من ندیدم چوں تو ہرگز دلبرے　　سرکشے عاشق کشے عیارگرے
از تو یک بارہ رخوباں عالمے　　از تو تیرے و ز دلہا لشکرے
من سرے دارم کہ در پایت کشم　　گر تو در خوبی نداری ہمسرے
دست نہ بر سینہ ام تا بنگری　　آتشے پوشیدہ در خاکسترے

حال رخش گردی بدور خاکی ہنوز　　درد ہا دادی و درمانی ہنوز
ملک دل کردی خراب از تیغ ناز　　وا ندریں ویرانہ سلطانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

پیری و شاہد پرستی ناخوش است
خسروؔ تا کے پریشانی ہنوز

سلام صحبت ملاے صبا بگوئے　　بحال زار بگل سو بہار بگوئے
بی‌ہمت قوت عقل و نماند طاقت صبر　　بگوئے حال من او را و بہار بگوئے
ہزار چون گشتیم ز غم کہ نتواں گفت　　یکے اگر نتوانی ازاں ہزار بگوئے

لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ اس امر کا اظہار کر دیا جائے کہ کلام خسروؔ میں ایسی غزلوں کی تعداد تھوڑی ہے اور پھر خسروؔ کے بہترین اشعار میں بھی وہ حکیمانہ تدقیق نہیں جو غالبؔ کا طرۂ امتیاز ہے غالبؔ اور خسروؔ کے طرز الگ الگ تھے۔ خسروؔ سادہ اور پُر اثر اشعار پسند کرتے تھے اور مرزا اس زمانے میں پیدا ہوئے جب مشکل گوئی کا

ہے ۔ بہ حیثیت مجموعی مرزا کا پایہ عرفی کی بہ نسبت بلند ہے ۔ اور ان کا یہ شعر کسی خلافِ حقیقت تعلی کا اظہار نہیں ؎

عرفی کسے است لیک نہ چون من دریں چہ بحث! | او جستہ جستہ غالب و من دستہ دستہ ام

خسرو

ہندوستان کے جن فارسی شعرا کا ذکر مرزا نے تعریف کے پیرائے میں کیا ہے ۔ ان میں امیر خسرو خاص طور پر ممتاز ہیں ۔ عام طور پر انہیں ہندوستان کا بہترین فارسی شاعر سمجھا جاتا ہے ۔ وہ اس زمانے میں پیدا ہوئے ۔ جب ہندوستان اور ایران کے درمیان ملکی اور نسلی تعصبات نے تنگ نظری کی دیوار نہیں کھڑی کر دی تھی ۔ ایرانی شعرا بالخصوص سعدی اور جامی نے ان کی دل کھولکر تعریف کی ۔ اس کے علاوہ قلمرو تصوف میں انہیں جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے ۔ اس نے بھی تذکرہ نویسوں کو متاثر کیا ۔ اور بالعموم انہیں شعر و شاعری میں وہ بلند مرتبہ دیا جاتا ہے ۔ جس کے خالص ادبی نقطۂ نظر سے وہ شاید مستحق نہیں ۔

غالب اور خسرو کا موازنہ کرنا کسی قدر مشکل ہے ۔ خسرو کی شاعری اُس زمانے کی یادگار ہے ۔ جب سادہ خیالات کو دلنشیں طریقے سے ادا کرنا ہی کمالِ شاعری سمجھا جاتا تھا اور ابھی مضمون آفرینی اور خیال بندی کو فروغ حاصل نہ ہوا تھا ۔ امیر خسرو اس سادہ طرزِ شاعری کے لئے خاص طور پر موزوں تھے ۔ خدا نے انہیں دلِ گداختہ عطا کیا تھا ۔ اس لئے کلام میں تاثیر تھی ۔ اس کے علاوہ موسیقی میں انہیں مہارت کلی تھی ۔ اور یہ واقفیت انہیں بحروں اور الفاظ کے انتخاب میں کار آمد ہوتی ۔ ان کے الفاظ اور خیالات ایسے ہوتے تھے ۔ جنہیں عوام الناس بھی سمجھ سکتے تھے ۔ اور ان کی بہترین غزلیں ایسی ہیں جن سے خواص ہی نہیں بلکہ عوام بھی لطف اندوز ہوتے ہیں ؎

برخلاف اس کے مومن کہتے ہیں ؎

ہمت ترقی دیں کی سوئیں ہے مومن کو   زیادہ ہوئیگا کیا اس سے لے مثال تو ہے!

مومن کو مولا نے زبردست دل و دماغ دیا تھا اور ان کا اُردو شاعری میں بہت بلند
مرتبہ ہے لیکن سخت افسوس ہے کہ انہوں نے اپنی تیز نقادانہ نگاہ بیشتر دُوسروں کے
عیوب و اسقام ڈھونڈنے کے لئے وقف رکھی۔ اس سے اپنی اصلاح میں پوری مدد نہ لی
نتیجہ یہ ہے کہ ان کی بھی ترقی رُکی رہی اور شاعرانہ عروج و ارتقا کے جو مدارج غالب کے کلام
میں ہیں مومن کے ہاں معدوم ہیں۔

خسرو۔ فیضی۔ اقبال۔ غالب

مرزا غالب ہندوستان کے فارسی شعرا کے قائل نہ تھے وہ ہندوستانی شعرا
میں فقط امیر خسرو کو پورا شاعر سمجھتے تھے اور فیضی کی نسبت کہتے تھے کہ اس کی بھی کبھی
ٹھیک نکل جاتی ہے مرزا کا یہ بیان بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے عرفی نظیری
اور صائب کا تتبع کیا اور ان شعرا کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گذرا لیکن معلوم ہوتا
ہے کہ چونکہ یہ شعرا ہندوستان میں پیدا نہ ہوئے تھے مرزا انہیں ہندوستان کے شاعر
نہ گنتے تھے ان شعرا میں مرزا غالب سب سے زیادہ عرفی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔
وہی زور کلام وہی رفعت تخیل وہی اپچ اور جدت پسندی اور وہی معنی یاب طبیعت
لیکن یہ صحیح ہے کہ عرفی کی جوانمرگی نے اسے تکمیل فن کا موقع نہیں دیا۔ اور اس کی
شاعری میں وہ حکیمانہ سکون اور رسوخ ابھی نہیں آئی۔ جو مرزا کے بعد کے کلام کا مابہ الامتیاز

اور باتوں سے قطع نظر غالبؔ اور مومنؔ میں ایک بیّن فرق اس طرزِ عمل میں ہے۔ جو دونوں کا اپنی شاعری کے متعلق تھا۔ غالبؔ اور مومنؔ دونوں فنِ شعر گوئی میں اپنے برابر کسی نہ سمجھتے تھے۔ لیکن مرزا نے اس جذبے سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کی اصلاح و تہذیب ترک نہیں کر دی اُن کی تمام ادبی زندگی ترقی و اصلاح کی مُسلسل داستان ہے۔ ان کا شروع کا کلام ادق اور غیر شاعرانہ تھا۔ اور بالآخر انہوں نے اس میں جو صفائی اور دلآویزی پیدا کر دی۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ یہ عظیم الشان قلب ماہیت جس کی ادبیات میں بہت کم مثالیں ملیں گی صرف اس لئے ہو سکی۔ کہ مرزا تمام عمر اپنے خیالات اور طرزِ شعر گوئی کی اصلاح میں کوشاں رہے جب کسی نکتہ چیں نے ان کی کوئی غلطی انہیں سمجھائی۔ تو انہوں نے سلامت روی سے اسے تسلیم کر لیا اور اصلاح کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ وہ بطورِ خود تمام مفید ادبی تحریکوں اور قابلِ تقلید ادبی شخصیتوں کے کلام سے واقف رہ کر ان کی خوبیاں اخذ کرنے میں کوشاں رہے۔ اخیر عمر میں قاآنی کا کلام ان تک پہنچا۔ اور انہوں نے اس کی خوش آہنگی کی تقلید کئی غزلوں میں کی۔ ادبی اور اصلاحی تحریکوں میں اُن کی دلچسپی مرتے دم تک باقی رہی۔ اخیر عمر کے ایک خط میں نواب علاء الدین کو لکھتے ہیں:۔ "مزا تو جب آئے گا۔ کہ تم دلی آؤ۔ اور اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامۂ انجمن کا حال بیان کرو۔"

اپنی شعر گوئی کے متعلق مرزا کا جو طرزِ عمل تھا۔ اس کا بہترین بیان ان کے اپنے ایک شعر میں ہے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یا ؏   نغز گفتن نغز تر پابد شنفت

یا ؏   ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہم ان خصوصیتوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو مومن اور غالب میں مشترک تھیں اب ایک دو
ے اوصاف کا ذکر باقی ہے جو کلام غالب کو ممتاز کرتے ہیں لیکن مومن کے اشعار میں عنقا
ن میں سے ایک قابل ذکر چیز ظرافت ہے۔ جو دیوان مومن میں قطعاً نہیں اس کے علاوہ
ردو گو شعرا کے اشعار جو دیوان غالب میں کثرت سے ہیں غزلیات مومن میں بہت تھوڑے
یں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مومن کی مثنویوں میں ان کی قسمت معاصرانہ تذکرے
ی اسباب ہیں کہ وہ مومن کی اپنی آپ بیتی ہیں ۔ ایسے دلخراش واقعات کی کوئی کمی نہیں لیکن
رل کو انہوں نے بیشتر مضمون آفرینی اور صنعت نگاری کے لئے وقف رکھا اسے غالب یا
میر کی طرح داستان دل کہنے کا ذریعہ نہیں بنایا ۔

مذکورہ بالا دو کوتاہیوں کے علاوہ کلام مومن میں کئی فنی عیوب بھی ہیں۔ رعایت لفظی
کی تو ان کے اشعار میں بھرمار ہے ؎

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے　　آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
ہو کے یوسف جو دل چراتے ہو　　کون ہو جائے گا غلام مرا
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا　　لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم　　کیا جانے کسے جلائیں گے ہم

معلوم ہوتا ہے کہ مومن نے غالب کی طرح اپنے کلام پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی
اُن کی بہترین غزلوں میں اس طرح کے شعر آ جاتے ہیں ؎

کہا ہیں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی　　تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور ان کی کئی غزلیں اور متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جن میں نازک خیالی اور دقت پسندی نام کو نہیں یہ اُردو ادب کی بدقسمتی تھی۔ کہ مومن نے چیستاں گوئی اور مضمون آفرینی کو کمالِ شاعری سمجھا۔ ورنہ جو معنی یاب طبیعت اور "دلِ گداختہ" انہیں ازل سے ملا تھا اگر وہ اسے پرانے مضامین میں پیچ دے کر نئے پہلو نکالنے کی بجائے اپنی جودتِ طبع کے لئے نئے میدان تلاش کرنے یا غزل میں اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لئے صرف کرتے۔ تو اُردو ادب پر ان کا بڑا احسان ہوتا۔ اب بھی اُن کے کئی اشعار ہیں۔ جن کا جواب صرف دیوانِ غالب میں ملیگا ؎

کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کرینگے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے

پھر بہار آئی وُہی دشت نوردی ہوگی — پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے
سنگ اور ہاتھ وہی، وہ ہی سر و داغِ جنوں — وہ ہی ہم ہونگے وہی دشت و بیاباں ہونگے
عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مُسلماں ہونگے

خاک میں وہ تپش نہیں خار میں وہ خلش نہیں — کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوشِ جنوں بہار میں

مومن کی بہترین غزل ایسی ہے۔ جس میں ان کے اپنے رنگ کی ایک بات نہیں۔ نہ ہی فارسیت۔ نہ ہی مضمون آفرینی اور نازک خیالی لیکن یہ غزل اُردو کی بہترین غزلوں میں شامل ہونے کے قابل ہے ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھا بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ رُوٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بعض جگہ ایک ہی طرح کا کمپیرِن (Mannerism) استعمال کرتے ہیں مثلاً محذوبات کے دونوں عادی ہیں اور دونوں کے کئی اشعار میں کسی واقعہ یا حالت کا بیان کرتے ہوئے کئی ایسے اجزا چھوڑ دئے گئے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے دماغ پر زور دینا پڑتا ہے غالب کا مشہور شعر ہے ؎

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس قبیل کے اشعار کلیاتِ مومن میں کئی ہیں ؎

اے کاش مدد کو عسرت آئے میں منتظر اپنی موت کا ہوں
راز نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہنچا کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

ہم لکھ چکے ہیں کہ نازک خیالی اور دقتِ پسندی کے غالب اور مومن دونوں دلدادہ ہیں لیکن مومن اس معاملے میں بڑا غلو کرتے تھے ان کے ایسے اشعار تھوڑے ہیں جن میں یہ رنگ نمایاں نہیں برخلاف اس کے غالب ہمیشہ اسی سراب میں سرگرداں رہے

(العید و صفحہ ۹۴)
شعر و شاعری کی زبان کو عام بول چال کی زبان سے ایک مختلف چیز بنایا تھا اور اگر وہ زبان کو اس رستے پہ ڈال دیتا تو اسے ہندی سے بہت دور لے جانے والا تھا غالب کے شاگرد حالی نے اس روش کے خلاف قدم اٹھایا اور میر و مصحفی کی صاف زبان اور سادہ و عام فہم مضامین کی تقلید کی لیکن اس کا اثر دیرپا نہ ہوا اور غالب کی مقبولیت اور اقبال اور دوسرے ممتاز شعرا کے اثر کی وجہ سے آج جو زبان اردو شاعری میں بالعموم رائج ہے وہ بول چال کی زبان سے بالکل مختلف ہے ۔

غالب اور مومن دونوں دلدادہ تھے۔ اور پرانے مضامین کے لئے نئے اسلوبِ بیان اختراع کرنے میں دونوں بڑا زورِ دماغ صرف کرتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دونوں

(بقیہ از صفحہ گذشتہ)
و نظر بہ آں ابیات در اعدادِ شعرا نہ شاید بس تمرد۔ اما بہ رعایت اسباب منتخب قطع نظر کردہ شد"۔

شیفتہ کی جو رائے نظیر کے متعلق تھی۔ قریب قریب وہی غالب کی تھی۔ اس کا ذکر تو ہم نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا لیکن نواب سر امیر الدین احمد خاں صاحب مرحوم سابق والئے لوہارو نے راقم السطور سے اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا۔ جس سے مرزا کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ ایک دفعہ انکی والدہ صاحبہ نے مرزا غالب کو کہلا بھیجا۔ کہ مرزا صاحب آپ میرے بیٹے امیر الدین کو کوئی اچھا منتخب شعر یاد کرا دیں تاکہ وہ اسے پڑھتا پھرے اور اس پر عمل کرے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے مجھے ذیل کا شعر یاد کرنے کیلئے لکھ دیا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!

نواب صاحب فرماتے تھے۔ کہ میں یہ شعر پڑھتا پڑھتا اپنے والد نواب علاء الدین خاں کے پاس چلا گیا۔ اور انہیں جاکر سارا واقعہ سُنایا۔ انہوں نے یہ شعر سُنکر مجھے کہا۔ کہ تم مرزا صاحب کو جاکر میرا یہ پیام دینا۔ کہ مرزا صاحب! آپ نے چھوٹے سے بچے کو یہ معرفت کا شعر کیا یاد کرایا۔ اسے وہ کیا سمجھے گا۔ اسے تو کوئی آسان شعر یاد کرانا چاہیئے۔ امیر الدین صاحب نے یہ پیام مرزا غالب تک پہنچایا۔ وہ اسے سُن کر کہنے لگے۔ کہ تمہارا باپ اچھے شعر کیا سمجھیگا۔ اُسے نظیر کے شعر سُنانے چاہئیں۔ جاؤ انہیں وہ قطعہ یاد کرکے سُناؤ۔ جسکا آخری مصرعہ ہے

مصرع: روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر[۱]

مومن۔ غالب اور ان کے ساتھیوں اور نظیر کے درمیان جو بُعد المشرقین تھا۔ وہ تو ظاہر ہے لیکن شاہ نصیر اور ذوق کے ساتھ بھی انہیں اسی طرح کا اختلاف تھا۔ جبکہ متروکات کو چھوڑ کر شاہ نصیر اور ذوق وہی زبان استعمال کرتے تھے۔ جو میر اور سودا کی تھی مومن اور غالب ناسخ کے پیرو تھے جس نے

[۱] جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ نواب صاحب نے یہی مصرع دُہرایا تھا۔ لیکن شاید یہ مشہور مصرع نظیر کا نہیں۔

خصوصیتیں تو ایسی ہیں جو دونوں میں مشترک تھیں لیکن ان کے علاوہ کئی مشترک خصوصیتیں ایسی ہیں جو ایک میں زیادہ تھیں اور دوسرے میں کم مثلاً نازک خیالی اور دقت پسندی

(صفحہ کے آگے)
صفحات میں ذکر آ چکا ہے لیکن افسوس صدی کے ادبی تحقیقات مکمل کرنے کے لئے گلستان سخن کی وجہ تصنیف بتانا ضروری ہے یہ کتاب نظیر کے ایک شاگرد نے گلشن بیخار کے جواب میں لکھی مصنف نے کتاب کی وجہ تصنیف دیباچہ میں یہ بتائی ہے کہ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں سوائے نواب اور دو ایک دیگر شعرا (مثلاً غالب مومن صدرالدین آزردہ عبدالصمد غلام علی خاں وحشت) کے اور کسی شاعر کا اچھی طرح ذکر نہیں کیا اور بادی النظر نظیر اکبرآبادی کے ساتھ خاص طور پر بے انصافی کی ہے اس غلطی کی تلافی کے لئے مصنف (مرزا قطب الدین باطن) نے گلستان سخن لکھی جس میں شیفتہ، غالب، آزردہ اور مومن کی خوب ہنسی اڑائی ہے۔ اور نظیر کی بڑی تعریف کی ہے

گلستان سخن کے مضامین سے ہمیں بحث نہیں لیکن مصنف کے اپنے بیان سے بھی اس عداوت و حسد کا اندازہ ہو جائے گا جو مومن، غالب اور ان کے احباب کو نظیر سے تھا ہمارا اپنا خیال ہے کہ شیفتہ نے نظیر سے پوری طرح انصاف نہیں کیا شیفتہ نے اردو کے بہترین نقاد عملی کی تربیت کی اور اردو شعرا کے قدیم تذکروں میں بہترین تذکرہ لکھا ہے اس لئے ہر شاعر کے بارے میں ان کی رائے بڑے احترام کی مستحق ہے لیکن کئی باتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ نظیر کی شاعری پوری طرح نہیں سمجھ سکتے تھے نظیر طبقہ عوام کا ترجمان تھا اس کے خیالات عام بلکہ عامیانہ نظموں کے موضوع عام پسند اور زبان عام فہم بلکہ بازاری، شیفتہ ایک نواب طبع مرزا کے ممدوح رنگین تھے، دوسرے مومن کے شاگرد انہیں نظیر کے اشعار کس طرح پسند آتے حالی لکھتا ہے۔ "بے تکلفی اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے چنانچہ شیفتہ نے نظیر کے متعلق لکھا اشعار بسیار دارد کہ بر زبان سوقیہ جاری است"

(باقی صفحہ پر)

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن | جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا
کہتے تھے ہم نہ دیکھیے سناہیں تجھ کو غیر پاس | رہتے ہزار دکھائے سو ناچار دیکھنا
نگر ہو آباد جس کے دل کا نہ پوچھ اس سے تو دکھ ہمارا | یہ درد سن اس کی بہت ٹک جو لٹتے دیکھیے دیار اپنا
ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک | کیا جانیے پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک
گُل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی | اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی
فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں | دو دن کی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے

غالب کی طرح سودا کے کلام میں شوخ نگاری بہت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اسے انہوں نے ہجو نگاری کے لیے وقف رکھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ سودا کی زبان پرانی اور متروکات سے پُر ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی میر اور غالب کے اشعار سودا کے اشعار سے بہتر ہیں غالب میں سودا کی خوبیاں سبھی تھیں، عیب کوئی نہ تھا لیکن میر کی نسبت سودا سے انکی طبیعت زیادہ ملتی تھی۔ اور جب کلیاتِ سودا پر کوئی نقاد نئے سرے سے نظر ڈالیگا۔ تو اُسے اُس طبعی ہم آہنگی کا صحیح اندازہ ہوگا۔ جو اُردو شاعری کے ان دو جلیل القدر "میرزاؤں" میں تھی ؛

غالب اور مومن

میر کے علاوہ ایک اور اُردو شاعر جس سے غالب کا موازنہ اکثر کیا جاتا ہے۔ مومن اور غالب میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں کو خدا نے شاندار دل و دماغ دیے تھے۔ دونوں میں خود پسندی بہت تھی۔ دونوں ناسخ کے مداح اور مقلد تھے۔ اور دونوں کی زبان میں فارسیت اور تصنع کا عنصر نمایاں ہے۔ دونوں معنی آفرینی اور خیال بندی کے شیدا تھے۔ دونوں زبان اور مضمون میں اونچے طبقے کے ترجمان اور شاہ نصیر اور ذوق کے مقبول عام اشعار اور نظیر اکبر آبادی کے پسندِ "سوقیین"[1] کلام کے مخالف تھے۔ یہ

[1] گلشن بیخار مؤلفہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ گلشنِ بیخار اور گلستانِ بے خزاں کا سرسری طور پر گدستہ

(باقی آیندہ پرچہ)

مقبولیت کا ایک بڑا سبب بہی اشعار ہیں۔

سودا اور غالب | غالب اور میر کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ اگرچہ دونوں کی زندگی اور کلام میں غم کا عنصر نمایاں تھا لیکن دونوں کی شخصیت اور طبیعت میں بڑا فرق تھا۔ شخصی رجحانات کے نقطۂ نظر سے مرزا غالب میر کی نسبت سودا سے زیادہ مشابہ تھے سودا کے کلام پر آج کل اس کی صحیح شاعرانہ عظمت کے لحاظ سے خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی لیکن ایک زمانے میں اُسے بعض اہل الرائے میر سے بہتر سمجھتے تھے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

بزعم بعضے آنکہ سرآمد شعرا' فصاحت آما' مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بہ سے (یعنی) سعیدہ ساماتی آنست کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا نائب سکیاں و میر بہرے است عظیم الشاں در معلومات قواعد میر را بر مرزا برتری است و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری"

میر کے مقابلے میں سودا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر ایک صنف شاعری پر قدرت رکھتا تھا۔ اور میر نے محض غزل گوئی (اور کسی حد تک مثنوی نگاری) میں کمال حاصل کیا تھا۔ مصطفٰے خان شیفتہ سودا کی نسبت لکھتے ہیں "بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدۂ و قصیدۂ اش بہ از غزل" سودا کی نسبت 'آب حیات' کے اندراجات سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ سودا کے کلام میں واہ "کے سوا کچھ نہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ سودا کے کلام میں سوز بھرے اشعار کئی ہیں اور چونکہ اس میں میر کی طرح بے تحاشا گریہ و زاری نہیں، بلکہ ایک طرح کے ضبط اور وقار سے درد دل بیان کیا ہے۔ ان شعروں میں خاص ہی لطف ہے ؎

ہیں بھی اس کی شخصی مایوسیوں کو دخل ہے۔ لیکن اسکے بہترین اشعار وہ ہیں۔ جن ہیں وہ اپنی ناکامیوں سے گزر کر نوع انسان کی فطری اور بنیادی کوتاہیوں پر آنسو بہاتا ہے ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے راہنما کرے کوئی

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

گر منافق وصل ناخوش ور موافق ہجر تلخ — دیدہ داغم کہ در روئے دوستاں دیدن نداشت!

مندرجہ بالا اشعار غالب کی اُس خصوصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ جو اسے میر بلکہ اقبال کے سوا دوسرے تمام اُردو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ عام غزل گو شعرا خیال آفرینی اور تلاش مضامین میں اس طرح محو رہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے اشعار کو اپنی باطنی کیفیتوں کا آئینہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے لیکن جو شعرا میر کی طرح اس نقص سے بری ہیں۔ اور جن کے اشعار وارداتِ قلب کا بیان ہیں۔ اُن کی نظر بھی انسانی زندگی کی ان بنیادی الجھنوں اور پیچیدگیوں پر نہیں جاتی جن کا سامنا کم و بیش ہر ذکی الحس انسان کو کرنا پڑتا ہے۔ اس بارے میں غالب تمام قدیم اُردو شعرا سے ممتاز ہے۔ اس کے اشعار میں فقط اُس کی ذاتی مصائب اور الجھنوں کا ہی ذکر نہیں بلکہ ان الجھنوں کو حل کرنے کی کوشش میں وہ انسانی فطرت کے ان پیچیدہ مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ جو دوامی اور عام ہیں۔ اور جن کے بیان نے اس کے کلام کی وقعت اور اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔ اس قبیل کے زیادہ اشعار مرزا کے فارسی کلام میں ملیں گے لیکن اُردو میں بھی ان کی تعداد کم نہیں۔ اور طبقۂ خواص میں دیوانِ غالب کی غیر معمولی

گلوں کی دھجّیں کے علاوہ شراب و شاہد سے مرزا کو جو محبت تھی اس کے زیرِ اثر انہیں یہ
جہاں حسن کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے ؎

جہاں اور مادہ و شاہد عالم ماسکہ بیداری　　　دنیا اور بس آدم ورستا و مد میلیو دا

میر کے اشعار سے بالعموم یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے غم کا معاملہ کرنے یا زندگی
کے تاریک پہلو کے علاوہ کوئی دوسرا پہلو دیکھنے کی بھی کوئی کوشش کی ہو بعض اشعار سے
تو خیال ہوتا ہے۔ کہ انہیں غم سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ غم و حزن میں مبتلا رہنے
اور جلنے کڑھنے سے ان کی ایک طرح کی تسکین ہوتی تھی اس طرح کے تو شعر کئی ہیں جن میں
اپنی آہ و زاری پر فخر کیا ہے ؎

اور محرم دل بھی ہم نے تھے دلے　　　میر سا ہو سکے ہے کب کوئی
ہمیشہ رو رو کر عاشق کوئی ہر رنج کرتا　　　عزا جاری کیا دل کے مرے ماتم نے دنیا کو
جب نالہ کش ہوا وہ تب مجلس زلائیں　　　تھا میر دل شکستہ یا کوئی نوحہ گر تھا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں　　　جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مندرجہ بالا اشعار سے صرف ایک سقیم (Morbid) ذہنی حالت کا اظہار نہیں بلکہ
فنی نقطۂ نظر سے بھی ان میں کوئی خوبی نہیں۔ غالب کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کے اشعار
میں غم و حزن کا عنصر بہت نمایاں ہے لیکن اس غم و حزن کے اظہار میں بھی ایک طرح کا وقار
اور ضبط ہے اس کے علاوہ غالب اور میر کے غم میں ایک دوسرا نمایاں فرق بھی ہے میر کی
گریہ و زاری کا باعث اس کی ذاتی مصائب اور نا ساعد حالات ہیں غالب کے غم و حزن

یہ صحیح ہے کہ خیام کی زندگی غموں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی تھی لیکن غم والم انسان
کی ہمت اور شخصی عظمت کا امتحان بھی ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان ان غموں کے آگے
ہتھیار ڈال دے۔ غم والم دوسرے انسانوں اور دوسرے نوع کے تجربوں کی طرح آتے ہیں۔ بلکہ
وہ بالعموم غم کی تندی کم کرنے کے ذریعے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بعضوں کو مذہب یا مراقبہ وقتی
سے نجات دے دیتا ہے۔ حافظ اور خیام نے ایک فلسفۂ زندگی کی مدد سے تسکین قلب کا
سامان بہم پہنچایا۔ اقبال تو خیر ایک ایسے عالم میں رہتے ہیں جہاں غموں کا گزر بھی مشکل سے
ہوتا ہے۔ لیکن مرزا غالب کی زندگی میں مایوسیوں اور ناکامیوں کو بہت
دخل تھا۔ اور ان کا اظہار ان کے اشعار میں بھی پوری طرح ہوا ہے لیکن ان کی بلند ہمتی
نے غم کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ زندگی میں انہوں نے سکون کو پایا تو اسے خوش طبعی اور حکیمانہ
ظرافت کی مدد سے حاصل کیا۔ جو غم یا کسی دوسرے جذبے کو مناسب حدود سے آگے نہیں
بڑھنے دیتی۔ اور کچھ اس فلسفیانہ بالغ نظری سے جس کے سامنے نہ صرف ان کی اپنی
بلکہ تمام انسانوں کی مایوسیاں اور کوتاہیاں بے نقاب تھیں۔ اس کے علاوہ وہ حسن
محض کے شیدائی تھے۔ اور جب وہ اس کے نشے سے پوری طرح سرشار ہوتے۔ تو
ان پہ ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی جس میں اپنی ناکامیوں یا دنیائے رنگ و بو کی
کوتاہیوں کا خیال نہ آتا۔ ایک ایسے ہی لمحے کا بیان ہے ؎

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے — روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے!
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے — طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے!

ایک فارسی شعر ہے ؎

مثال از سرو سایۂ عیش کن کہ بادِ نوروزی — بہ گلشن جلوۂ رنگینیِ عہدِ شبابستے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

جہاں تک غالب اور میر کا تعلق ہے۔ اگر پاکیزگیٔ زبان اور سوز وگداز کو کمالِ شاعری سمجھا جائے تو میر کو غالب پر فوقیت ہے۔ غالب کی زبان میں وہ صفائی نہیں جو میر کی غزلوں میں ہے اور جو سوز وگداز میر کے اشعار میں عام ہے وہ بھی غالب کو میسر نہیں ان دونوں باتوں میں میر کا مرتبہ غالب سے بالا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں کی شاعری کے دوسرے اہم پہلو بھی ہیں جنہیں مدنظر رکھنے سے غالب کی عظمت اور فوقیت دلنشین ہوتی ہے۔

میر کے کلام میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ یہ بدرجۂ غایت ناہموار ہے۔ میر کے جو اشعار اچھے ہیں وہ بہت اچھے ہیں لیکن پست اور کم پایہ اشعار کی تعداد زیادہ ہے غالب بڑی حد تک اس نقص سے بری ہے سوائے ان اشعار کے جو اس نے سن بائیس برس کی عمر تک لکھے اور جن میں ایک خاص طرزِ شاعری کی پیروی تھی، اس کے بیشتر اشعار ہموار اور بلند پایہ ہیں۔

زندگی میر اور غالب کی نظروں میں

میر کی شاعری میں دوسرا نقص یہ ہے کہ زندگی کی جو تصویر انہوں نے اپنی شاعری میں پیش کی وہ بڑی تاریک اور یکطرفہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جو کچھ انہیں پیش آیا اُسے انہوں نے اپنے تخیل اور زورِ کلام سے چمکا کر نظم کر دیا لیکن ان کے حالات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں بدقسمتی سے فقط زندگی کا تاریک پہلو ہی دیکھنا نصیب ہوا اور انہوں نے اسی تاریک پہلو کو ہی زندگی کی مکمل تصویر سمجھ لیا۔

کلام اسی سوز و گداز، رنج و مایوسی کی صحیح تصویر ہے ؎

میں کون ہوں اے ہم نفساں؟ سوختہ جاں ہوں
اِک آگ مرے دِل میں ہے، جو شعلہ فشاں ہوں
ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اِس باغ خزاں دیدہ میں میں برگِ خزاں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دِل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو! اس وقت خدا جانے کہاں ہوں!

اور ؎

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی — اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی
آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے — دردمندی میں گئی ساری جوانی اُس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دئے لوگوں کو — شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی

میر کے اشعار اُن کے دل کے مرثیے ہیں۔ ان میں وہی سوز اور درد ہے جو شاعر کے اپنے دل کی گہرائیوں میں تھا۔ اور چونکہ یہ اشعار سُنی سُنائی باتوں کا اظہار نہیں۔ قلبی واردات کا بیان ہیں۔ پڑھنے والے کے دل پر بھی وہ گہرا اثر کرتے ہیں ؎

اِک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے، کچھ درد سا دل میں ہوتا ہے
میں راتوں کو رویا کرتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دِل نے آخر کام تمام کیا

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے
سمبد ماریر اک اور تار مار ہوا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر مذہب عشق اختیار کیا
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا

جس طرح ان کی زبان صاف اور سلیس ہے اسی طرح تشبیہیں سادہ اور سریع الفہم ہیں سہ کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے اسکی آنکھوں کی نیم خوابی سے

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی ان لبوں کی کیا کہیئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے دل ہے گویا چراغ مفلس کا

میر کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب تو زبان اور بیان کی دلآویز پاکیزگی ہے لیکن سادگی سے بھی زیادہ جس چیز نے اُن کے کلام کو مقبول خاص و عام بنا دیا۔ وہ ان کا خلوص ہے ان کی شاعری واردات قلب کا بیان ہے کسی خاص طرز شاعری کا تجربہ نہیں ان کے اشعار دل سے نکلے ہیں اس لئے دل میں اتر کرتے ہیں۔ ہم ذکر میر اور آب حیات کے ذریعے میر کی ذاتی زندگی سے پوری طرح آشنا ہیں لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کلیاتِ میر شاعر کی خود نوشت مسلم سوانح حیات نہیں؟؟

میر کو فطرت سے ایک حساس دل ملا تھا۔ اور حساس انسانوں کے لئے دنیا ایک جائے امتحان ہے میر کو بھی رنج و مایوسی اور سوز و گداز کے سوا کچھ نہ ملا اور ان کا

زمانے میں میرؔ کو اپنا مدِ مقابل بھی نہ سمجھتے تھے سہ

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کے متعلق مرزا کی رائے خواہ کیا ہو۔ (اور یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ انہوں نے میرؔ سے زیادہ کسی اُردو شاعر کی تعریف نہیں کی) لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ ایک بڑا بلند پایہ شاعر اور اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی ادبی روایات کا کامیاب ترجمان تھا۔ میرؔ نے شعرگوئی اس زمانے میں شروع کی۔ جب ابھی اُردو میں بھاشا کا عنصر غالب تھا۔ اور ناسخؔ کے زیر اثر زبان میں فارسیت اور تصنع کا بہت دخل نہ ہُوا تھا۔ میرؔ جن خیالات اور جذبات کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے لئے یہ زبان خاص طور پر موزوں تھی۔ اس کے علاوہ میرؔ کی طبیعت کا جو رنگ تھا۔ وہ اس دورِ انحطاط میں عام تھا۔ اس لئے میرؔ کے شعروں کو فوری مقبولیت حاصل ہُوئی۔ لیکن میرؔ کی یہ شہرت عارضی نہ تھی۔ میرؔ کی شاعری میں کئی ایسے عنصر ہیں۔ جن کی وجہ سے جب تک اُردو زبان باقی ہے، میرؔ کا کلام پڑھا اور پسند کیا جائیگا۔

میرؔ کی شاعری

میرؔ کی مقبولیت کا ایک بڑا اسباب ان کا سہل ممتنع طرزِ اظہار ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف شستہ اور درحقیقت اُس زمانے کے طبقۂ شرفا کی عام بول چال کی زبان ہے۔ جس قدر سلیس اور پاکیزہ زبان میں انہوں نے شعرگوئی کی ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے سوا شائد ہی کسی غزل گو شاعر کو نصیب ہُوئی ہو۔ ایسی سیدھی سیدھی ترکیبیں ہیں۔ کہ نثر اور نظم میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام مقبولِ خاص و عام ہے۔ اور ان کے کئی اشعار ضرب الامثال کے طور پر مشہور ہو گئے ہیں۔ مثلاً سہ

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

میر کی برتری ثابت کی ہے۔ ان مضامین میں تبصرہ نگاروں نے جن غزلوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے ان میں میر کا پلہ ضرور غالب سے بھاری رہا ہے لیکن ان غزلوں کی بنا پر غالب کے عام رتبۂ شاعری کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ میر کی جن غزلوں پر غالب نے غزلیں لکھیں وہ میر کی بہترین غزلیں ہیں لیکن غالب کی اپنی غزلیں ایام طفلی کی مشق کا نمونہ ہیں۔ اور شاعر کے اس کلام کا جزو ہیں جسے اُس نے اشاعت کے قابل نہ سمجھا۔ اور منتخب دیوان مرتب کرتے وقت نظر انداز کر دیا۔ اب اگر ان ہم طرح غزلوں کی بنا پر میر اور غالب کی تمام شاعری کی نسبت فیصلہ کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کو حقیقت اور واقعات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

دو شاعروں کا صحیح طور پر مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی اہم خصوصیات بیان کی جائیں اور ان خصوصیات کی خوبیاں اور کوتاہیاں واضح کر کے ان سے شعرا کے ادبی مدارج کا اندازہ لگایا جائے۔ غالب کے کلام کا اگر اس نقطۂ نظر سے میر اور دوسرے اُردو شعرا کے کلام سے مقابلہ کیا جائے تو صرف اس سے غالب کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ دوسرے شعرا کی خوبیاں اور خامیاں بھی ذہن نشین ہوتی ہیں۔

میر اور غالب

جہاں تک میر کا تعلق ہے، مرزا نے دو اشعار میں ان کی نسبت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پہلا شعر اس زمانے کا ہے جب میر سے عقیدت انتہا پر تھی ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ   آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

دوسرا شعر اس سے پچیس تیس برس بعد کا ہے اور اس میں شاعرانہ تعلّی اور شوخی نے رنگ عقیدت پر بہت سے دبیز پردے ڈال دئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس

اسی طرح مرزا کے کئی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ روزِ جزا یا جسمانی عذاب و اجر کے قائل نہ تھے۔ مثنوی ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا رباعی جہاں کہیں انہوں نے بہشت کا ذکر کیا ہے۔ ہمیشہ شوخی بلکہ تمسخر ہی سے کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح دورِ عباسیہ کے کئی مسلمان حکما یا سر سید احمد خاں نعیم جسمانی کے قائل نہ تھے۔ اسی طرح مرزا کی رائے بھی اس معاملے میں عام مسلمانوں سے مختلف تھی۔

غالب اور مشاہیر اردو شعرا کا مقابلہ

شعرا کا باہمی موازنہ کرنا اردو تبصرہ نگاروں کا محبوب مشغلہ ہے۔ عموماً اس مقصد کے لئے شعرائے ہمعصر کی ہم طرح غزلوں یا متحد المضامین اشعار کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اور ان کی بنا پر کسی ایک شاعر کی فوقیت ثابت کی جاتی ہے۔ اردو میں یہ طریقِ تنقید بہت پرانا ہے اور حالی اور شبلی نے اسے کثرت سے اختیار کیا لیکن فی الواقع اس طریقے سے صحیح طور پر شاعرانہ فوقیت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اس طرح شاعر کی خاص ذاتی خصوصیتوں پر، جنہیں نمایاں کرنا تبصرہ نگار کا اصل کام ہے۔ کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ نہ ہی بہ حیثیت مجموعی اس کا کلام پرکھا جاتا ہے۔ بلکہ ایک غزل یا چند اشعار کی بنا پر اس کی تمام شاعری کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جو کبھی اتفاق سے صحیح ہو تو ہو۔ لیکن عام طور پر اس کے صحیح ہونے کا بہت کم امکان ہے۔

اس طرزِ تنقید کی ایک دلچسپ مثال مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے وہ مضامین ہیں۔ جن میں انھوں نے غالب اور میر کی ہم طرح غزلوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اور ان کی بنا پر

و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہے خدا کے بعد نبی، نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق
والسلام والاکرام علی علی کیا کرو اور فارغ البال رہا کرو۔"

انھوں نے ایک دوسری بحثوں میں حصہ لیا لیکن ان میں بھی مذہبی اختلافات اور فقہی موشگافیوں کو ناپسند کیا چنانچہ خدا کے علاوہ کسی اور کو مخاطب کرنے کے متعلق مقلدوں اور غیر مقلدوں میں جو مشہور اختلاف ہے مرزا اس کو بھی غیر ضروری اور بیہودہ سمجھتے تھے ؎

ابلہاں را بر انکہ دانش با ہما است
گفتگو ہا بر سر حرف ندا است

ایک اور شعر میں شیعہ سنی اختلافات کی نسبت کہا ہے ؎

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوے کاندراں   کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

عقیدتاً مرزا اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس کے علاوہ وہ "وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیاء" کے "دل سے معتقد اور زبان سے معترف تھے" لیکن ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی تمام ان کے دل پر پوری طرح چپتی نہ تھی ؎

زمہر دوست شناسم بہشت و معمورہ ام   بہار من ہمی و طریق من عربی است

تمام مغلوں میں ایک طرح کی "ایپکیورزم" پائی جاتی ہے وہ بیشتر "عیش امروز" کے قائل ہوتے ہیں اور "فردا" کا فکر انھیں اس طرح مضطرب نہیں رکھتا جس طرح سامی نسل کے لوگوں کو۔ مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے اور "عیش امروز" کے وہ بھی اسی طرح قائل تھے جس طرح بابر یا جہانگیر اور جس طرح مغلیہ سلطنت کے بانی نے کہا تھا ؏

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مختلف مذاہب کے ماننے والوں سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہاں تک کہ غالب ہندو مذہب کے پیشواؤں سے
ان کے ہمدرد اور عیسائی دوستوں سے بے تکلفانہ تعلقات کا بہت ثبوت ملتے ہیں۔ وہ تو اس قدر
تھے کہ وسیع خیالی کے اس ... سے ... نہیں ... خود مرزا
... آداب رسوم کے کبھی مائل نہیں رہے ... خیال رکھتے تھے۔
وہ مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی
گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں۔
اُس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اُس کے مراتب و مدارج ہیں۔"

مرزا مذہب کی قدر تو ضرور کرتے تھے۔ لیکن مذاہب کے جزوی اختلافات اور فقہ
کی پیچیدگیوں کو بیکار سمجھتے تھے۔ لیکن سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آج کل لوگ قانون کی موشگافیوں
سے خوب واقف ہیں لیکن فقہ کی باریکیاں کچھ اس سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں
عیسائی مفکروں کے نزدیک فرشتوں کا حجم ایک اہم مسئلہ تھا۔ اور ان کے درمیان اکثر اس
سوال پر بحثیں ہوتی تھیں کہ ایک تلوار کی نوک پر یک وقت کتنے فرشتے کھڑے ہو سکتے ہیں
لیکن مرزا کی سلیم الطبعی کو یہ خیالی قلابازیاں پسند نہ تھیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مروجہ
تعلیم فقہ اور "مسائل ابوحنیفہ" کے خلاف بہت چلتے ہوئے فقرے لکھے ہیں۔ اُن کے خیال میں
انسان کو چاہیئے کہ مذہب کی اصولی باتوں کو سمجھ لے اور ان پر ایمان رکھے۔ فقہ اور مذہب
کی جزوی باتوں میں وقت ضائع کرنا بے فائدہ ہے۔ یہ وقت دل و دماغ کی تربیت میں صرف
ہونا چاہیئے۔ میر مہدی کے نام ایک خط لکھا ہے۔ جس میں میر سرفراز حسین کو تلقین کرتے ہیں :-
"میاں کس قصّے میں پھنسا ہے۔ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیئت و منطق

ایک اور نیرہ معنی شعر ہے سے

سر رہیں مسلط ہے آئینہ سدی گوہر　　　دگر یہ بحر میں ہر قطرہ چشم پرنم ہے

"شرع" اور "حق" کے تعلق کو مرزا نے ایک فارسی شعر میں نہایت لطیف پیرائے میں نظم کیا ہے سے

شرع آو سر و حق میحو محول کم ہر نامہ سے　　　کہ دل ناممل است آنارمان نا سازماں دارد

اسی طرح صوفیہ کرام میں ایک مصرع مشہور ہے کہ

با خدا دیوانہ و با مصطفےٰ ہشیار باش!

یعنی خالق اور مخلوق کا تعلق تو انسان کے اپنے متعلق ہے لیکن نبی کریم ایک جماعت کے سردار ہیں اس لیے ان کا ذکر کرتے ہوئے اس جماعت کے اصول و آئین ملحوظ رہنے چاہئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اس اصول سے سر مو تجاوز نہیں کیا۔ خدا کا ذکر انہوں نے اپنی غزلوں میں جس آزادی اور بے باکی سے کیا ہے اس کی مثال ہندوستانی شاعری میں کہیں نہیں ملتی لیکن پیغمبر صلعم کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ادب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا[1] اور اگرچہ خدا کے متعلق ان کے کئی اشعار ایسے ہیں جنہیں ظاہر الاقناعیں کفر کے کلمات سمجھا جائیگا لیکن جہاں کہیں انہوں نے رسول اکرم کا ذکر کیا ہے اس میں پورا ادب و احترام ملحوظ رکھا ہے۔ مرزا کی اس پاسداری یعنی آزاد خیالی اور حفظ مراتب کی ایک دلچسپ مثال

[1] اس کی ایک دلچسپ مثال ملک کا اردو دیباچہ ہے جو انہوں نے سراج المعرفت کے شروع میں لکھا اور جس میں انہوں نے شیخ ابن العربی کے غیر شرعی مقولہ "الولایت افضل من النبوت" کی اس طرح تاویل کی ہے کہ اس سے کسی بے ادبی کا اظہار نہیں ہوتا۔

بہت دلچسپ ہے۔ مشرقی شعرا بالعموم مذہب کے معاملے میں آزاد خیال رہے ہیں۔ اور دارالافتا کی تنگ نظری اور سختی کی تلافی حافظ۔ عمرخیام اور فیضی کی روشن خیالی اور وسیع مشربی سے ہوتی رہی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے۔ مرزا بھی مذہب کے معاملے میں بے حد آزاد خیال تھے۔ لیکن انتہائی آزاد خیالی کے باوجود اُن میں ابونواس اور سرمد کی بے قاعدگی نہ تھی۔ وہ انسان کی ذہنی اور روحانی نشوونما پر کسی طرح کی پابندیاں عائد کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن وہ اس لطیف نکتے سے بھی بے خبر نہ تھے۔ کہ یہ نشوونما بہترین طور پر اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کسی نظام اور آئین کے ماتحت ہو مثلاً عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ شریعت اور طریقت کے راستے جدا جدا ہیں۔ لیکن مرزا جانتے تھے۔ کہ حقیقتاً ان دونوں میں کوئی اصولی اختلاف نہیں۔ طریقت کا تعلق انسان کے تزکیۂ نفس اور اس کی ذاتی روحانی تربیت سے ہوتا ہے۔ اور شرع اس کے افعال کو اجتماعی یعنی سوسائٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اور انسان کی پوری نشوونما کے لئے شخصی اور اجتماعی دونوں پہلو بہت اہم ہیں۔ چنانچہ مرزا خود طریقت سے قریب تر ہونے کے باوجود شریعت کی اہمیت سے بھی غافل نہ تھے۔ ایک قصیدے میں رسولِ اکرمؐ کی تعریف میں لکھا ہے ع

حرز لبِ سایۂ شریعت زفتنۂ زنہاری

وہ طبعاً ہمسفر اور رہنما سے آزاد ہو کر آزادانہ تلاشِ حق کے قائل تھے۔ لیکن جانتے تھے۔ کہ "راہ و رسم منزلہا" سے واقفیت نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے ؎

عناں گسیختہ بیراہہ تاختن تا چند
بہ شرع پیچم و گردم بپویہ ہنجاری

مرزا غالب کا مذہب

ایک اور دلچسپ مسئلہ مرزا کا مذہب ہے ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے۔ کہ انہیں مذہب سے دلچسپی عوام سے زیادہ رہی ہے مہر نیمروز (جس کے شروع میں ابتدائے آفرینش وغیرہ کے متعلق ہندو عقائد کا خلاصہ درج ہے) اور بعض اشعار (مثلاً متحد دیرش) سے ہندو مذہب کے عقائد کے متعلق مرزا کی جو غیر معمولی واقفیت ظاہر ہوتی ہے وہ شائد اس زمانے میں بھی بہت کم مسلمانوں کو ہوگی "دلستاں مذاہب" اکثر انکے زیر مطالعہ رہتی تھی اور پارسیوں کی مذہبی کتب مثلاً دساتیر سے اُن کی ذاتی واقفیت تھی۔ ممکن ہے کہ مذاہب عالم سے مرزا کی یہ دلچسپی ہر مرد کی تعلیم کا اثر ہو۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہیں یہ دلچسپی ضرور تھی اور اس مسئلے کے متعلق ان کے کئی نہایت پاکیزہ اشعار ہیں جو کسی تادیہ یمیالی سے زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا   واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

ما من بیا دیرائے پدر در بد آزر راگہ   ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

دلم در کعبہ از تنگی گرفت آوارہ خواہم   کہ ما من وسعت تنجانہ ہائے ہند وچیں گوید

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را   باشد کہ دگر تبکدہ سازند حرم را

اس کے علاوہ ہندو دی عقائد سے قطع نظر عام مذہب کے متعلق مرزا کا نقطۂ نظر

ایک کونے میں بیٹھا ہُوا نیرنگِ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں"۔ میر مہدی حسین مجروح نے انہیں کسی خط میں صبر و تسلیم کا مشورہ دیا تھا۔ مرزا کو یہ مشورہ بُرا معلوم ہُوا۔ کیونکہ وہ اپنے تئیں شیوۂ تسلیم و رضا کا بہترین ترجمان سمجھتے تھے۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں:۔

"میری جان! تو کیا کہہ رہا ہے۔ بنئے سے سیانا 'سو دیوانا۔ صبر و تسلیم' توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون سمجھے گا' جو تم مجھ کو سمجھاتے ہو؟"

اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے۔ "چپکے ہو رہو۔ اور مجھ کو کسی عالم میں غمگین و مضطر گمان نہ کرو۔ ہر وقت میں جیسا مناسب ہوتا ہے عمل میں آتا ہے"۔ ایک خط میں نواب ضیاء الدین کے صاحبزادے' مرزا شہاب الدین احمد خان کو لکھتے ہیں (فروری ۱۸۵۸ء) "صبر کرو۔ اور چپ ہو رہو

بر دلِ نفسِ اندہ گیتی بسر آرید گیر ید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد"

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ایک غزل گو شاعر کے کلام میں اس کا پیغام اسی طرح ساری و پریشاں ہوتا ہے۔ جس طرح ایک پھول کے نواح میں اس کی خوشبو۔ اس کی تعیین بہت مشکل ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی زندگی کے متعلق مرزا کے نقطۂ نظر کا بہترین اظہار شائد اُن فارسی اشعار میں ہے۔ جنہیں ہم نے "زندگی" کے عنوان سے منتخب کیا ہے ؎

تو نالی از خلۂ خار و تنگری کہ سپہر سرِ حسینؑ علیؓ بر سناں بگرداند

بر و بشادی و اندوہِ دل منہ کہ قضا چو قرعہ بر نمطِ امتحاں بگرداند

یزید را بہ بساطِ خلیفہ بنشاند

کلیم را بہ لباسِ شباں بگرداند!

تو جس کسی نے دیکھی ہے لیکن مرزا نے اپنی آنکھوں سے دہلی کا سارا نظام روزِ حشر کی طرح
تہ و بالا ہوتے دیکھا تھا اور ان مصیبتوں سے دوچار ہوئے تھے جنہیں قیامتِ صغریٰ
کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں مرزا کے خطوط میں ان مصائب کی بڑی پُر اثر روداد
بطریقِ حکایت درج ہے اور وہ ان سے بڑے متاثر ہوئے لیکن بالآخر ان کی حکیمانہ طبیعت
ان کے غم و الم پر غالب آئی انہوں نے زندگی کی تیرہ و تار حقیقتوں کو عریاں دیکھا تھا لیکن
اب وہ ان سے بے قرار نہ ہوتے اور ایک راضی برضا عارف کی طرح نیرنگیِ قدرت کا تماشا دیکھتے

؎ بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و رُوئے دریا آتش است

تفتہ کے نام انہوں نے جو تسلی و تسکین کے خطوط لکھے ہیں وہ ان کے اس زمانے کے
خیالات کا آئینہ ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی کئی خطوط ہیں جن میں تسلیم و رضا کا سبق ملتا
ہے ایک خط میں صاحبِ عالم کو لکھتے ہیں:-

پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا جو کچھ بھی ہوا
چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے۔ اس کا گلہ کیا ؎

چوں جنبشِ سپہر بفرمانِ داور است — بیداد بود آنچہ بما آسماں دہد

نہ تحریرِ طریقِ حکایت ہے نہ بسبیلِ شکایت"

ایک اور خط میں مفتی صدرالدین کو مشورہ دیتے ہیں "قضا و قدر پر چھوڑ دو نیرنگیِ قدرت کے
تماشائی رہو" اسی اصول پر مرزا کا اپنا عمل تھا غدر کے بعد جو حالات بدل گئے تھے
ان کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں:- "نہ وہ حکام ہیں۔ جن کو میں جانتا تھا نہ وہ عملہ ہے
جس سے میری ملاقات تھی نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے

دوران میں لکھے۔ تو وہ عارفانہ رنگ جو مرزا پر دورِ آخریں غالب آ گیا تھا۔ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایک مضمون میں مرزا کی اردو شاعری کے متعلق لکھا تھا۔

"لیکن ان کے کلام کی اصلی خوبیاں اور محاسن ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوئے ...

غالب مغلیہ سلطنت اور اسکے آئین کی مکمل تباہی سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور اسی تاثر نے ان کی شاعری پر دلگدازی اور رقت کا وہ رنگ چڑھا دیا۔ جو اس میں جدت و طلاقت پیدا کر دیتا ہے"۔[۱]

ہمیں معلوم نہیں۔ کہ مولوی صاحب نے مرزا کے کس اردو کلام کی نسبت یہ رائے قائم کی ہے۔ کیونکہ غدر کے بعد مرزا نے معدودے چند اردو غزلیں لکھی ہیں۔ اور ان میں "دلگدازی اور رقت" کے بجائے شوخی اور تفنن طبع کا رنگ زیادہ نمایاں ہے ؎

کیوں نہ فردوس میں دوزخ میں ملا لیں یا رب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ — ہیں ہوس پیشہ بہت 'وہ نہ ہوا' اور سہی

حسن میں حور سے بڑھکر نہیں ہونے کے کبھی — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

اردوئے معلےٰ میں فقط ایک اردو قطعہ البتہ ہے۔ جو اس زمانے میں لکھا گیا جب مارشل لا کی پابندیاں ابھی قائم تھیں۔ اور مرزا نے اس قطعہ اور ایک اردو شعر میں ان پابندیوں کا تذکرہ رنج و افسوس سے کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ نو دس اشعار کی بنا پر جو ایک خاص واقعہ کے متعلق ہوں۔ ایک دور کی عام شاعری کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ غدر اور مابعد الغدر کی مصیبتوں سے مرزا پر جو رنگ غالب آیا۔ وہ بے قراری اور بے چینی کا نہ تھا۔ بلکہ سکون و قرار کا تھا۔ مرزا نے "قلزمِ خوں میں شناوری" کی تھی قیامتِ حقیقی

[۱] سالنامہ کارواں لاہور ۱۹۳۴ء صہ ۳۵

تک لائے ہی سے کی حالت واقعہ سخت ہے اور حال عزیز

جس سال کے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہ ترک دنیا پر آمادہ ہوئے تو مرزا نے ایک خط لکھا جس میں انسانی فطرت کی ان مجبوریوں کا ذکر کرکے اُن کو نہایت صاف مشورہ دیا ہے لکھتے ہیں :-

"کیوں ترک لباس کہتے ہو پہننے کو تمہارے پاس کیا ہے جس کو اتار کر پھینکو گے ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائیگی۔ بغیر کھائے پیئے گذارا نہ ہوگا سعی و کوشش درنج و الم کو ہموار کردو جس طرح ہو اُسی صورت بہر صورت گذرے دو"

ایک اور خط میں انہوں نے خود اس عملی رواقیت (stoicism) کی مثال قائم کی ہے مرزا تفتہ کو لکھا ہے :-

"مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مردہ ہوں نہ زندہ جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں روٹی روز کھاتا ہوں شراب گاہ پیے جاتا ہوں جب موت آئیگی مر رہوں گا نہ شکر ہے نہ شکایت جو تقریر ہے بسبیل حکایت"

اس طرح کے اور لمحات مرزا کے اردو خطوط میں کثرت سے ہیں ان خطوط کا اکثر حصہ غدر کے بعد لکھا گیا اور ان میں وہ مصائب جو مرزا یا ان کے عزیز دوستوں اور عام طور پر اہل دلی کو برداشت کرنی پڑی بیاں ہوئی ہیں لیکن قاعدہ ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ان خطوط میں غم و الم کا بیاں ہونے کے باوجود، سکون و صبر اور رضا و تسلیم کا اظہار کثرت سے ہے بلکہ اگر غالب کے ان خطوط کا ان اشعار سے مقابلہ کریں جو مرزا نے سن کے

تھا۔ لیکن رسمی طور پر قسمت کو الزام قرار دے کر نہیں۔ بلکہ اس نگاہِ ژرف بیں کی مدد سے جو اُنکی
اپنی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تو دوسروں کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اُس سے پنہاں نہ تھیں
انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ زمانے کے ترکش میں ہزاروں تیر ہیں۔ ایک سے ایک زہریلا
اور ان سے کوئی محفوظ نہیں۔ تو طبیعت میں ایک طرح کا سکون آجاتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار
میں اس خیال کا اظہار ہے ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر　　حضرت بھی کل کہینگے کہ ہم کیا کیا کئے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی　　وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں　　عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

علاوہ ازیں مرزا نے زندگی کے انقلاب دیکھے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ اگر خوشی
محدود اور قلیل الفرصت ہے۔ تو غم بھی غیر محدود یا غیر فانی نہیں ؎

بیا کہ نیست ثباتے بدیں نشاط و ملال　　بیا کہ نیست دوامے بدیں بیاض و سواد

شادی و غم ہمہ سرگشتہ تر از یکدگر اند　　روزِ روشن بہ وداعِ شبِ تار آمد و رفت

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند　　ہم خزاں ہم بہار در گزر است

اس کے علاوہ انسانی فطرت ہی کچھ اس طرح پابند اور مجبور واقع ہوئی ہے کہ غم کی
باگ بہت ڈھیلی نہیں چھوڑی جا سکتی ؎

شاہا اگر ز درد بہ عالم نہ دیں نمط   اندوہ چیکو بہ ار دل مضطر بر آورم
بے پائے آنکہ از سر راحت تواں گذشت   بے جائے آنکہ چادر بستر بر آورم

اس کے علاوہ ہمیں مرزا کی مردانگی کی داد دینی چاہئے کہ اگرچہ اشعار میں خود ان کے جذبات کا آئینہ ہیں مایوسی اور بے اطمینانی صاف ٹپک پڑتی ہے[۱] لیکن عملی زندگی میں انہوں نے غم کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور میر تقی میر کی طرح ترمردگی اور غم کو خوش طبعی اور زندہ دلی پر غالب نہیں آنے دیا؎

پیرم مگر بہ طبع جواناں گراں نیم
خوں خوردم ہمچو مے خوردن آشکار

خرافیاتِ غالب

انسان جب کسی چیز کی خواہش کرتا ہے اور اسے نہیں پاتا تو اس کی مایوسی قدرتی امر ہے خواہ یہ ناکامی خواہشات کی فراوانی سے ہو یا نامساعد تعلقات سے لیکن زندگی میں مسلسل اضطراب لیے جی نہیں سکتی عام طور پر مایوس اور ناکام لوگ اپنی ناکامیوں کو قضا و قدر کے سر پر ڈال کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مقدر کا قصور ہے مرزا کی غمزدہ طبیعت نے بھی ایک طرح کا سکون اور توازن حاصل کر لیا

[۱] مرزا اپنے "آسودہ دل" معاندوں سے کہتے ہیں؎

آسودہ دلاں چوں نشنوید آہ و فغانم   دانند کہ من مردم رنج و الم را
غافل کہ ہم از نعمت حق بہرہ کسانے است   فریاد گزار است نہاد است ہمم را
غم نیست علاج من و خو سازی آں رحم   بر خیم نہاد است مروں دل ناکام را
در شرع وجود حصہ گدایانہ خروشست   پیش آمدہ مقصود سہی حرف و رقم را

جس کا نتیجہ ناکامی اور بدنامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ تیس برس کی عمر میں بھائی کی دیوانگی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ جب ذرا سنبھلنے کی فرصت ملی، تو کوئی دس برس کے بعد پچاس سال کی عمر میں قمار بازی کے جرم میں جیل جانا پڑا۔ بادشاہ کے استاد ہوئے تو دو ہی سال میں

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جب مرزا کو ان نامساعد حالات سے سابقہ پڑا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کے اشعار میں غم کا عنصر غالب ہے۔ لیکن غم کی کئی قسمیں ہیں۔ اور ان میں بہت فرق ہے۔ ایک غم جوانی کا ہے جیسے [illegible] جو کہ اس کے گرد و نواح کی دنیا ہی بدل دیتا ہے۔ دوسرا غم میر تقی میر کا غم ہے۔ جو ذاتی بے چینی اور باطنی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ وہ جس میں حساس اور زود رنج انسان کو غم سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے کہ اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو وہ اور بے چین ہوتا ہے۔ غالب کا غم نہ جوانی کا غم ہے۔ جس پر دنیا کی سب خوشیاں نثار ہونی چاہئیں۔ اور نہ میر تقی میر کا غم جو اگر مستقل طور پر رہے تو ایک طرح کی دماغی بیماری ہے۔ غالب کا غم ایک صحت مند آدمی کا حزن و ملال ہے۔ جسے دنیا کی اچھی چیزوں سے محبت ہے لیکن جب وہ مسلسل سعی کے باوجود انہیں حاصل نہیں کرسکتا۔ تو غمگین ہو جاتا ہے۔ غالب کے اشعار میں حزن و افسردگی کی شدت ہے لیکن غالب کی افسردگی عام قنوطیوں کی طرح دنیا کی مذمت کے باعث نہیں۔ بلکہ دنیا کی دلفریب چیزوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔ غالب کی انتہائی مایوسی میں بھی ترک دنیا۔ رہبانیت یا مردم بیزاری کا شائبہ تک نہیں۔ بلکہ یہ حزن و افسردگی اس آدمی کی ہے۔ جو زندگی کی قدر و قیمت پہچانتا ہے۔ اور جسے اس سے محروم رہنا ناگوار ہے۔ وہ خود ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

حقیقت یہ ہے کہ مرزا ئی لے اندارہ خواہشوں اور ارمانوں سے بھرا ہوا دل لئے تھے جس کا پورا ہونا بہت مشکل تھا۔

مامرادم دارد اں اور دلِ خواہش سدہر آب ندیں لستہ اند آنکہ راستسقائے من

اس کے علاوہ کئی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب ان کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں اور مایوسی اور بے اطمینانی کا علاج کامیابی اور کامرانی سے نہیں ہوتا تو جس طرح شراب پینے والے بیمار اور اعصابی سکی کو دور کرنے کے لئے اور شراب پی لیتے ہیں اسی طرح وہ بھی اپنی خواہشوں کو اور بڑھا کر عارضی تسکین کا سامان کر لیتے ہیں بقول غالب ؎

ہر چہ از سرمایہ کاست در ہوس افزودہ ایم

یا

بساط خاطرِ مفلس رکیمیا طلبی است

لیکن جب خواہشیں اور امیدیں اس قدر بڑھ جاتیں تو بے اطمینانی بھی لازمی ہے۔ اور خواہشیں اور آرزوئیں جس قدر زیادہ ہوں گی مایوسی کے مواقع بھی اسی کثرت سے ہوں گے۔

ہر گوشہ جستے کہ ز ایام مے کشیم   دُردِ پیالۂ امید کردہ است ا

یہی وجہ ہے کہ مرزا کے کئی اشعار میں مایوسی اور افسردگی کا رنگ غالب ہے اسکے علاوہ یہ بھی درست ہے کہ اگرچہ مرزا کی زندگی کسی لحاظ سے ناکام نہیں رہی لیکن ان کی قسمت میں مصائب کا حصہ بھی بہت تھا وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے وفات پائی۔ پانچ برس کے ہوئے تو چچا بھی مر گئے۔ اس کے بعد وہ نے شک عیش و عشرت میں پلے لیکن اس حد درجہ عیش و عشرت کا خمیارہ بہت بھگتنا پڑا۔ قرضخواہوں کے پیچھے سے انہیں عمر بھر نجات نہ ملی زندگی کے بہترین سال دیوانی مقدمے کی تگ و دو میں گزرے۔

اِن کے علاوہ غالب کی افتادِ طبع اور اس کی شخصیت کے متعلق بھی کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اور چونکہ علامہ اقبال کے کلام کی وجہ سے اس وقت، رجائی اور قنوطی نسخوں کا اختلاف ملک کے سامنے بہت نمایاں ہے۔ اس لئے غالب کے متعلق بھی چند مضامین اس موضوع پر شائع ہوئے ہیں۔ کہ خواہ غالب کسی خاص سکول کا فلسفی نہ ہو۔ آخر اس کی طبیعت میں رجائی یا قنوطی، کونسا رنگ غالب تھا۔ مولینا نیاز فتح پوری نے ایک طویل مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب نے کوئی فلسفہ پیش کیا۔ تو وہ فلسفہ تفاؤل و مسرت تھا۔ لیکن جمہور بالعموم اس امر پر متفق ہیں کہ غالب کے اشعار میں غم و حزن کی جھلک مسرت و اطمینان سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ کلام غالب میں کئی جگہ تو غم کا بیان بیشتر خیال آرائی اور زور طبع یا تخیل کی شوخی دکھانے کا ذریعہ ہے۔ مثلاً ؎

ہفت آسماں بگردش و ما در میانِ او　　　غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ　　　جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

دانم کہ دوختند زمیں را بہ آسماں　　　آں گونہ دادہ اند مرا در میاں فشار

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا　　　وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

لیکن غالب کا تمام کلام پڑھنے کے بعد دل پر جو اثر باقی رہتا ہے۔ وہ کسی حد تک اُس مایوسی اور افسردگی کا ہے، جس کا اظہار انہوں نے خود ایک شعر میں کیا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوتا ہے ۔ اس کا تمیل شاعر کی دنیائے تخیل سے بہرہ مند ہوتا ہے اور جس طرح یونانی ٹریجیڈی میں ہیرو کے کارہائے نمایاں دیکھ اور دنیائے تمیل میں اُسی کی طرح محسوس کرتے ہوئے ہم بھی ایک لطف طریقے سے ہیرو کی خصوصیات سے بہرہ مند ہوتے ہیں ، اسی طرح ایک شاعر کے مطالعے سے اس کی شخصیت اور اُس کے تخیل کا رنگ ہم پر چڑھ جاتا ہے اور اگر یہ مطالعہ مسلسل اور گہرا ہو تو یہ اثر بھی دیرپا ہوتا ہے ۔ بالکل اسی طریقے سے کلام غالب کے مطالعہ سے ہم پر غالب کی عظیم شخصیت کا پرتو پڑتا ہے اور اگرچہ یہ اثر اس طرح واضح اور نمایاں نہیں جس طرح دلائل و براہین سے عقائد کا بدلنا لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں تخیل اور روح کی یہ تربیت ، عقائد کی شعوری تبدیلیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے ۔ اور شاعری کی یہی پیمبرانہ خصوصیت ہے جس کی طرف غالب نے خود اشارہ کیا ہے ؎

اگرچہ شاعراں نغز گفتار ۔۔۔ زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں ۔۔۔ خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار این قوم ۔۔۔ ورائے شاعری چیزے دگر ہست [1]

حریاتِ غالب

ہم لکھ چکے ہیں کہ غالب کو فلسفی ثابت کرنے کے متعلق آج تک جو کوششیں ہوئی ہیں وہ اکثر ناکام رہی ہیں

---

[1] یہ ایک لطف نفسیاتی حقیقت ہے جسے علم نفسیات کے ماہر آج ہم پر ظاہر کر رہے ہیں لیکن قدیم شعرا اور صوفیائے کرام کے کلام میں اس کی طرف کئی اشارے ہیں ۔ مولانا جامی کہتے ہیں ؎

اگر در دل تو گل گذرد گل باشی ۔۔۔ در بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و حق کل است گر روزے چند ۔۔۔ اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

ایسی صورت میں اگر تخیل کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تو اس فلسفۂ عمل سے ایک ذہنی کشمکش کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور بقول "حکیم الامت" ع

برقے کہ بر خود پیچید میرد بہ سحاب اندر

ہم یہ تسلیم کرتے کہ ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کا معیار انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے لیکن اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے معین فلسفوں کو تو نہیں چھوا لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور روح کی نشوونما کا ایسا سامان چھوڑا ہے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ شیکسپیئر اور غالب دونوں اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں نے زندگی کے کسی ایک پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کیونکہ ایک پہلو پر زیادہ زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں۔ لیکن یہ صرف ظاہر بیں ہی کہیں گے۔ کہ انہوں نے انسانی زندگی کو متاثر نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی معین فلسفہ دنیا کے لئے یادگار نہیں چھوڑا لیکن انسانی تخیل کی صحیح تربیت اور انسانی فطرت کے ارتقا کے لئے ان کا کلام اسی طرح مفید ہے جس طرح ایک عظیم اور بلند مرتبہ شخصیت کا فیضِ صحبت!

ایک بڑا شاعر خود ایک عظیم الشان شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اپنے کلام سے جو اس کی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں کا اظہار ہے۔ اپنی شخصیت کا اثر ناظرین کے دل و دماغ پر ڈالتا ہے۔ اور نہایت لطیف طریقے سے ناظرین کی تخیلی زندگی بھی اسی رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ جو شاعر کے تخیل میں نمایاں

صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں جب تک تخیل کی
نشوونما اور روح کی تربیت اسی شعوری فلسفی تک نہ ہوئی ہو ایک فلسفہ پرست شاعر جو انسانی
فطرت کا بھی صحیح شناس ہوتا ہے اس لطیف نکتے سے بے خبر نہیں کہ انسانی زندگی کے ارتقائی
دور میں انسان کے عقائد اور اس کے تخیل میں اکثر ایک عجیب سا تضاد ہوتا ہے۔ اور اگر
فلسفۂ زندگی اور پیغام سے ایک شخص کے عقائد بدل دئے جائیں لیکن اس کی دنیائے تخیل
یا نفس غیر شعور اسی طرح رہے۔ تو یہ تضاد اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سے انسانی فطرت ان
منزلوں تک نہیں پہنچتی۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے بہترین شاعری مفید ہو سکتی ہے۔ وہ
ایک شراب خور کو دیکھتا ہے جسے میخواری کے نقائص سمجھا دئے گئے ہیں اور جو اسے ترک کرنا
چاہتا ہے وہ اس بات کا قائل ہو گیا ہے کہ شراب خوری بُری عادت ہے۔ لیکن اُٹھتے بیٹھتے
سوتے جاگتے' اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک شراب خور ہی کے خیالات موجزن رہتے
ہیں۔ وہ پرہیزگاری کا فلسفہ خوب سمجھتا ہے لیکن اس کی دُنیائے تخیل ایک شراب خور کی ہے
انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس حالت میں شراب خوری کے خلاف
جس قدر دلیلیں اس کے سامنے پیش کی جائیں گی ان سے اس کی باطنی کشمکش میں اضافہ
تو ہوگا لیکن جب تک اس کی دنیائے تخیل ہی کو نہ بدلا جائے گا یا زمانے کا سرد گرم چکھنے سے
اس کے عقائد اور احساسات میں ایک طرح کا توازن نہ آ جائے گا۔ وہ اس گڑھے سے باہر نہیں
نکل سکے گا اسی طرح ممکن ہے کہ ایک آدمی فلسفۂ عمل کا بہت معتقد ہو۔ صبح شام
اسرارِ خودی اور درسِ حیات کی تلاوت کرتا رہتا ہو لیکن جب عمل کا وقت آئے تو تخیل
اس کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کی مخالفت کرے اور اس کے ذہن کی گہرائیوں سے فقط ایسے
احساسات اور خیالات پیدا ہوں جن سے عمل غیر ضروری بلکہ مضر معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ

کہ جب تک وہ اقبال کی طرح اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی خاص کوشش نہ کرے ۔ یا
حافظ کی طرح ہمیشہ ایک ہی نشے میں مست نہ رہے ۔ اس کے کلام میں چند خیالات کی تکرار
کے بجائے مختلف النوع خیالات کا ہجوم ہوتا ہے ۔ چنانچہ غالب کے فلسفے کے متعلق کوئی بھی
نظریہ قائم جائے ۔ اس کی تردید کے لئے غالب کے کلام سے بیسیوں اشعار مل جائیں گے
غزل کی اس خصوصیت کے علاوہ مرزا کا دل ایک ایسا جامِ جہاں نما ہے جس میں ایک ہی
نقش ہمیشہ نظر نہیں آتا ۔ بلکہ اس میں فطرت کے تمام نقوش باری باری سے نمایاں ہیں ۔
ان کا کلام ایک آئینہ ہے ۔ جس میں فطرت کے تمام عکس اس طرح نظر آرہے ہیں کہ ایک
تصویر سے دوسری تصویر مختلف ہے ۔ یہ ممکن ہے ۔ کہ چند نقوش پر پردہ ڈالنے اور ایک
آدھ کو زیادہ نمایاں کرنے سے ایک تصویر بنائی جاسکے ۔ جیسے خوش فہم حضرات غالب کا
فلسفۂ زندگی یا اس کا شاعرانہ پیغام سمجھ لیں لیکن آخر اس کوشش سے فائدہ ؟ کیا یہ
ضروری ہے کہ ہر شاعر کوئی خاص پیغام یا معین فلسفۂ زندگی چھوڑ جائے ؟ یہ صحیح ہے
کہ بعض حضرات کے نزدیک شاعر کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات
کا نچوڑ رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں اُن کے حوالے کردے ۔ تاکہ وہ انہیں دیواروں
پر لگائیں ۔ اور روزمرہ کی زندگی میں اپنے لئے چراغ راہ بنائیں ۔ ان خوش نصیب لوگوں
کی طبیعتیں سدھائے ہوئے گھوڑوں کی طرح ہیں ۔ جنہیں باگ کے اشارے سے جس
طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں ۔ لیکن عام لوگ اس قدر خوش قسمت نہیں ۔ اور نہ ہی انسانی زندگی
میں کوئی اہم انقلاب اتنی آسانی سے ظہور پذیر ہوسکتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے
کہ شاعر کا کام عقائد کو بدلنا نہیں ۔ بلکہ تخیل کی نشوونما اور تربیت ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی
کے راز جو ذاتی احساسات اور مشاہدات کا عطیہ ہیں اگر ان کا نچوڑ خفائی اور فلسفے کی

غالب کا فلسفہ

کیا غالب ایک فلسفی تھا؟

عشقیہ شاعری کے علاوہ ایک دلچسپ مسئلہ غالب کے فلسفہ کے متعلق ہے غالب کے مداح مصر ہیں کہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا اور اگر فلسفہ سے دقیق اور غور طلب خیالات کا اجتماع مراد لیا جائے تو اس رائے سے بہت کم لوگ اختلاف کریں گے لیکن اگر کسی شاعر کے فلسفے سے اس کا انسانی زندگی یا اس کے کسی اہم پہلو کے متعلق کوئی خاص شخصی نقطۂ نظر مراد ہے تو آج تک یہ دعوے ثبوت کا محتاج رہا ہے مرزا غالب کو قدرت نے گہری نظر عطا کی تھی اور ان کے ابتدائی دور میں بھی غور طلب اشعار کثرت سے ہیں تب اس کے بعد مرزا نے اپنے ذہن رسا کو خیالی طوطا مینا بنانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی دلی کیفیتیں اور حیات انسانی کی کشمکش بیان کرنے کے لئے استعمال کیا تو ان کے اشعار میں فلسفیانہ خیالات کثرت سے آگئے لیکن چونکہ مرزا کا مقصد کسی خاص فلسفہ کی ترجمانی نہ تھا محض دل پر گزری ہوئی کیفیتوں کا اظہار مطلوب تھا اس لئے شاعر کی مزاجی کیفیت کے ساتھ ساتھ ان خیالات کا رنگ بھی بدلتا رہا کبھی ان میں رنج والم کا بیان زیادہ ہوتا اور کبھی تسلیم و رضا کا کبھی ان میں تشکک کے مضامین کثرت سے آتے اور کبھی شوخی اور تعلی طبع کے یہ صحیح ہے کہ اس اختلاف کے باوجود ان اشعار میں مرزا کی شخصیت کے خط و خال نمایاں ہیں لیکن یہ شخصیت جامد نہ تھی حالات کے ساتھ بدلتی اور ترقی کرتی رہی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اظہار مختلف وقتوں میں مختلف صورتوں میں ہوا ہے اور ان سے ایک معین فلسفہ مرتب نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ ایک غزل گو کی شاعری کچھ اس طرح کی ہوتی ہے

And, nursed by day and night, by sun and shower
Doth momently to fresher beauty rise.
To us the leafless autumn is not bare,
Nor winter's rattling boughs lack lusty green.
Our Summer hearts make Summer's fulness where
No leaf or bud, or blossom may be seen!

غزل گو شعرا کے کلام میں تو ایسی محبت کا جو مرض نہ ہو۔ بلکہ "طبیب جملہ علتہائے ما" ہو نشان ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ لیکن مرشد رومی نے اس محبت کا اور اسکی روح پرور ی کا بڑے جوش سے ذکر کیا ہے ؎

از محبت تلخہا شیریں شود　　از محبت مسہا زریں شود
از محبت دُردہا صافی شود　　از محبت دردہا شافی شود
از محبت خارہا گل میشود　　از محبت سرکہ ہا مل میشود
از محبت دار تختے میشود　　از محبت بار بختے میشود!

غالب نے بھی اس محبت کی شاید ایک آدھ جھلک دیکھی تھی ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

لیکن یہ جھلک پائدار ثابت نہ ہوئی۔ اور عشق ان کے اشعار میں ایک "دردِ لا دوا" ہے۔ "درد کی دوا" نہیں!

کی جاسکتی ہے کہ محبت کے سرچشمہ کو گندہ کرکے اور عشق کو مرض اور جنوں کی صورت میں پیش کرکے نے بجائے اس کی بہتر اور برتر صورتیں نظر کے سامنے لائیں تاکہ ایک تو ردگی کی صحیح تصویر پیش ہو۔ اور دوسرے ان کا کلام روح کو پستی کے بجائے بلندی کی طرف مائل کرے انگریزی شعرا نے جن کے دماغ پر حقیقی یا خیالی "ترک شیراز" یا "سیم پیشہ ڈومنیاں" مسلط نہیں اس محبت کی جو سراسیمگی اور پژمردگی کے عالم میں بھی جاں پروری کرتی ہے اور روح کو پریشانی اور کشمکش سے بچاتی ہے کی تصویریں کھینچی ہیں سولھویں صدی کے ایک قدیم انگریز شاعر کی ایک نظم ہے:۔

Love – a fulfilment

Love is life's end (an end but never ending)
All joys, all sweets, all happiness awarding
Love's life wealth (ne'er spent but ever spending),
More rich by giving, taking by discarding,
Love's life's reward, rewarded by rewarding,
Then from thy wretched heart fond care remove,
Ah, should thou live but once love's sweets to prove,
Thou wilt not love to live unless thou live to love

زمانہ حال کی ایک انگریزی نظم میں یہ اظہار شاید اس سے بھی بہتر ہوا ہے:۔

Our love is not a fading, earthly flower,
Its winged seed dropped down from Paradise,

محبت کی یہ صورت ہے۔ جس میں کشمکش۔ بے چینی اور یاس وحرماں نہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ اس میں زندگی کی مصیبتوں اور تکلیفوں کے لئے تریاق موجود ہے۔ یہ ایک "بادۂ طہور" کا جام ہے جس میں نہ غم محتسب ہے نہ "بیم زوال"۔ اس کے شیریں اور لطیف نشے سے سرشار ہو کر انسان دنیاوی کلفتوں اور ان غموں کو جو ہماری دنیاوی زندگی کا جزو ہیں بھول جاتا ہے۔ جب دو روحوں میں اس طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ دونوں کی سب سے بڑی دلی خواہش ایک دوسرے کو دکھ اور تکلیف میں "تسلی" اور "ڈھارس" دینی اور ایک دوسرے کی بہتری اور برتری کی کوشش ہوتی ہے۔ اور جب دونوں کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ اس کے سامنے دنیا کی کلفتیں اور دنیا کے عیش بے حقیقت اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں۔ تو اس محبت سے شیریں تر چیز دنیا میں کوئی نہیں۔ دولت یا طاقت یا علم یا جسمانی عیاشی وہ سکون اور تسکین نہیں بہم پہنچا سکتے۔ جو اس محبت میں حاصل ہوتا ہے۔ محبت کے اس باغ میں کوئی کانٹا نہیں۔ اس میں کشمکش اور بے چینی اور یاس وحرماں کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ محبت کی یہ صورت حاصل ہی تبھی ہوتی ہے جب اس کا تصادم نہ اخلاق سے ہو نہ مذہب سے۔ نہ انسان کے اپنے خیر و فلاح سے نہ سوسائٹی کے قائم کردہ نظام سے۔ حقیقتاً ایسی محبت کا حصول انسان کی اپنی روحانی اور اخلاقی بلندی کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ حاصل ہو جائے۔ تو پھر یہ حالت ہوتی ہے ؏

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا!

یا

بارضائے تو زناسازیٔ ایام چہ بیم   باوفائے تو زبے مہریٔ افلاک چہ باک

ظاہر ہے۔ کہ یہ محبت ہر کہ ومہ کو حاصل نہیں ہو جاتی۔ لیکن شعرا سے شاید یہ توقع ضرور

جنسی اساس سے بحث کرنا نہیں چاہتے جس کے زیرِ اثر محبت کی یہ دو صورتیں ہندوستان اور ایران میں مقبول ہو گئیں۔ لیکن یہ بڑی بدقسمتی ہوگی اگر محبت کی اس تصویر سے متاثر ہو کر ہم زندگی کی زیادہ خوشگوار اور برتر حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیں اور محبت کو سوائے "مرض اور جنون" کے کچھ نہ سمجھیں۔

یاس کا ایک شعر ہے ؎

منزل کی فکر کیا ہے جب تو ہو اور میں ہوں ۔۔۔ پیچھے مڑ کے دیکھئے کعبہ ہی کیوں نہ ہو

یاس نے تو شاید یہ خیال قافیہ کی کوشش سے نظم کیا تھا اقبال نے ایک پوری نظم میں عشق و محبت کے اس پہلو کی مفصل تصویر کھینچی ہے ؎

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر ۔۔۔ نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل ۔۔۔ چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم ۔۔۔ موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

تو جو محفل ہے تو ہنگامۂ محفل ہوں میں ۔۔۔ حسن کی برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری ۔۔۔ شامِ غربت ہوں اگر میں تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے ۔۔۔ تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا

ہے مرے باغِ سخن کے لیے تو بادِ بہار ۔۔۔ مرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں ۔۔۔ نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال ۔۔۔ تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال
قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا"

نے بھی بالعموم محبت کا یہی رخ پیش کیا۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ محبت انہی لوگوں کی ہے جن کی نظر کبھی "ستم پیشہ ڈومنی" سے پرے نہیں جاتی۔ محبت کی ان دونوں صورتوں میں یاس و حرماں، کشمکش اور بے معنی تڑپ اور لازمی ہے۔ پہلی صورت سوائے کشمکش کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی کہ قابلِ اعتراض حالتوں میں بھی یہی کیفیت غالب ہے۔ جو نہ کوئی خود ہی سہ سکتا ہے۔ نہ کسی کو بتا سکتا ہے۔ اس مصنوعی محبت میں سوائے خود فریبی کے اور کچھ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جس طرح ایک افیونی افیم کے نشے میں جیتے جی کیا کیا معرکے مار لیتا ہے۔ وہ کیسے کیسے خوشنما خواب دیکھتا ہے۔ اسی طرح بعض شعرا نے اپنی خود فریبی کو اس قدر خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کہ اکثر لوگوں کے نزدیک یہ سرابِ خیال ہی محبت کی آخری منزل ہو گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اس محبت میں روح کی بالیدگی کا کیا سامان ہے۔ اور جب اصولاً یہ محبت فطرت کے بنیادی اصولوں، مذہب اور اخلاق، انسان کی اپنی فلاح و بہبود کے مخالف ہے۔ تو اس میں کشمکش، کرب و بے چینی، مایوسی اور حرماں کے ہزاروں موقع آئیں گے۔ دوسری محبت اس سے بہتر ہے لیکن چونکہ وہ بھی نفسانی خواہشات کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے۔ قرار و سکون اس میں بھی میسر نہیں۔ بلندی و پستی، مستی اور سرگرانی اس کا لازمی جزو ہے۔ اگر آج شاعر اس سے مست ہو کر کہہ لیتا ہے ؎

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

تو کل اس کا ردِ عمل بھی لازمی ہے اور اسی شاعر کو یہ کیف و مستی "برق بخرمن زدن" اور "دیوانگی و جاہلی" سے بہتر نظر نہیں آتی۔ غالب کی محبت اسی قسم کی تھی۔ ہم ان معاشرتی اور

ملل کے کاروبار یہ ہیں جسد ہائے گُل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ایک فارسی مثنوی میں انہوں نے بڑی وضاحت سے اپنے طریق محبت پر تنقید کی ہے اور
اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو یاد کرکے کہا ہے ؎

گریہ ئے حوت کہ ازیں بیش بود — صرف رالداماتی حولستں بود
آتش ہنگامہ سحاں داشتی — داغ معاں شیوہ معاں داشتی
آں ہمہ دیوانگی ودعا ہلی — ویں ہمہ ناکامی ولے حاصلی
آں ہمہ ہیرا ہبروی ہائے تو — ویں ہمہ لے صرفہ دوہائے تو
آں دحسول سرق بحر من ردل — ویں ہمہ دام ہوس تن ردل

مندرجہ بالا اشعار کسی نہایت تلخ لمحے کی یادگار ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جس تلخی اور سرگرانی
کا اظہار ان میں ہے وہ اس نشہ اور شراب خانہ سارے کا لازمی نتیجہ تھی جنہیں غالب نے
محبت کا ماحصل سمجھا۔

محبت کا ملبدتر تخیل ہماری شاعری میں عشق کی ایک ایسی گھناؤنی تصویر کھینچی
گئی ہے اور ہم اس تصویر سے اس حد تک ناوابستہ طور پر
متاثر ہو چکے ہیں) کہ آج عوام کے لئے یہ خیال کرنا بھی مشکل ہے کہ محبت کی ایک ایسی
صورت بھی ہے۔ جس کا ثمر وعالت حرماں نصیبی یاس دکھ درد مصیبت نہیں۔
محبت ہمارے شاعروں کے نزدیک ایک "مرض" ہے۔ "روگ" ہے غم ہے۔ جنون ہے
زہر ہے "مرض عشق" "غم عشق" "سودائے محبت" کی ترکیبیں ہمارے ادب کا
ضروری جزو ہوگئی ہیں ہماری سب سے مقبول مثنوی کا نام "زہر عشق" ہے غالب

ؔ امام حوانی کا عشق ومحبت ؔ مقدمے کی ٹمک دوو

محبت میں مرزا کا یہ دستور العمل تھا۔ تو ہمیں اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیئے۔
کہ انہیں اس میں روحانی صبر و قرار نہیں ملا محبت ان کے نزدیک ایک دل لگی سے زیادہ
نہ تھی۔ یہ ایک ایسی زنجیر نہ تھی۔ جو ایک سے وابستہ کر کے دوسری تمام الجھنوں سے نجات
دے دیتی ہے۔ بلکہ ایک طوق تھا جس سے وہ پہلی فرصت میں گلو خلاصی کرانا چاہتے تھے
یہ کشمکش تھی جس کی وجہ سے انہیں نوازش جاناں کی صورت میں بھی بیزاری رہتی ہے

اسد زندانیٔ تاثیر الفتہائے خوباں ہوں — خم دستِ نوازش بن گیا ہے طوق گردن میں
تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطف بدخویاں — نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے

محبت میں سکون اور قرار اسی صورت میں مل سکتا ہے جب انسان اس جذبہ کو
زندگی کی دوسری اہم طاقتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دے اور اپنی ذہنی کشمکش کو مٹا دے۔
مرزا "پیو کھاؤ مزے اڑاؤ" کے اصول پر عامل تھے۔ اس اصول سے انسان اپنا ذہنی توازن
تو شاید برقرار رکھ سکتا ہے لیکن محبت کی انتہائی بلندیوں تک اس کی رسائی نہیں
ہو سکتی۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ اصول فلسفۂ عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔ ایک شخص جو عقل کے
ترازو سے اسے تولتا ہے۔ اسے اس میں نقصان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ مرزا کے
کئی اشعار ہیں۔ جن سے مایوسی اور بددلی ٹپکتی ہے۔ مثلاً

عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مرزا عشق کی اہمیت سے واقف ہیں۔ لیکن وہ اسے ایک "برق خانہ ویراں ساز" سے زیادہ
نہیں سمجھتے ؎

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

ایک اور شعر میں عشق کی نسبت روائتی مشرقی نقطۂ نظر دہرایا ہے ؎

میند اس کی ہے دماغ اس کا راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں!

اس طرح کے اشعار کئی ہیں ان کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر بجنوری کی رائے کو قبول کرنا مشکل ہے
جس ہوس گیرائی کی انھوں نے مذمت کی ہے مرزا کے نزدیک وہ حدیث محبت کا ایک لازمی
جزو تھا اور حقیقت یہ ہے کہ بعض خیال پرست حضرات جس خالص حسن پرستی کے مداح
ہیں اور جسے ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے نظریۂ محبت کی خصوصیت بیان کیا ہے۔ وہ
غالب کی فہم سے بالاتر (یا فروتر!) تھی یہ مصنوعی حدیث بالعموم ان شعرا کا خاصہ ہے۔ جو
ترک شیرازی کے فدائی ہیں جو ایسی شراب سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں
جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو ملا سکتے ہیں۔ غالب کے فلسفہ محبت میں لاکھ عیب
سہی لیکن وہ ترک شیرازی کی غلامی سے ضرور آزاد تھا!

غالب ترک شیرازی پر مست نہ تھا لیکن اس کی مستی شراب طہور کی وجہ سے
بھی نہ تھی اور شاید یہ ماننا پڑے کہ اسے محبت کی انتہائی منزلوں پر پہنچنے کا موقع نہیں ملا
مرزا کے بعض بیانات سے خیال ہوتا ہے۔ کہ انہیں عشق میں ایک سند سمجھنا چاہیے عاشق صادق
نہیں انھوں نے ایک اردو خط میں لکھا ہے۔

"ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور
نہیں اور ہم مانع فسق و فجور نہیں پیو کھاؤ مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رکھو کہ مصری کی مکھی ہو
شہد کی مکھی نہ ہو سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو
آپ نہ مرے کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجا لاؤ غم نہ کھاؤ اور
اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی"

"کہ مرزا غالب کی معشوقہ ایک عارضی (ارضی؟) عورت ہے۔ ان کا عشق ہوس سفلیہ۔ لذاتِ حسیہ سے پاک ہے۔۔۔ ہوس سفلیہ کیا ہے؟ جب روح گرانی اور قبضہ کی جانب مائل ہوتی ہے۔ تو یہ ہوس پیدا ہوتی ہے۔ ہوس مطلوب کو اپنے پُر شہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے کی تائید میں غالب کا ایک شعر بھی نقل نہیں کیا۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ انہوں نے کن اسباب کی بنا پر یہ رائے قائم کرلی۔ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ یہ رائے مرزا کے شخصی نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ جس خواہش گیرائی کو ڈاکٹر صاحب ہوس سفلیہ کہتے ہیں۔ غالب ہرگز اس سے بری نہ تھا۔ غالب نے اپنی جوانی کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس میں ایک شعر ہے ؎

شوقم جریدہ رقم آرزوئے بوس ذوقم قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار

بنارس کے متعلق جو مثنوی لکھی ہے۔ اس میں اس "خواہش گیرائی" کا اظہار بہت صاف ہے ؎

زرنگیں جلوہ ہا غارتگرِ ہوش بہارِ بستر و نوروزِ آغوش

بہ تن سرمایۂ افزائشِ دل سراپا مژدۂ آسائشِ دل

جس فارسی غزل میں سے ہم طویل اقتباسات دے چکے ہیں۔ اس میں فقط چشم و دل و جان کی ضیافت کی خواہش نہیں بلکہ "تن" کا بھی پورا خیال رکھا ہے ؎

ز چشم و دل بہ تماشا تمتع اندوزیم ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم

گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

اردو دیوان میں ایک حسرت بھرا شعر ہے ؎

اسی رسالے میں ایک بڑی زور دار غزل انہوں نے اُردو میں لکھی جس میں ایسی حسین و جمیل امنگوں کی ایک دلآویز تصویر الفاظ میں پیش کی ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

مرزا کی محبت خالص رسمی ہے ایک صحت مند انسان کی دنیا کی اچھی چیزوں کو حاصل کرنے کی خواہش لیکن کبھی کبھی اس میں فرط جذبات سے کیف و مستی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ یہ رسمی جذبہ ایک سنجیدہ روحانی بن جاتا ہے اس وجدانی کیفیت کی بہترین مثال مرزا کی ایک فارسی غزل ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
ز چشم و دل بہ تماشا تمتع اندوزیم — ز جان و تن بمدارا زیاں بگردانیم
بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم — بکوچہ بر سر راہ پاسباں بگردانیم!

جمال ہمنشیں کے خیال سے مست ہو کر شاعر کہتا ہے ؎

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے بہ رہگذر پاشیم — مے آوریم و قدح در میاں بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم — بکار و بار زنے کارداں بگردانیم
نہیم شرم بیک سو و باہم آویزیم — بشوخیے کہ رخ اختراں بگردانیم!

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غالب کے نظریۂ محبت کی نسبت لکھتے ہیں ۔

اس واقعہ کے چالیس بیالیس برس بعد مرزا ایک خط میں مرزا حاتم علی مہر کی معشوقہ کی تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں - جس پر مرتے ہیں - اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں - عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے - خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں - مغفرت کرے - چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے - باآنکہ یہ کوچہ چھُٹ گیا - اس فن میں بیگانہ محض ہوگیا ہوں - لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں - اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھُولوں گا"

اس کے بعد کسی گہری محبت کے نشان غالب کی زندگی میں نہیں ملتے - لیکن مخلوقاتِ قدرت میں حسن ڈھونڈنے کی جو خواہش شاعر کے دل میں ازل سے رکھی ہُوئی تھی - وہ تمام عمر ساتھ رہی - چنانچہ مرزا نے اکتیس برس کی عمر میں جو فارسی مثنوی بنارس کے متعلق لکھی ہے اس میں اپنی "جنتِ نگاہ" کا نقشہ کھینچا ہے -

بتانِ بنارس کی نسبت لکھا ہے ؎

میانہا نازک و دلہا توانا | ز نادانی بکارِ خویش دانا
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی ست | دہنہا رشکِ گلہائے ربیعی ست
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار | خرامے صد قیامت فتنہ دربار
بہ لطف از موجِ گوہر نرم روتر | بہ ناز از خونِ عاشق گرم دوتر

قیامت قامتاں مژگاں درازاں
ز مژگاں بر صفِ دل نیزہ بازاں!

ہم دیدہ را ادائے مہ و شب دیدہ شاہدان ہر ست رو رہ نما در دو انتظار
شوقم خریدہ رقم آوردہ لوس دو قم با مرد آورس قدوہ کنار
ہموا دو دست مستی و لہو و سرور و شور
پیوستہ سرو دست مدوسیح دمے و قمار ا

ان اشعار کے علاوہ اردو میں غالب کی ایک نہایت مؤثر غزل ہے جس کی نسبت یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محبوبہ کا نوحہ ہے ~

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

غالب کا یہ نوحہ تمام کا تمام بڑے درد و کرب سے مستبع ہے۔ بعض اشعار ایسے ہیں جو اگر رسمی قافیہ پیمائی کا نتیجہ نہیں تو ممکن ہے ان میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہو ~

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

مقطع کا شعر جسے غالب نے اشاعت کے وقت حذف کر دیا بہت رمعی ہے ~

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

یہ نوحہ غالب نے بیس بائیس برس کی عمر میں اس زمانے میں لکھا تھا جب وہ اسد تخلص کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے جس محبوبہ کا اس میں ذکر ہے۔ اسے غالب سے اور غالب کو اس سے بڑی محبت تھی اور شاید مرزا کی اتنی گہری دلبستگی پھر کسی سے نہیں ہوئی

فرہاد پر غالب نے اکثر نکتہ چینی کی ہے مثلاً ؎

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں
کرے گا کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر — ہنوز اُس خستہ نیروئے تن کی آزمائش ہے

اور بھی کئی شعر ہیں جن سے ذم کا پہلو نکلتا ہے مثلاً ؎

پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوان میر بھی تھا
کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب — بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

زلیخا سے بھی مرزا بہت خوش نظر نہیں آتے ؎

صد حیف است گر در زلیخا میل ماست — جذبہ کہ چاہِ یوسف را بیازار آورد
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے — ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

یوسف مصری کا ذکر بڑی شوخی سے کیا ہے ؎

یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی — سفیدی حضرت یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

پرانے عشاق میں سے قیس ایک ایسی ہستی ہے۔ جس کا مرزا ادب کرتے ہیں اور جس کی "ہم طرحی" کا انہیں بھی خیال آتا ہے ؎

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

مندرجہ بالا اشعار تو ان عشاق کے متعلق ہیں جن کی محبتیں بشری اور مجازی تھیں عشاقِ الٰہی میں سے حضرت موسٰیؑ کی نسبت کئی اشعار ہیں جو مرزا کی توجیہی طبع بلکہ تنقیدی نقطۂ نظر کے مظہر ہیں مسلمان شعرائے حضرت موسٰیؑ کے واقعہ دیدار الٰہی اور رسول اکرمؐ کے واقعہ معراج کا اکثر موازنہ کیا ہے نعت میں ایک فارسی شعر ہے ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا — بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زباں ہے
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

یہ اشعار کسی اہم نفسیاتی حقیقت یا قلبی واردات کا اظہار نہیں بلکہ اس "خیال آفرینی" کی مثالیں ہیں جسے ابتدائی شاعری میں مرزا نے دور از کار تشبیہوں اور دقیق اور عجیب مضامین باندھنے میں صرف کیا تھا اور ان اشعار میں مروجہ عشقیہ مضامین کے غیر معروف پہلو ڈھونڈنے اور ان میں لطف پیدا کرنے میں "رشک کے اشعار بھی اسی قبیل سے ہیں مثلاً ؎

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے — مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
حلل سہ واحد بسپرم پیغام را — رشک نگزارد کہ گویم نام را

رشک کے اشعار کی سب سے زیادہ افراط آخری دور میں ہے جس میں صاف اور شگفتہ طرز تحریر کے علاوہ شوخی اور ظرافت کی بھی مثالیں ہیں یہ اشعار بھی حقیقتاً اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور جذبات سے زیادہ تفنن طبع کا اظہار ہیں ؎

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

اسی طرح وہ غالب کی ایک دوسری غزل سے ؎

بمرگ من کہ بیں ارمن بمرگ من یاد آر — بکوئے خود بیس آں نعش لے کس یاد آر

غالب کی عشقیہ شاعری

محبت کی خیالی اور رسمی تصویریں

محبت غزل کو شعر کا مقبول موضوع ہے۔ اور مرزا غالب بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔ بلکہ شاید یہ کہا جا سکے کہ محبت اور زندگی غالب کی شاعری کے دو سب سے اہم موضوع ہیں۔ محبت کے متعلق غالب کے اشعار کئی طرح کے ہیں۔ زیادہ تعداد ان اشعار کی ہے جنہیں مضمون آفرینی اور خیال آرائی کی مثالیں سمجھنا چاہئے۔ ان اشعار میں محبت کی جو رسمی تصویریں ہیں۔ غالب نے انہی کو آب و تاب دیکر باشوخی اور جدت خیال سے انکا پہلو موج کر پیش کر دیا ہے۔ ان اشعار میں غالب کی زندگی کے شخصی واقعات یا محبت کے متعلق کسی کا نام قطعاً نہیں ڈھونڈا جا سکتا یہ اشعار ذہنی مشق کی مثالیں ہیں۔ جن میں خیالات اور جذبات تو پرانے یا رسمی ہیں لیکن خیال بندی اور مبالغہ یا شوخی سے نئے مضامین پیدا کئے گئے ہیں۔ مثلاً:

مجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اُلجھتے تم ہو اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

کھا ہے وہ تمامتر ذاتی مشاہدہ پر مبنی اور شخصی حالات کا اظہار ہے ـــ

عید اضحےٰ بسر آمد و زمستاں آمد — وقت آرایش حجرہ و ایواں آمد
گرمی از آتش بہ دل رفت و ملامت در ہوا — محمل مہر جہانتاب بہ میزاں آمد
روز میکاہد و شب ست ہم افزایش ند — موسم دیر غنودن بہ شبستاں آمد
ہمہ در فصل خزاں سیر بہارے دارد — گو بہ گوں سرہ محلی سیہ جاناں آمد
دے و بہمن کہ ند اقلیم دگر ریخ سرد — اندریں ملک گل و سرو فراواں آمد
میشکر بسکہ مصعد لست کدایو بہ نسیم — گفت حالیست گر سر بدہ سوال آمد
نخل ما ریخ رہی کہ ہم از میوہ و شاخ — گوے در چوگاں کہ سعدو دکمیلاں آمد
تا سرود ارج غم ہجر تساوی بدلش — گل صد رنگ بہ دلجوئے ہیولاں آمد

گر بہ ایں کرمے ہنگامہ تماشا دارد
از حیرہ نرگس پئے نظارۂ گلستاں آمد

مندرجہ بالا مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ مرزا مناظر فطرت سے لے پرواہ تھے اور انہوں نے ان کے متعلق بہت پاکیزہ اور دلآویز اشعار لکھے ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ ان کے ہاں نیچر فقط ایک دلچسپ شاعرانہ موضوع ہے۔ ورڈز ورتھ اور بعض دوسرے مغربی شعرا کی طرح ایک ایسی زندہ اور دلآویز شخصیت نہیں جس سے شاعر کو محبت ہو جاتی ہے اور جو اسے انسانی دنیا کی کلفتوں سے بچا کر آرام و سکون بہم پہنچاتی ہے۔ مرزا کو نیچر سے وہ والہانہ دلبستگی نہ تھی جو ورڈز ورتھ کو تھی لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ نیچرل شاعری کی نشوونما ایک شاعر کے ماحول پر منحصر ہے۔ اور ایک شہری شاعر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سبزہ اور مناظر فطرت کی شاعری میں معراج کمال حاصل کرے +

داد کو نا ستم بر اندازد　　طرحِ نو چرخ دیگر اندازد

اس کی تشبیب تمام برسات کے اختتام اور ہنگامۂ صبح کے آغاز کے متعلق ہے۔

بہار کی نسبت تو شاید کہا جائے۔ کہ یہ ایک فرسودہ موضوع ہے۔ جسے ہندستانی شعرا زیادہ تر فارسی شعرا کی تقلید میں نبھاتے آئے ہیں۔ یہاں پر بہار کا اصل سماں موسم برسات میں ہوتا ہے۔ لیکن مرزا بھی اس اطمینان اور مسرت سے ناواقف نہ تھے۔ جو اس ملک میں موسم گرما کے اختتام اور برسات کے آغاز پر ہوتا ہے۔ ایک فارسی قطعہ کے ابتدائی اشعار ہیں ؎

بہارِ ہند کہ نامند برشگال آں را　　پس از دو سال بہ اہلِ جہاں مبارکباد

بہ باغ و کشت و بیاباں و کوہ سر تا سر　　سحاب و سبزہ و آبِ رواں مبارکباد

گذشت عہدِ سموم و دوزید بادِ خنک　　زجاں بہ تن دگر از تن بجاں مبارکباد

اردو میں بھی ایک مختصر سا قطعہ ہے۔ جو مرزا نے "ابرِ رحمت کے تشکریہ" میں لکھا ہے جس میں بیشتر اشعار نواب کلب علی خاں کے لئے دعائے صحت اور اپنے عرضِ حال کے متعلق ہیں۔ لیکن برسات کا بیان بھی بڑی شوخی اور نئے رنگ سے کیا ہے ؎

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک　　رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس

کہاں ہے ساقیِ مہوش کہاں ہے ابرِ مطیر؟　　بیار، لا مئے گلنار گوں، بیار، برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی　　درِ حضور پر اے ابر بار بار برس

موسمِ برسات کی دلآویزیاں تو اس ملک میں سب محسوس کرتے ہیں۔ لیکن مرزا یہ بھی جانتے تھے کہ موسمِ سرما جو شیراز و غزنی اور بخارا و سمرقند میں برفباری اور بڑی اذیتوں کا موسم ہوتا ہے۔ اور جس کی ان علاقوں کے شعرا قدرتی طور پر مذمت کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر خوشگوار ہوتا ہے۔ انھوں نے نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کے قصیدہ میں اس موسم کے متعلق جو کچھ

کے چید اشعار ہم ارمغانِ غالب میں درج کریں گے ؎

مار سیجام بہار آورد باد   مژدہ بہر رورگار آورد باد

ایک فارسی قطعہ میں اس موسم کی حیات بخش کیفیتوں کو بڑے جوش اور سرور کے ساتھ نظم کیا ہے ؎

نوردرد مہرگاں سود درطریق ما	اما شگفتہ روئی گلہائے تر خوش است
نوروز عید بیت بہاراست و در بہار	آئین شادمانی و ذوق نظر خوش است
ارماد رمہر یہ گیتی نستاں نہ ماند	خوش گل و نشاط نسیم سحر خوش است
نیست متاعم پدرد رنقش نظر فروز	خوش باد وقت گل کہ جہاں سرسر خوش است
از رنگ رنگ تر د دار گوہ گوہ گل	گلزار و شہر بیشہ و کوہ و کمر خوش است
دریا خوش و سراب خوش و کوہسار خوش	مرل خوش است و تشنہ خوش است و سفر خوش است

بہار کے علاوہ مرزا کا دوسرا دلپسند موضوع صبح کا سماں تھا جسے انہوں نے کئی نغموں میں بڑے دلآویز طریقے سے بیان کیا ہے اردو کا ایک مشہور قصیدہ ہے ؎

صبح دم دروازہ خاور کھلا	مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں	شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود	صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ	دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو	موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر	اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

فارسی میں بھی صبح کا بیان کئی قصیدوں میں ہے ایک پرلطف قصیدہ کا مطلع ہے ؎

اس سے زیادہ "ان تحریل" یا مصنوعی شاعری نہ ہوگی۔ چونکہ جنہوں نے تو خود یہ مناظر دیکھے ہی نہیں۔ جو لوگ گرم ملکوں اور ریتیلے میدانوں میں رہتے ہیں۔ انہیں وہ دلفریب مناظر دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ تو قدرت نے فیاضی سے انہیں سوئٹزرلینڈ یا ایک ڈسٹرکٹ میں بہم پہنچا دیے ہیں۔ انہیں تو خوبصورت مناظر دیکھنے نصیب ہوتے ہیں وہ بہت محدود ہیں۔ مثلاً چاندنی رات، صبح، شام، شفق کی رنگینی، دریا کا نظارہ، بسنت، بہار، برسات اور اردو میں ان مناظر کے متعلق کئی نظمیں ہیں +

مرزا بھی ان مناظر سے بے پروا نہ تھے۔ اور ان کے فارسی کلیات اور اردو دیوان میں متعدد اشعار ایسے ہیں۔ جن میں بہار، صبح، شام، برسات اور موسم سرما کی دلآویز تصویریں کھینچی ہیں "نموداری صبح" اور "ہجوم ظلمت شب" کے متعلق تو مرزا نے فارسی نثر میں بھی عبارت آرائی کی ہے اور اس سلسلے میں دو دلچسپ فارسی مثنویاں لکھی ہیں مرزا کے ابتدائی اردو کلام میں بھی کئی نئی تشبیہیں ایسی ہیں۔ جو شاعر نے مناظر قدرت سے اخذ کی ہیں۔ اور جو ذاتی مشاہدے پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن مناظر قدرت کا بہترین بیان مرزا کے ان قصیدوں میں ہے۔ جن کی تشبیبیں ان مناظر کے لئے وقف ہیں۔
بہار کا موضوع مشرقی شعرا کو خاص طور پر مرغوب ہے۔ اور مرزا بھی اس سے مستثنےٰ نہ تھے۔ اردو میں ان کا پہلا قصیدہ منقبت میں ہے۔ لیکن اس کی تشبیب بہار کی چمن آرائیوں کے لئے وقف ہے۔ اردو میں ایک مشہور قطعہ بند غزل ہے۔ جو تمام کی تمام بہار کے متعلق ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی   کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

کئی فارسی قصائد کی تشبیبیں اس دلکش موضوع کے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک کے

نیچرل شاعری

مرزا کی شاعری پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وہ نیچرل نہیں حسب حالی نے یہ اصطلاح خود شاعری میں پہلی مرتبہ استعمال کی تھی تو اُس نے اس سے وہ شاعری مراد لی تھی جو خیالی نہ ہو بلکہ نیچر یا فطرت کے مطابق ہو۔ اگر کلام غالب کو اس نقطہ نظر سے جانچا جائے تو یہ اعتراض صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اگرچہ مرزا نے عام شاعروں کی طرح کئی جگہ مبالغے سے کام لیا ہے لیکن انکے بیشتر مضامین اصولاً فطرت کے مطابق ہیں اور فطرت انسانی کے نوادر اُن کے کلام میں بے نقاب ہوئے ہیں وہ دوسرے اُردو شعرا کے کلام میں بہت کم ہیں لیکن معترضین نیچرل شاعری سے بالعموم مناظر قدرت کی شاعری مراد لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرزا کے کلام میں یہ بڑا عیب ہے کہ انہوں نے مغربی شاعروں کی طرح مناظر فطرت کے متعلق نظمیں نہیں لکھیں حقیقتاً یہ اعتراض بھی خاص مرزا کے متعلق نہیں بلکہ اکثر مشرقی شعرا پر کیا جاسکتا ہے اور یہ عموماً وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو اپنے بزرگوں کی تقلید سے تو آزاد ہو جاتے ہیں۔ لیکن مغرب کی کورانہ تقلید کو انتہائی آزاد خیالی اور معراج کمال سمجھتے ہیں یہ صحیح ہے کہ انگریزی زباں کی کئی ملید یا نظمیں مناظر فطرت کے متعلق ہیں اور انگریزی ادب میں مناظر فطرت کی شاعری کو ایک خاص درجہ حاصل ہے لیکن بس سے بھی تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگلستان، بالخصوص لیک ڈسٹرکٹس میں شان دار مناظر قدرت کی جو فراوانی ہے وہ ہندوستان بالکم از کم دہلی کے گرد و نواح میں میسّر نہیں اور اگر کوئی دہلوی شاعر اس خیال سے مرغوب ہو کر کہ انگریزی شاعری میں مناظر فطرت کے متعلق بہت نظمیں ہیں خود بھی اُونچے اُونچے پہاڑوں اور خوش منظر جھیلوں کے تصور مناظر اور چہچہاتے پرندوں کی موسیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنائے تو ظاہر ہے کہ

اُس عظیم اور متنوع شخصیت سے منسوب نہ کیا جاسکے۔ جس سے ہم یادگارِ غالب کی وجہ سے خوب واقف ہیں۔ مرزا غالب کا زاویۂ نگاہ عام لوگوں سے کئی باتوں میں مختلف تھا۔ اور ان کے اشعار میں بھی اپنے ہی خیالات کی تکرار ہوتی ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ انہوں نے بہشت کا ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا۔ اور یہ ان کے شخصی نقطۂ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرہاد کا ذکر ان کے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے۔ اور سب جگہ طنزاً۔ مذہب کے متعلق ان کے بیسیوں اشعار ہیں۔ اور ہر شعر ان کی وسعتِ نظر اور طبعی تشکک کا اظہار ہے۔ اسی طرح رشک کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا ذکر طرزِ اظہار کے اختلاف سے قطع نظر، وہ مرزا ہی کے اسلوبِ خیال کو نمایاں کرتے ہیں۔ اور بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ مرزا نے کوئی مضمون قافیے سے مجبور ہو کر باندھ دیا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزل ایک جامۂ موزوں ہے۔ جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا۔ اور جس نے اس دلفریب شخصیت کو اور نمایاں کر دیا +

اُردو کے کلاسیکل نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کئے ہیں۔ وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں۔ یا بقول سر والٹر ریلے "بہی کھاتہ والوں" کی نقادی یعنی سرقہ اور توارد کی بحث! مرزا یاس اور مولینا آرگس (مولینا عبدالباری آسی؟) نے محنت اور تحقیق سے اساتذۂ قدیم کے کلام سے کئی شعر ایسے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جُلتے ہیں۔ کسی زمانے میں ملٹن کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہوا تھا۔ لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کیونکہ ایک تو بقول گوئٹے کائنات میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں۔ اور دوسرے کسی شاعر کے چند اشعار میں توارد یا سرقہ ثابت کرنے سے اسکے باقی اشعار کی خوبیاں ضائع نہیں ہو جاتیں +

اس لئے غزل گو شعرا اپنے سامنے چند قافیے رکھ لیتے ہیں اور اُن کے مطابق اس وقت جو مضمون ذہن میں آئے اُسے نظم کر کے غزل مکمل کر لیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے اور نہ غزل میں شاعر کے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے ممکن ہے یہ خیال کسی اور غزل گو شاعر کے متعلق صحیح ہو لیکن کم از کم مرزا اس سے مستثنےٰ ہیں انہوں نے خود ایک خط میں بڑے زور سے اس خیال کی تردید کی ہے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ اُستاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے لاحول ولاقوۃ الا باللہ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش رکھ لئے ہوں صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اُس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔"

ایک اور خط میں غزل کے لئے عشق و محبت اور معشوق کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے۔ شعر کیا کہوں گا غزل کا ڈھنگ بھول گیا معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے رہا قصیدہ ممدوح کون ہے ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے ؎

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح　　اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

قطع نظر اس امر سے کہ مرزا قافیہ پیمائی سے خود متنفر تھے ان کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی غزل گوئی ان کی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار ہے۔ ایک شاعر کے خیالات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے تو کل دوسرا۔ چنانچہ دیوان غالب میں بھی یہ تفاوت موجود ہے لیکن اس میں مشکل سے کوئی شعر ایسا ملے گا جسے غالب کی

رنگ اختیار کیا۔ وہ فارسی فن انشا کی نسبت انگریزی خطوط نویسی سے زیادہ قریب تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے۔ مرزا کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی بہ نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہیں۔

اعتراضات موجودہ نسل کو پرانی طرز کے غزل گو شعرا میں سے غالب سب سے زیادہ پسند ہے۔ لیکن جب لوگوں نے فن تنقید کے عام اصولوں سے گذر کر جزوی اور فروعی باتوں میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معراج سمجھا ہے۔ انہوں نے غالب کے کلام پر کئی اعتراض کئے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالب کے متعلق نہیں بلکہ تمام مشرقی شاعری پر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے۔ کہ غالب نے بیشتر غزلیں لکھیں۔ اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط ردیف اور قافیے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مضمون کی وحدت سے نہیں۔ اور غالب کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے گلدستے ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے مسلسل اظہار کی بجائے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے لئے وقف ہیں لیکن آخر یہ غالب کی بدقسمتی تھی۔ کہ جب اُس نے شعر گوئی شروع کی تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنف شاعری مقبول نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس امر کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہے کہ غالب کے دیوان میں مسلسل غزلیات اور قطعہ بند اشعار کی جو کثرت ہے۔ وہ کسی اور اُردو شاعر کے کلام میں شاید ہی ہو گی۔ اور اس کی بہترین غزلوں میں کچھ قافیہ ردیف کی ہم آہنگی سے اور کچھ شاعر کی اپنی شخصیت کے پرتو سے ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت کھپ گئی ہے۔ اور کوئی تال بے سُر معلوم نہیں ہوتی۔ غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ اس میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں

لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے ترکش کے سارے تیر اُن پر چلائے اور جہاں وہ مرم لسانطا اور محفلِ عشرت میں احتی معلوم نہ ہوتے تھے وہاں درد مند دل کی مصائب بھی حوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مولوی ہو یا محتسب شوخی اور ظرافت کا دلدادہ ہو یا غمزدہ فلسفی ہو یا عاشق مزاج ان سب کے لیے کلامِ غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئے طرز کے آدمی تھے۔ اور ان کے خیالات کا جو اسلوب تھا۔ آج زمانہ اس کی تائید کر رہا ہے ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے ان کی جدت پسندی نئے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھی بلکہ لغت، شعر، انشاء اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشروؤں اور معاصروں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور ان پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے تھے جب کلکتہ میں ان کے اشعار پر یہ اعتراض ہوا کہ انھوں نے قتیل کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انھوں نے بڑے جوش سے کہا تھا ؂

زلّہ بردارِ کسی چرا باشم　　　من ہمایم مگس چرا باشم

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت عمر بھر اُن کی امتیازی خصوصیت رہی اور موجودہ زمانے میں بھی یہی طرزِ عمل زیادہ مقبول ہے اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے وہ اگرچہ بہت بلند پایہ نہیں لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تعاریظ میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ ربط اور محاورے پر مضمون اور خیال کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلامِ غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے تنقیدی اصول بھی اس کے حامی ہیں مرزا نے اردو مکتوب نویسی میں جو

اٹھاتا ہے +

اس ساز میں بے شمار نغمے ہیں۔ اور ہر نغمہ دلآویز ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ کلامِ غالب سنی سُنائی باتوں کا بیان نہیں۔ بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پہ دستِ قدرت نے سارے سُر ایک ایک کر کے بجائے ہیں۔ اور دیوانِ غالب انہی سُروں کی صدائے بازگشت ہے ؎

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم　　کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

مسٹر والٹر رالے شیکسپیئر کے متعلق لکھا ہے۔ "وہ کمیاب ترین چیز تھا یعنی ایک پورا انسان" شیکسپیئر کے متعلق تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ لیکن جن گوناگوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ شیکسپیئر کے حالات سے کریں۔ تو مرزا کا پلہ شیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہے گا۔ مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے ان کے متعلق طنزاً لکھا تھا "آپ انتخابِ زماں ہیں۔ بلکہ دوراں ہیں۔ جس طرف طبیعت آئی۔ اس کی خاک اڑائی چنانچہ دخترِ رز سے جو ناک لگائی۔ تو وہ ظرف پیدا کیا۔ کہ مینائے گردوں میں شرابِ شفق قاضیٔ آفتاب بادب پیشکش لایا۔ اور قمار بازی پہ جو دھیان کیا۔ تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ میر لبساط اور بکھرے داؤں کھانے لگے[1]" لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر میخانے اور قمار خانے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے۔ تو شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے دو بڑے عالم مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولینا صدر الدین اُن کے عزیز ترین دوست تھے۔ اور جس کثرت سے صوفیانہ راز و نیاز کی باتیں ان کے اشعار میں ادا ہوئی ہیں ہندوستان کے شائد ہی کسی اور شاعر کے کلام میں ملیں۔ وہ رنگ رلیوں میں بلکہ جوان ہوئے تھے۔

[1] گلستانِ بیخزاں

فرانسیسی سیاست داں کے نعرے دُہرانے پڑیں حق؟ حق میرے دوست وہ ہے جس کی میں حمایت کروں اور باطل وہ جس کا میں مخالف ہوں!!"

غرض کہ اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد علمی قابلیت وجاہت اور ادبی ذوق و شوق میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اور ان کے قلم سے ایسے ایسے روداد اور پُرشکوہ مضامین نکلے ہیں کہ اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں ان کا مقام زماں کے معماروں اور اسلوب سازوں کے ساتھ ساتھ ہوگا لیکن ان کی اور مرزا غالب کی طبیعتیں مسلمہ ہیں۔ طرز تحریر جداگانہ ہیں ان کے خطوط کی اشاعت سے مکتوبات غالب کی مقبولیت کم ہونے کا کوئی امکان نہیں +

غالب کی مقبولیت کے اسباب

ہم نے مرزا کی شاعری اور نثر کی خصوصیات جس ترتیب سے دیکھی وہ ہیں مادہ مماثل یقین میاں کردی ہیں لیکن غالب کی غیر معمولی مقبولیت سمجھنے کے لیے وہ کافی نہیں کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ جسے ڈاکٹر عبدالرحمن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے "لوح سے دست تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں کو ن سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں، مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن دقیق اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے لئے یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے وہ نمونے ہیں جو دیوان کمی میں بھی مشکل سے ملیں گے شگفتہ طبع لوگوں کے لئے شوخی اور ظرافت ہے اور انسانی فطرت کی داستاں سُننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی کہ جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جائے گی اس کا لطف بڑھتا جائے گا یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف

ہر مدعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں“۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک تو یہ تشکک جو فی الواقع زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واقف ہونے کا نتیجہ ہے، ضعفِ ایمان کی علامت ہے۔ وہ مولانا شبلی سے اس لئے ناراض تھے۔ کہ وہ کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے تردد و تامل کیوں کام میں لاتے تھے[1]۔ اُن میں خود اعتمادی و خود رائی غضب کی ہے۔ دُنیا ان کی نگاہوں میں ایک کفِ دست سے بھی مختصر ایک صاف اور چٹیل میدان ہے۔ جس کی ہر راہ سے وہ واقف اور ہر روش سے آشنا ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک حق و باطل[2]، خلوص و ریاکاری کی ایک مسلسل آویزش ہے۔ جس میں ان کا راستہ اور طریقِ کار معین ہے۔ لیکن جو بد قسمت یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس ناقص دنیا میں کبھی کبھی باطل بھی حق کے روپ میں رونما ہو جاتا ہے۔ اور عام دنیاوی معاملات میں تو حق و باطل اس طرح دست و گریباں ہیں۔ کہ انہیں متمیز کرنا مشکل بلکہ حق و باطل کے مختلف ناموں سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ وہ اگر اپنی مشکلات کے حل اور حق و باطل کی حقیقت سمجھنے کے لئے مولانا کی طرف رجوع کریں۔ اور مولانا اپنے نہاں خانۂ ضمیر میں نگاہ ڈال کر، اور اپنے باطنی رجحانات سے کماحقہٗ آشنا ہو کر جواب دیں۔ تو شاید انہیں ایک

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ صفحہ ۱۸۱

[2] الہلال اور البلاغ میں بیسیوں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ جن میں مولانا نے روزمرہ کے معمولی واقعات کو حق و باطل کے رُوپ میں نمایاں کیا ہے۔ مثلاً ”مسلم یونیورسٹی“ کا مسئلہ ایک ایسا سوال تھا۔ جس کے متعلق دیانتدارانہ اختلاف رائے کی گنجائش تھی لیکن مولانا نے ہمیشہ اسے جس رنگ میں دیکھا۔ اسکا ملاحظہ ہو ”مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے واقعہ کو دُنیا خواہ کچھ ہی سمجھے۔ مگر میں نے ہمیشہ اس میں ایک ہی چیز کو دیکھا۔ اور ہمیشہ اس ایک ہی طرح کی صدائیں سنیں۔ میں نے دیکھا کہ حق و باطل معرکہ آرا ہیں۔ اور گو مختلف صداؤں، مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں منظر آرائیاں ہو رہی ہیں۔ مگر انکے اندر بجز حق و باطل کے مقابلے کے اور کچھ نہیں ہے“۔

امنگوں اور آرزوؤں بھرا دل لائے تھے اپنے جیسا کسی کو نہ سمجھتے تھے لیکن زندگی میں ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ کہ سارے نقشے ہرن ہو گئے اور خود اعتمادی اور تیقن کی جگہ تردّد اور تشکک نے لے لی مولینا کا حال اس سے مختلف ہے انہیں چھوٹی عمر میں ایسی فقید النظیر کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ کہ ان کے دل میں گرہ بیٹھ گئی۔ کہ ان کے سوا باقی سب طفل مکتب ہیں۔ وہ ابھی پچیس برس کے نہ تھے۔ جب انہوں نے الہلال جاری کیا اور اس کی مدد سے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اس کے بعد ان میں اگر خود رائی اور خود بینی آ گئی تو کون سا تعجب کا مقام ہے ؎

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بُت آئینہ سیما مرے آگے

مرزا بھی اپنے مقابلے میں دوسروں کو ہیچ خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے تئیں غلطی سے مبرا نہ سمجھتے تھے۔ اپنی غلطی ماننے اور اس کی اصلاح کرنے میں انہوں نے کبھی تامل نہیں کیا۔ ناطق مکرانی نے انہیں ان کے ایک شعر میں سقم بتایا تو انہوں نے فوراً اس کی اصلاح کر دی۔ افسوس اور تاسف کی اصل کے متعلق غلط رائے بتانے پر انہوں نے کئی جگہ تاسف کا اظہار کیا۔ لیکن مولینا کی زندگی اور تصانیف میں ایسی مثالیں ڈھونڈے سے نہ ملیں گی اس کے علاوہ مرزا کے تلخ تجربوں نے ان کے فلسفۂ زندگی میں توازن پیدا کر دیا تھا وہ جانتے تھے۔ کہ سب امنگیں خواہ وہ جائز ہی کیوں نہ ہوں، اور سب ولولے خواہ وہ نیک ہی کیوں نہ ہوں پورے نہیں ہوتے اس احساس نے ان کی ابتدائی خودپسندی کم کر دی تھی وہ اس تبسم زیر لب کے ساتھ جس سے ایک فرزانۂ جہاں دیدہ شباب کی سادگی بلکہ سادہ لوحی کو دیکھتا ہے، ایک حریف کی نسبت لکھتے ہیں ؎ ہوس پیشہ ہیں۔

موزوں ہے۔ لیکن اس میں کوئی ایسی امتیازی نشان نہیں۔ کہ اسے مرزا کی نثر کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے۔

قصہ کوتاہ مولینا ابوالکلام آزاد کا عام رنگ مرزا کی نثر سے اس قدر مختلف ہے۔ کہ ان دونوں کا صحیح طور پر مقابلہ مشکل ہے۔ اور بہرکیف مولینا کی نثر کو مرزا کی نثر کے ہم پایہ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اگرچہ اس میں ایک دو ایسی خصوصیتیں ہیں۔ جو مرزا کی تحریر میں نہیں لیکن اس میں کئی ایسے اہم بنیادی نقائص ہیں۔ جن سے مرزا کی نثر پاک ہے۔ مولینا کی نثر کا مرزا کی نثر سے شائد اس وقت صحیح طور پر موازنہ ہوسکے۔ جب مولینا کے خطوط شائع ہوں۔ اور یہ دیکھا جاسکے۔ کہ ان خطوط کے متعلق مولینا مہر کی رائے کس حد تک صحیح ہے۔ پتہ نہیں یہ وقت کب آئے۔ (اور مولینا نے اپنے حالات بر اخفا کا ایک ایسا دبیز پردہ ڈال رکھا ہے۔ کہ شاید اس کی نوبت کبھی نہ آئے) لیکن ہمارا خیال ہے۔ کہ اس وقت بھی اردوئے معلے اور عودِ ہندی کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اور اسکی وجہ وہ عظیم تفاوت ہے۔ جو مرزا اور مولینا کی شخصیت میں ہے۔ مولینا مرزا کے بڑے مداح ہیں لیکن ان کی طبیعتوں میں بُعد المشرقین ہے۔ مولینا ایک مذہبی عالم، مرزا ایک رندِ آزاد خیال آنادہ رو۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مولینا بھی رندی کے کوچے[1] سے نابلد نہیں۔ لیکن انکا اور مرزا کا کیا مقابلہ!

اس کے علاوہ مولینا کے خطوط میں شوخی و ظرافت کہاں سے آئے گی۔ جو مرزا کے خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ مولینا طبعاً جز رشیلے، اور متین، مرزا شوخ، اور رنگین خیال اور بذلہ سنج، اس کے علاوہ دونوں کے فلسفۂ زندگی اور عام اسلوبِ خیال میں بڑا فرق ہے۔ مرزا بھی ایک

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ کا آخری باب

بلکہ اس کی وجہ سے ایک ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں قوتِ متمیزہ شل، اور سوچنے اور
عملی کام کرنے کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں عام طور پر یہ حقیقت
نہیں سمجھی جاتی۔ آج بھی جب کوئی تیز طرار مقرر جس کا دماغ عقل و ہوش سے عاری ہوتا ہے لیکن
جس کے منہ میں گز بھر کی زبان ہوتی ہے، اٹھتا ہے اور اٹھو جاگو کا شور مچایا ہے تو لوگ
سمجھتے ہیں کہ ایک نیا مسیحا آگیا جو مُردوں کو زندہ کر دے گا لیکن محض جوش کی تلافی جیت بازی
سے اور ٹھوس عملی کام اور محنت کی کمی جوش و خروش سے پوری نہیں ہو سکتی۔ پھر وہی ڈھاک کے
تین پات یعنی اتنے مسیحاؤں کی آمد کے باوجود لوگ جیسے پہلے تھے ویسے اب ہیں۔

خطیبانہ طرز تحریر میں بڑی خامی یہ ہے کہ اسے نہ صرف حق، بلکہ باطل کی حمایت کیلئے
بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے نہ صرف عالمانہ خیالات کو زیادہ مقبول اور حکیمانہ
پُر مغز ہدایات کو زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے بلکہ چالاک لوگ اسے اپنی تہی مغزی چھپانے اور
اپنے معمولی اور بے مایہ خیالات کو آب و تاب دینے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں مولانا
کے بعض مقلدین میں یہ نقائص ہیں۔ لیکن مولانا کی تحریر کی نسبت کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ
ایک استخواں بے مغز ہے۔ جوشیلے اور خطیبانہ طرز تحریر کے باوجود اس میں مولانا کی وسیع علمیت
خلوص اور ذہانت کا عکس ہے۔ اور اس طرزِ تحریر کو انہوں نے معراج کمال تک پہنچا دیا لیکن
جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس طرز تحریر میں خطرات بہت زیادہ ہیں اور ہمارے خیال میں مولانا
نے اسے اُردو صحافت میں رواج دے کر قوم کی کوئی خدمت نہیں کی +

مولانا کا تیسرا طرزِ تحریر وہ سادہ انداز بیاں ہے جسے انہوں نے ترجمان القرآن کے
مقدمہ یا حال کے بعض مضامین میں استعمال کیا لیکن اس نثر کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔
اور اگرچہ یہ علمی مضامین کے لئے مولانا کے مخصوص طرزِ تحریر یا خطیبانہ انداز بیاں سے زیادہ

ان کی تحریریں وہ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی اُردوئے معلّےٰ، جو خواصِ دہلی کی خصوصیت اور خطوط غالب کا زیور ہے مشکل سے ملے گی +

مولینا کا دوسرا اسلوب تحریر خطیبانہ ہے۔ جو الہلال اور البلاغ کے اکثر مضامین کی خصوصیت ہے۔ اور جس نے ان کے "آتشیں" قلم میں اس قدر زور اور اثر بھر دیا تھا۔ اردو زبان میں شاہ اسمٰعیل شہید کے بعد کسی نے یہ طرزِ تحریر اختیار نہ کیا تھا۔ اور جب مولینا نے اسے اختیار کیا تو اس میں اور ہی جدتیں اور شوخیاں پیدا کیں۔ نتیجہ یہ کہ مولینا کا یہ اسلوب تحریر اخبار بینوں کو بالکل نیا معلوم ہوا۔ اور الہلال اور البلاغ کو اس طرزِ تحریر کی بدولت ہی ایسا درجہ مل گیا۔ جو کبھی کسی اُردو اخبار کو حاصل نہ ہوا تھا۔ آج مولینا نے یہ طرزِ تحریر بہت حد تک ترک کر دیا ہے۔ اور شاید وہ اس کی مضرتوں سے آگاہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے دیکھا ہوگا۔ کہ اس طرزِ تحریر کا تتبع بہت آسان ہے۔ اور اسے ان کی مخالفت اور تردید کے لئے بھی اُسی زور اور کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ جن ملکوں نے کچھ ترقی کی ہے۔ وہ جوشیلے اور خطیبانہ طرزِ تحریر کو ایک سراب اور دھوکہ سمجھتے ہیں۔ اور اسے ادب کی ایک پست شاخ (Rhetoric) میں جگہ دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ خواہ تقریروں میں جوش اور خطیبانہ حربے جائز ہوں (اگرچہ دیدہ ور لوگ وہاں بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر مقرر کے بیان میں جو ٹھوس سچائی ہو اسی کو دیکھتے ہیں۔ اور انگریزی میں تو جوشیلی تقریروں کے لئے ایک بڑا حقارت آمیز لفظ Harangue استعمال ہوتا ہے) لیکن تحریروں میں تو اُن کا استعمال بہت کم ہونا چاہیئے۔ جوشیلی تقریر سے ایک ہنگامی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے شاید کوئی وقتی نتیجہ نکل بھی آئے۔ لیکن تحریر کا مقصد تو پائدار اور دیرپا کام ہوتا ہے۔ اس کے لئے جوشیلا طرزِ بیان کارآمد نہیں ہو سکتا۔

جو الہلال یا البلاغ میں شائع ہوئے تذکرہ سوانح سرمد ترجمان القرآن بدقسمتی سے مولانا کے طرزِ تحریر نے اتنے رنگ بدلے ہیں اور مختلف موقعوں پر اس سلسلہ میں قدر مختلف مدارج اختیار کیے ہیں کہ اس کے متعلق آسانی سے کوئی رائے نہیں دی جاسکتی ایک زمانہ تھا کہ مولانا کی تحریر میں ثقیل اور غیر مستعمل فارسی اور عربی الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی علمی اصطلاحوں کے لئے جہاں اردو میں آسان الفاظ مل سکتے تھے، وہاں وہ عربی کے غیر متعارف استعمال کرتے وجہ یہ بھی کہ اس دور میں وہ اتحادِ اسلامی تحریک کے راہنما تھے اور چاہتے تھے کہ تمام اسلامی دنیا میں مشترک علمی اصطلاحیں استعمال ہوں آج معاملہ دگرگوں ہے اب وہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کو ایک خالص اسلامی رنگ دینے سے یہ ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی اور اس سے ملک کی دونوں قوموں کے درمیان تمدنی اختلاف کی خلیج اور وسیع ہو جائیگی چنانچہ اب وہ آسان زبان لکھتے ہیں اور بھاشا اور ہندی کے وہ الفاظ، جنہیں ماتی اُردو کی جان سمجھا تھا اور جن کا استعمال مولانا کے نزدیک اب تک ادبی کفر تھا کثرت سے استعمال کرتے ہیں بالجملہ مولانا کے تین اسالیب بیان ہیں۔ ایک تو وہ انشاپردازانہ رنگ جسے ان کے بعض معتقدین "مولانا کا مخصوص طرزِ تحریر" سمجھتے ہیں اور جسے انہوں نے تذکرہ کے آخری صفحات' یا سوانح سرمد' افسانۂ ہجر و وصال اور اس طرح کے دوسرے شاعرانہ رنگ کے مضامین میں برتا ہے اس طرزِ تحریر میں تصنع اور آورد اور شان خودنمائی بہت ہے کہیں کہیں بیرنگ خیال کے مصنف کا رنگ جھلکتا ہے یہ مضامین ایک ممتاز صاحب فن کی تحریر ہیں ان میں بھی ایک خاص انفرادی شان اور دلآویزی ہے لیکن انہیں میرا کی سادہ اور بے تکلف اُردو نثر سے وہی نسبت ہے جو سحر سامری کو اعجاز موسوی سے تھی مولانا کی تحریر میں سگانے کا جادو ہے (وہ دہلوی کہلاتے ہیں۔ لیکن نہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے نہ ہی ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس عروس البلاد میں گذرا)

آب حیات اور اردوئے معلیٰ کا طرز تحریر چونکہ اس قدر مختلف ہیں، کہ ان کا صحیح طور پر موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آزاد کی ایک اور یادگار ہے۔ جو اردوئے معلیٰ کی طرح مصنف کے ذاتی خطوط کا مجموعہ ہے۔ یعنی مکتوبات آزاد۔ اس میں کسی کسی صفحہ پر ایک آدھ فقرہ ایسا مل جاتا ہے۔ جو آب حیات، قصص ہند، اور دربار اکبری کا مصنف ہی لکھ سکتا تھا۔ لیکن ان مکتوبات کا غالب کے رقعات سے کیا مقابلہ؟ ؎

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت؟ خاک کو آسماں سے کیا نسبت؟

یہ صحیح ہے کہ آزاد نے جس کی ادبی زندگی کا ماحصل مکتوبات نہیں۔ بلکہ اردو نثر کی دوسری مستقل کتابیں تھیں، اپنے خطوط میں وہ جگر کاوی نہ کی ہوگی۔ جو مرزا نے بعض رقعات میں کی لیکن مکتوبات آزاد اور اردوئے معلیٰ کے موازنہ سے کم از کم فن مکتوب نویسی میں غالب کی غیر معمولی فوقیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک اور انشا پرداز جس کے طرز تحریر کا مرزا کی نثر سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ مولینا ابوالکلام آزاد ہیں۔ مولینا مہر لکھتے ہیں۔

"غالب کے بعد اس وقت تک جتنے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے ہیں میں نے قریباً سب کے مکاتیب دیکھے ہیں۔ دور حاضر کے اکثر اکابر اہل قلم سے بھی خط و کتابت کا شرف حاصل رہا۔ لیکن حضرت ابوالکلام آزاد کے سوا مجھے کسی بزرگ کے انداز تحریر میں غالب کی دلکش خصوصیات نظر نہیں آئیں۔ مولانا کے مکاتیب میں مزید دلچسپی اور افادہ کا پہلو یہ ہے کہ ان کا دائرۂ علم و فضل غالب کے مقابلے میں بہت وسیع ہے۔"

مولینا کے خطوط ابھی تک چھپ کر شائع نہیں ہوئے۔ اس لئے ان کی انہیں نثروں کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ جو زیور طبع سے آراستہ ہو گئی ہیں۔ مثلاً انکے وہ مضامین

کے لئے لکھے۔ اردو میں شاہ اسمٰعیل شہید کی تصنیف تقویۃ الایمان میں بھی شامل ہے حال میں مولینا ابوالکلام آزاد نے اس طرز کو بڑا فروغ دیا ہے +

سرا لیوں کا تیسرا طبقہ ان حضرات پر مشتمل ہے۔ جو یہ تو کسی کو اپنے زور انشا پردازی سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ناظرین کو انکسار اور حرص دیگر انہیں کسی ایک خاص راہ پر چلانا چاہتے ہیں ان کا مقصد محض صاف زبان میں اپنے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بہترین علما مثلاً شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یہی طرز تحریر اختیار کیا اور مغل بادشاہ اور دوسرے ارباب عمل جو لفاظی اور کھوکھلی انشا پردازی کی مضرتوں سے واقف تھے اُن کی تحریریں بھی سادگی اور سلاست کمال ہے اور تورک بابری تورک جہانگیری رقعات عالمگیری اس طرز تحریر کی بہترین مثالیں ہیں اس اسلوب تحریر میں مرکز عدرتہ اس امر کا ہوتا ہے کہ عبارت تصنیعی اور طرز بیان خشک یا عامیانہ نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں جہاں قصص وحکایات سے عوام اس قدر مانوس ہیں۔ کہ علمی اور تمدنی کتابوں میں بھی بجائے اُن پُرمعنی اور عمیق نکتوں کے جن سے واقفیت میں اضافہ ہو اور دل و دماغ کی تربیت ہو لطیفے اور قصے ڈھونڈے جاتے ہیں بعض خاص طور پر مہلک ہوتے ہیں لیکن کامیاب انشا پرداز ان عیوب سے بچ نکلتا ہے بلکہ ایسے معمولی کی عمدگی اور لطافت سے ان انشا پردازانہ خوبیوں سے جو اس کے اصل مقصد میں حارج نہیں ہوتیں اپنی تحریر میں ایسی رنگینی اور محبوبیت پیدا کر لیتا ہے جو معمولی ناظرین کو عمیانہ طرز تحریر کی مصنوعی انشا پردازی اور خطیبانہ طرز تحریر کے عامیانہ جوش و خروش سے کہیں زیادہ پسند خاطر ہوتی ہے حالی نے یہی طرز اختیار کیا اور اس کو اپنی ان خصوصی اور فنی خوبیوں کی مدد سے جن کا ہم گزشتہ اوراق میں ذکر کر چکے ہیں معراج کمال تک پہنچا دیا +

اور قابلیت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ فارسی کے کئی مشہور نثر نویسوں کی تحریر اسی قبیل سے ہے۔ سہ نثر ظہوری، غالب کی مہر نیم روز، اور کئی دوسری مشہور کتب میں یہ "منشیانہ" شان خود نمائی موجود ہے۔ اردو میں اس کی مثال مولوی غلام امام شہید کا مولود شریف، اور مرزا غالب کی بعض اپنی تقاریظ میں ملتی ہے۔ مولینا آزاد کو بھی اصولی طور پر اسی سکول سے متعلق سمجھنا چاہیے۔ ان کی تحریر میں تصنع اور آورد اور نمائش انشا پردازی کی کمی نہیں۔ لیکن انہوں نے کرنیل ہالرائڈ اور حالی کے ساتھ زمانہ گزارا تھا۔ وہ قدیم منشیوں کی بھونڈی کوششوں کے عیوب خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا طرز تحریر اختیار کیا جس کے نبھانے کے لئے اسی قدر زور دماغ صرف کرنا پڑتا۔ جس قدر انوار سہیلی اور تاریخ وصاف کے مصنفوں کو اپنے طرز تحریر میں لکھنے کے لئے لیکن اس سے انشا پرداز کا مطلب سمجھنے میں دقت نہ ہوتی۔ بلکہ عبارت میں ایک شاعرانہ حسن پیدا ہو جاتا۔ اور نثر دلآویزی میں شاعری کو شرمانے لگتی +

نثر نویسی کا دوسرا اسکول ان بزرگوں کا ہے۔ جنہوں نے نثر میں "خطیبانہ" روش اختیار کی ہے۔ ان کی تحریر میں اپنی لیاقت جتانے اور زور انشا پردازی دکھانے کی اتنی کوشش نہیں جتنی ناظرین کے خیالات اور اعتقادات بدلنے اور انہیں اپنے ہم خیال بنانے کی۔ اس طرز نثر نگاری میں فن خطابت کے اصول ملحوظ رہتے ہیں۔ چونکہ عوام کے معتقدات بدلنا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اس لئے الفاظ ثقیل اور تشبیہیں اور استعارے دشوار الفہم نہیں ہوتے۔ بیان میں جوش اور زور رہوتا ہے۔ تاکہ ناظرین متاثر ہوں۔ خطیبانہ طرز تحریر کو بالعموم ان مذہبی اور سیاسی راہنماؤں نے استعمال کیا ہے۔ جو اس کی مدد سے اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ فارسی میں اس طرز تحریر کی ایک نمایاں مثال حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ان مکتوبات میں ملے گی۔ جو انہوں نے اپنے زمانے کے امرا یا دوسرے بااثر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے

بہت مشکل نہ تھا۔ ہم آبِ حیات کی بعض خوبیوں اور اردو ادب میں اس کی تاریخی اہمیت کے قائل ہیں اور آزاد کو اردو زبان اور ادب کے سب سے بڑے محسنوں میں سے گنتے ہیں یہ کتاب صحیح معنوں میں اُردو شعرا کے لئے آبِ حیات ثابت ہوئی۔ اور اس نے اُردو شاعری کی تاریخ اور مشہور اُردو شعرا کے حالات کو اس قدر دلچسپ طریقے سے پیش کیا کہ چھوٹے بڑے اسے مزولے لے کے پڑھتے ہیں، اور اس کی بدولت عام اُردو دان، اردو شاعری کی مشہور شخصیتوں سے خوب واقف ہیں۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اپنی کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے آزاد نے واقعات کی صحت کا خاص خیال نہ رکھا۔ ان واقعات کو زیادہ اہمیت دی جو غلط ہوں یا صحیح، دلچسپ ضرور ہوں، اور بیان کی دلچسپی کے لئے بعض ایسے واقعات بھی گھڑ لئے جن کی تصدیق کسی تاریخی کتب سے نہیں ہوتی، اور بعض اہل تحقیق کے خیال میں مصنف کے اپنے نگارخانہ دماغ کی تخلیق ہیں۔ مرزا غالب کے حالات میں اس قصہ آفرینی اور مصنوعی دلچسپی کی گنجائش نہ تھی۔ انہیں اپنے گردوپیش کے عام واقعات میں رنگ بھرنا تھا۔ اور یہ ان کی انشا پردازی کا کمال ہے کہ حقیقت سے روگردانی کئے بغیر انہوں نے ان واقعات کو اس ڈھب سے بیان کیا ہے کہ دلچسپی اور نشاط انگیزی میں اُردوئے معلّٰی آبِ حیات سے ہرگز پیچھے نہیں ہے۔

اس کے علاوہ طرزِ تحریر کا فرق ہے۔ آزاد کی تحریر میں تصنع ہے آورد ہے۔ مرزا کی تحریر کی طرح سرسری اور سادہ نہیں۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں فارسی اور اُردو نثر کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں نثر نویسی کے تین مختلف اسکول ہوئے ہیں۔ ایک وہ انشا پرداز جنہوں نے نثر نویسی میں مسجع کاری، رنگ آمیزی اور دماغی کی بڑی کوشش کی ہے۔ انہوں نے عبارت کو مقفٰی اور مسجع بنا کر، یا پُرشکوہ اور غیر مانوس الفاظ کی مدد سے، مانیاں میں مصنوعی آفرینی اور نازک خیالی پیدا کر کے اپنی تحریر کو آب و تاب دی ہے۔ اور ایسی انشا پردازی

لیکن خوبی یہ ہے۔ کہ اس تلخ گوئی بلکہ بے مروتی میں بھی ایک حسن ہے۔ شوخی ہے، بانکپن ہے۔ مکتوب الیہ کو تو اس کی درخواست کی تکمیل سے انکار، یا اس کے طریق کار پر حرف گیری ناپسند ہوگی۔ لیکن بے انصافی ہے۔ اگر وہ زبان و بیان کی ان خوبیوں کی قدر نہ کرے۔ جو ان خطوط کو ممتاز کرتی ہیں!

اردو نثر میں خطوطِ غالب کا مرتبہ

غالب کے خطوط کو لکھے ایک زمانہ ہوتا ہے۔ اس طویل مدت میں اردو ادب اور اردو زبان نے بڑی ترقی کی ہے۔ بڑے بڑے اہلِ قلم نے اپنے نتائجِ طبع سے اس زبان کو مالا مال کیا ہے۔ اور اب زبان میں اتنی لچک اور وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ کہ طرح طرح کے خیالات اور علمی مضامین آسانی سے اس زبان میں ادا ہو سکتے ہیں۔ لیکن زبان اور ادب کی اس ترقی کے باوجود کہنا پڑتا ہے۔ کہ مرزا جیسا انشا پرداز، جو روزمرہ کے معمولی واقعات کو اس خوبی اور صفائی سے بیان کرے، کہ ان میں افسانے کی دلچسپی اور عاشقانہ اشعار کی دلآویزی نظر آنے لگے، ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔

خالص انشا پردازانہ نقطۂ نظر سے مولانا محمد حسین آزاد کا مرتبہ سب سے بلند تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور یہ صحیح ہے۔ کہ اردو ادب کو انمول موتیوں سے بھرنے اور "گیسوئے اردو" کی "شانہ کشی" میں جس طرح انہوں نے خونِ جگر کھایا ہے۔ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کی محنت سے چمنِ اردو میں رنگا رنگ کے ایسے خوشبودار پھول آئے ہیں، جن کی مہک جب تک یہ گلستان قائم ہے، برقرار رہے گی۔ لیکن طبعِ انصاف کو یہ بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ اگر آبِ حیات کی دلچسپی اور دلآویزی اردوئے معلّٰے سے زیادہ ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ بطور ایک انشا پرداز کے غالب کا پلّہ آزاد سے ہلکا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اردوئے معلّٰے روزمرہ کے معمولی واقعات کا بیان ہے۔ اور آبِ حیات کا موضوع ہی ایسا شگفتہ اور دلپسند تھا۔ کہ اسے دلچسپ بنانا

کا بھی وعدہ ہے ماشاءاللہ اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس
منظور ہو مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو مانو اور کتاب حامل رقعہ ہذا کو دے دو تو تم پر آفریں۔"

مکاتیب غالب کے مطالعہ سے بعض لوگوں کو خیال ہو گیا ہے کہ مرزا کو تالیف قلوب کا بڑا پاس
تھا۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کہتے تھے جس سے کسی کا دل دکھے۔ ایک حد تک تو یہ رائے صحیح ہے
مرزا ملک بامروت اور نیک دل انسان تھے۔ دوسروں کا دل دکھا کر انہیں خوشی نہ ہوتی تھی لیکن وہ
دل کے کھرے تھے۔ اگر انہیں کسی کی کوئی ادا ناپسند ہوتی یا کوئی امر خلاف طبع ہوتا تو وہ بلا
تکلف ملمع کاری سے کام نہ لیتے بے تکلف اپنے دلی خیالات کا اظہار کر دیتے تھے۔ ہم نے جو دو
خطوط اوپر نقل کیے ہیں ان سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اس صاف گوئی بلکہ تلخ گوئی
کی کئی اور مثالیں غالب کے خطوط میں ملیں گی۔ ایک خط میں حکیم احمد حسن کو لکھتے ہیں۔

"صاحب آپ کی خدائی کا عالم تو مر لیا، کثرت احکام، تواتر ورود اشعار، پھر یہ محال
کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو۔۔ غزلیں آپ کی رسی ہیں کہاں تک دیکھوں
آپ کی غزلوں کے ساتھ دوسری غزلیں بھی گم ہو جاتی ہیں۔"

مرزا کے عزیز اور سعادتمند شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ دوسرا دیوان چھپوانے کی فکر میں ہیں۔
انہوں نے مرزا سے "دیباچہ و تقریظ" کی فرمائش کی ہے۔ انہیں اس فرمائش کی تعمیل مشکل معلوم ہوتی
ہے تفتہ کو صاف صاف لکھتے ہیں۔

"صاحب، دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا
کچھ مدد پر جواب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یونہی جی چاہتا ہے تو ابھی کچھ دن
اور تحمل کر دیکھو لیا اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے تم تو دو چار برس میں
ایک دیوان کہہ لو گے میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا!"

نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہے۔ تو گویا ڈگی سنگھ جی کی تعریف بھی حضور سے ہوگی۔ ہندوستانی عملداری میں وہ ایک رعیت دار مالگزار تھا۔ اب گورنمنٹ ہند نے اس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خاں رئیس ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی! "یک در گیر و محکم گیر" اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم۔ تو آخر رعیت تو ہو۔ یہ کیا کہ اپنے پادشاہ کا ذکر غائب سے نیچے لکھتے ہو۔ کبھی صفحہ پر کبھی حاشیہ پر؟ ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمہارا اخبار موقوف کیا ہے۔ اور اب پھر نہیں لکھتے ہیں۔ کہ دہائی خدا کی! میں یکم جنوری ۱۸۶۸ء سے "دبدبۂ سکندری" کا خریدار نہیں ہوں۔ نہ بھیجا کرو۔ واسطے خدا کے! نہ بھیجا کرو۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں ؟"

بھلا اس سے زیادہ اور کوئی کیا لکھ سکتا تھا!!

حکیم تفضل حسین خاں کے نام جو خط' طلب دیوان کے لیے' لکھا ہے۔ وہ بھی اسی قسم کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ مرزا نے اپنا دیوان مکمل کرنے کے لیے' اس کا جو نسخہ حکیم صاحب کے پاس تھا' ان سے طلب کیا۔ انہوں نے بھیجنے میں تامل کیا' مرزا کو غصہ آگیا۔ اس "شانِ جلالی" کا اظہار ہے :-

"کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی' سب پر پانی پھر گیا۔ اگر کوئی ہزار یا سو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے۔ میرا کلام خرید آٹھ دس روپیہ کی' سو وہ بھی میں یہ نہیں کہتا۔ کہ تم مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک ہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں' پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اسکی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو' میرا اعتبار نہیں۔ یا مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل منظور ہے۔ وہ کتاب میرے آدمی

مندرجہ بالا اقتباسات سے ہی مرزا کے زورِ قلم اور ملکۂ انشا پردازی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک نہایت عام بلکہ عامیانہ صورتِ حالات کو انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ نثر شاعری سے زیادہ دلآویز ہو گئی ہے اور سیدھے سادے، عام گفتگو کے الفاظ میں طوفانی موسم کی ایک ایسی تصویر کھنچ گئی ہے جو مکتوب نگار اور اہالیانِ دہلی کی مشکلات کو بھی پوری طرح واضح کرتی ہے اور پڑھنے والے کو بھی مزا دیتی ہے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں: "معلوم ہوتا ہے کہ مرزا لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو" بیشتر خطوط کی نسبت یہ رائے صحیح ہے لیکن غالب کی بلند پایہ انشا پردازی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن خطوط میں مکتوب الیہ کو خوش کرنے کی کوئی کوشش نہیں بلکہ اس کا دل جلانا مقصود ہے ان میں بھی ایک خاص طرح کا لطف اور بانکپن ہے۔

مثال کے طور پر ان کا وہ خط ملاحظہ ہو جو انہوں نے مدرسہ سکندری بند کراتے وقت مولوی محمد حسن خان مالک مطبع حسنی کو لکھا۔

"مشفقی اور مکرمی محمد حسن خان صاحب کو غالب آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کبھی اخبار آپ کے پھیرے، کبھی خط آپ کے پھیرے۔ اور آپ اخبار بھیجتے چلے ہیں۔ الٰہی! آپ کا خط خط تھا یا کوئی جھوٹ کی پوٹ۔ حقیر مدلل کی سی ٹر اور جو کچھ کہ اس میں آیا وہ غلط اور دروغ اور کھوٹ۔ یہ غلط محض ہے کہ مطبع حضور کا ہے اور تم مہتمم ہو، حضور کی طرف سے الحذر الحذر! ڈگی جے سنگھ کی تعریف میں کہیں سارا اک صفحہ کہیں سارا ایک صفحہ سیاہ کرتے ہو اور اپنے والیٔ ملک اور اپنے بادشاہ یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خان بہادر کے نام کے آگے نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کے لکھتے ہو، بس اور اس قباحت کو

جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی تارے اگر دکھائی دیتے ہیں تو لوگ جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار جگہ کسی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے سیکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ مختصر۔ وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا۔ اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے دانے بہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے۔ سُن لیا دلّی کا حال؟"

انہی کو دو مہینے بعد لکھا ہے :-

"برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا وہ گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنیاں ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں۔ قلمدان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا۔ کہیں چلمچی دھری ہوئی خط لکھوں کہاں بیٹھ کر؟"

نواب علاء الدین کے نام ایک خط میں لکھا ہے :-

"میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں۔ ہائے دبی! ہائے مری! دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔ اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں۔"

دہلی کے مصوص محاورے جا دبیجا صرف کرکے رنگینیٔ بیاں میں مدد لی یا جھوٹے سچے لطیفے جمع کرکے خشک اور بے کیف عبارت کو دلچسپ بنا لیا تا ناظرین کے جذبات کو حرکت دے کر اور ان کی قوت متخیلہ کو مشتعل کرکے ان سے خراج تحسین وصول کیا۔ مرزا غالب نے یہ کبھی نہیں کیا لیکن انکی نثر میں ایسی لسانی اور فنی خوبیاں موجود تھیں جنھوں نے انہیں اُردو کا بہترین انشاپرداز بنا دیا تھا بے تکلف دوستانہ خطوط میں حُسن پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مراسلہ نگار قوت انتخاب اور قوت مشاہدہ رکھتا ہو۔ جو روزمرہ کی معمولی باتوں میں بھی وہ چیزیں ڈھونڈ نکالے جو دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں اسے قوت متخیلہ سے پوری طرح متصف ہونا چاہئے تاکہ عام باتوں کے دلچسپ اور پرلطف پہلو بھی اسے نظر آجائیں اور وہ انہیں تمثالوں اور تشبیہوں سے اور بھی دلآویز بنا دے موزوں اور موثر الفاظ کا ذخیرہ بھی اس کے پاس وافر ہونا چاہئے تاکہ ہر ایک خیال کو صحیح طور پر ادا کر سکے اور انتخاب الفاظ کا بھی اسے صحیح ملکہ ہو تاکہ معمولی باتوں کا بیان اس طرح کرے کہ اسے پڑھ کر لطف حاصل ہو۔

مرزا غالب میں یہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ اور ان کے علاوہ ان کی فطری شوخی اور ظرافت سونے پر سہاگہ، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہایت معمولی باتوں کو انہوں نے اس دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا پہروں وجد کرتا ہے مثال کے طور پر ایک دو خطوط ملاحظہ ہوں جو انہوں نے ۱۸۶۲ء کی برسات کے متعلق مختلف دوستوں کو لکھے میر مہدی کو لکھتے ہیں:۔

برسات کا نام آگیا لو پہلے تو مجملاً سنو ایک غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کا ایک آفت وبائی ایک مصیبت کال کی اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح گاہ گاہ نظر آتا ہے

وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ جن حضرات نے مرزا کے خاص طرز مراسلت نگاری یعنی، القاب و آداب کے اختصار اور بے تکلف انداز بیان کی پیروی کی ہے۔ وہ اس میں کامیاب نہیں رہے۔ وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ اگرچہ القاب و آداب کا ترک کرنا اور غیر رسمی اور بے تکلف طریق خطاب اختیار کرنا آسان ہے۔ لیکن اس کا نبھانا اور اس میں دلآویزی پیدا کرنا بڑا مشکل ہے۔ غالب کے مقلدین عموماً دو مختلف عیوب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے بے تکلف طرز اظہار پر زیادہ توجہ کی ہے۔ ان کے خطوط میں عامیانہ پن اور بے کیفی پیدا ہو گئی ہے۔ اور جنہوں نے اس سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور آورد نمایاں ہے۔ مرزا کا طرز تحریر صحیح معنوں میں سہل ممتنع ہے۔ دیکھنے میں آسان اور پوری طرح اختیار کرنے میں مشکل۔ بے تکلف انداز بیان اسی انشا پرداز کا کامیاب ہو سکتا ہے۔ جس کی اپنی شخصیت اس قدر شگفتہ اور بوقلموں ہو۔ کہ اُس کا بے تکلف اظہار اور انشا پرداز کے عام خیالات اور اس کی زندگی کے عام واقعات کا بیان دلچسپ اور دلآویز ہو۔ یہ بات غالب کے مقلدین کو حاصل نہیں۔ اس لئے ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔

مرزا کو ان کے مقلدین پر جو فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں۔ کہ مرزا کی شخصیت ان کی نسبت شگفتہ اور ہمہ گیر تھی۔ بلکہ دوسری اہم وجہ یہ ہے۔ کہ مرزا بطور انشا پرداز کے ان سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہیں۔ عام روزمرہ کے واقعات کو دلچسپ بنانے کے لئے ہماری انشا پردازی کے مروجہ حربے کام نہیں آتے۔ اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ موٹے موٹے فارسی عربی الفاظ سے عبارت کو پرشکوہ بنا لیا، یا اساتذہ کے اشعار اور

شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور ظاہر وحید یہ سب نثر میں کہیں حرف حکمت
لکھا کرتے تھے اور وہ سب طرح کی نثریں مولانا ولمانی سنگھ بیدل متوفی نے تقلید اہل ایران کی
میں رقم فرمایا کرتے۔

مرزا کے نثر نویسی کے متعلق تحقیق کا نقطۂ نظر جو اصولاً صحیح تھا قبول نہ کیا لیکن جب وہ ۱۸۵۰ء
میں تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے اور ان کے پاس اس قدر وقت نہ رہا جو فارسی
مکاتب جنہیں وہ بڑی محنت اور جگر کاوی سے لکھا کرتے تھے۔ کے لکھنے کے لئے کافی ہو
اور ساتھ ہی بڑھاپے کی وجہ سے وہ اس کاوش اور دماغ سوزی کے قابل نہ رہے تو انہوں نے
اُردو میں مراسلت نگاری شروع کی۔ اور اس زبان میں وہ بے تکلف طرز تحریر استعمال کیا
جو عام گفتگو میں کام آتا تھا اور جس کے لئے اس قدر محنت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ منشی تفتہ
کو لکھتے ہیں۔

در فارسی زبان لسانی گفته ام و سر نامه ها نگاشته اکنون که دل و ناتوانی سگالش
نمی تابد کار سخن آسان کرده ام و هر چه می باید نوشت در اردو می نویسم گوئی گفتار
در نامه فرو می آیم ... دوست می نویسم ... سخن ... گنجائی نیست
... آنچه ... بر زبان می آید ... نوشته میشود۔

مرزا نے اُردو میں سادہ اور بے تکلف طرز تحریر کسی ادبی اصول کے تحت نہیں بلکہ اپنی
مجبوریوں کی وجہ سے شروع کیا تھا اور ابتدا میں اس کا ذکر بڑی معذرت کے ساتھ کیا کرتے تھے
لیکن جب یہ طرز تحریر کامیاب ہو گیا اور ان کی طبع خداداد نے اس میں ایسی ایسی رنگینیاں
پیدا کر دیں کہ خاص و عام کو یہ انداز پسند آیا تو وہ اس طرز تحریر پر فخر کرنے لگے اور اسے
خاص اپنی ایجاد قرار دیتے چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں مرزا صاحب میں نے

اسی طرح نواب سورت کے نام جو پہلا خط لکھا ہے۔ وہ بھی ثقیل فارسی الفاظ و تراکیب سے بھرا ہُوا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"سبحان اللہ تعالےٰ شانہٗ اعظم برہانہٗ۔ جناب مستطاب نواب میر غلام بابا خاں بہادر سے بتوسط میاں داد خاں صاحب شناسائی بہم پہنچی۔ لیکن داد اول ساغر دُردی۔ کیا جگر خون کن اتفاق ہے۔ پہلا عنایت نامہ جو حضرت کا مجھ کو آیا۔ اُس میں خبر مرگ۔ اب جو میں اسکا جواب لکھوں۔ اور یہ میرا پہلا خط ہوگا۔ لامحالہ مضامین ماندہ انگیز ہوں گے۔ نہ نامۂ شوق نہ محبت نامہ صرف تعزیت نامہ۔ سر بریتیم ماتمیوں کے تینوں کا حرف دستی ہے جو لفظ نکلا وہ سیاہ پوش ہے۔"

لیکن ایسے خطوط کی تعداد جن میں یہ تکلف اور آورد اور فارسی الفاظ و تراکیب کی فراوانی ہو۔ بہت نہیں۔ جُوں جُوں مرزا کا طرزِ تحریر پختہ ہُوا۔ اور انہوں نے دیکھا۔ کہ سلیس اُردو میں کیا کیا گلکاریاں ہوسکتی ہیں۔ تو فارسی تراکیب کی کثرت بھی جاتی رہی +

غالب نے مرزا علی بخش کی استدعا پر جو فارسی رسالہ ۱۸۲۵ء میں فارسی مکتوب نویسی کے متعلق لکھا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے۔ کہ خط و کتابت کے متعلق ان کا شروع میں ہی ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ اور وہ چاہتے تھے۔ کہ مکتوب نویسی میں وہی زبان استعمال کی جائے جو گفت و شنید میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "نامہ نگار را باید کہ نگارش را از گزارش دور تر نہ بُردہ بنشتن را رنگ گفتن دہد"۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے فارسی خطوط میں اس نقطۂ نظر کی پوری طرح پیروی نہیں کی۔ اور فارسی مکتوب نویسی میں وہی رسمی طرزِ تحریر استعمال کیا۔ جو ان کے زمانے میں مروج تھا۔ اور جس پر ان کے بیشرو کار فرما تھے۔ چنانچہ وہ قتیل کی سلیس فارسی نثر پر نکتہ چینی کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:۔

"تقریر ایلد ہے۔ تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط سے اور

اور بے تکلف دوستوں کے لئے انہوں نے وہی مختصر القاب استعمال کئے ہیں جو حالی نے مفصلاً سطروں میں گنائے ہیں لیکن ذی مرتبہ حضرات کے لئے، بالخصوص جن سے ان کی بے تکلفی نہ تھی، انہوں نے القاب اور آداب کا پورا خیال رکھا ہے، نواب میر غلام بابا خاں رئیس سورت کے اکثر خطوں کو "نواب صاحب، جمیل المناقب عمیم الاحسان سلامت" لکھ کر شروع کیا ہے۔ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام جتنے خط ہیں قریباً سب کا آغاز "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت" سے ہوتا ہے۔ دوستوں میں بھی حفظِ مراتب کا پورا خیال تھا، چنانچہ منشی غلام غوث بیخبر کے نام کے خطوط "قبلہ"، "پیر و مرشد"، "حضرت" یا اس طرح کے دوسرے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ نواب انور الدولہ سعد الدین شفق کو اکثر "پیر و مرشد"، "خداوند نعمت"، "قبلہ حاجات" لکھ کر یاد کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اگر خطوطِ غالب کی مقبولیت کا باعث یہی بے تکلف طرزِ تحریر ہوتا تو اس کی تقلید بڑی آسان تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ اردو کے بعض مشہور انشا پردازوں نے غالب کے اس طرزِ نامہ نگاری کی پیروی کی ہے اور القاب و آداب کو بے حد مختصر کر دیا ہے لیکن ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں اور ان کے خطوط میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی جو اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی کے معمولی رقعوں میں ہے۔

غالب نے جس طرح القاب و آداب دوستانہ خطوط میں مختصر کر دئے تھے اسی طرح طرزِ تحریر بھی نہایت بے تکلف اور سادہ استعمال کیا تھا۔ ویسے اس میں بھی حفظِ مراتب، اور موضوع کی محدودیت کا خیال رہتا۔ علمی مسائل کی توضیح کے لئے یا ناواقف نامہ نگاروں کے جواب میں جو خط گئے ہیں ان میں فارسیت زیادہ ہے۔ اور ذی علم اور ذی مرتبہ حضرات کے نام کے خطوط میں بھی زیادہ تکلف روا رکھا گیا ہے، مثلاً مفتی سید محمد عباس اور مولوی عبد الرزاق شاکر کے نام جو خطوط ہیں ان میں وہ بے تکلفی نہیں جو مرزا کے خطوط کی عام خصوصیت ہے۔

غالب کے خطوط آج سے اسّی نوے ۹۰ سال پہلے لکھے گئے۔ لیکن ان کی مقبولیت اور دلآویزی کا وہی عالم ہے۔ جن اصحاب کے نام وہ خط لکھے گئے وہ چل بسے۔ جن حالات اور واقعات کا اُن میں ذکر ہے۔ وہ اب خواب و خیال ہو گئے۔ لیکن پھر بھی ان خطوط کی تازگی اور دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ ان خطوط کی بدولت وہ اشخاص جن کے نام یہ لکھے گئے۔ یا جن کا ان میں تذکرہ ہے۔ ادبِ اُردو میں مستقل جگہ پا گئے ہیں۔ اور ہم انہیں اسی طرح جانتے ہیں جس طرح اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو۔ خطوطِ غالب کی دلپسندی اور ان کی ہر دلعزیزی کا آج بھی یہ حال ہے۔ تو ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کی خصوصیات اور ان خوبیوں کو بے نقاب کیا جائے۔ جن کی وجہ سے ان کی دلپسندی اور مقبولیت میں فرق نہیں آتا۔

مرزا غالب کی اُردو اور فارسی شاعری کو قبولیت عامہ حاصل کرتے دیر لگی۔ لیکن ان کے اُردو خطوط نے فوری شہرت حاصل کی۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ تھا۔ جو فی الواقع سب سے نرالا تھا۔ مولینا حالی لکھتے ہیں:-

"انہوں (مرزا) نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور دُور از کار تھیں۔ سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

مولینا حالی کا بیان صحیح ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ خطوطِ غالب کی مقبولیت کی وجہ صرف یہی نیا طرزِ مکتوب نگاری ہے۔ کیونکہ ایک تو مرزا نے سب خطوں میں القاب و آداب ترک نہیں کئے۔ وہ خط لکھتے وقت مکتوب الیہ کے مرتبہ اور اپنے تعلقات کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے۔ اپنے شاگردوں

وہ صرف ممکن الوقوع سمجھتے ہوں گے اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں جو فرق ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے پہلے کی نسبت بعد میں بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے ٭

غالب کے رقعات خواہ کن حالات کے ماتحت لکھے گئے ہوں ان کی اہمیت بہت ہے تاریخی نقطۂ نظر سے غدر کے بعد دہلی میں جو ساماں ہوا تھا اس کی صحیح اور موثر داستاں انہی خطوط میں ملتی ہے۔ مکتوب نویسی میں بھی ان خطوط نے ایک نیا معیار قائم کر دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ اگر اس طرح کے خطوط لوگوں کی نظر کے سامنے نہ آتے تو اُردو نظم نے جہاں فارسی نظم کی پیروی کی تھی وہاں اُردو خطوط بھی رقعات بیدل اور انشائے مادھو رام کے طرز پر لکھے جاتے۔ علاوہ ازیں اُردو نثر کی تاریخ میں ان مُنشئات کا مرتبہ بہت بلند ہے بیشک اس سے پہلے کلکتہ کالج میں کئی ایک کتب مقفیٰ اور مسجع عبارت سے عاری شائع ہو چکی تھیں۔ لیکن نثر کا مستقبل فورٹ ولیم سے نہیں بلکہ دلّی سے وابستہ تھا۔ یہاں بھی دہلی کالج کے سلسلے میں صاف اُردو میں چند کتابیں شائع ہوئی تھیں لیکن وہ محض ترجمے تھے اور ادبی نقطۂ نظر سے بے وقعت۔ یہاں جو رنگ مقبول تھا اس کا نمونہ مولوی امام بخش صہبائی کے مضامین میں یا آثار الصنادید کے باب چہارم میں ملتا ہے بیشک اس طرز تحریر کو اختیار کرتے وقت عبارت آرائی اور قافیوں اور تشبیہوں کی تلاش میں انشا پرداز کو بہت محنت کرنی پڑتی لیکن نتیجہ فقط یہی کہ اصل مطلب پر ثقیل تر پردے پڑ جاتے غالب نے دہلی کی زبان کو تحریر کا جامہ پہنایا۔ اور اس میں اپنی ظرافت اور موثر طرز بیان سے وہ گلکاریاں کیں۔ کہ اُردوئے معلےٰ خواص و عوام کو پسند آئی۔ اور اُردو نثر کے لئے ایک طرز تحریر قائم ہو گیا جس کی پیروی دوسروں کے لئے لازم تھی ٭

اور اپنے اندراجات کو مکمل کرنے کے لئے درج کتاب کر دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان ہنگامی اشعار کی بنا پر مرزا کی شاعری کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا۔

غالب کے اُردو خطوط غدر کے بعد مرزا نے گاہے گاہے اُردو فارسی غزلیں، اور ضرورت کے وقت فارسی قصیدے اور قطعے لکھے۔ لیکن اس زمانے کی بہترین یادگار ان کے اُردو خطوط ہیں۔ جو عودِ ہندی۔ اردوئے معلےٰ اور مکاتیبِ غالب، تین مختلف مجموعوں میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اور اب منشی مہیش پرشاد کی محنت اور کوشش سے زیادہ صحت اور حسنِ ترتیب کے ساتھ یکجا شائع ہو رہے ہیں۔

غالب کے خطوط کی نسبت عام طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ وہ سب کے سب بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں۔ اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو یہ سان گمان نہ تھا۔ کہ کبھی ان کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے۔ ان کے بارے میں تو یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن بعد کے خطوط کے متعلق نہیں۔ اخیر ۱۸۵۸ء میں جب منشی شیو نرائن نے مرزا کو اُردو رقعات چھپوانے کے لئے کہا۔ تو انہوں نے ۱۶ر نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں اس کی مخالفت کی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "اُردو کے رقعات بھی جو آپ چھپایا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا۔ جو مَیں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔"

اسی سلسلے میں انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہؔ کو بھی لکھا "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے۔ تو مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد جو رقعات مرزا نے لکھے ہوں گے۔ اُن کی اشاعت کو

اسی طرح اُردو کے کئی اشعار ہیں جو دیوانِ غالب کی چوتھی اشاعت میں نہیں۔ ان میں بعض تو بعد میں لکھے گئے۔ بعض (مثلاً مدد کے متعلق قطعہ) کی دیوان میں شمولیت مرزا نے مناسب خیال نہ کی ہوگی اور چند ایک دیوان مرتب کرتے وقت مرزا کے پیشِ نظر نہ ہوں گے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ارمغانِ غالب میں مرزا کا سب غیر مطبوعہ اور غیر متداول اُردو کلام، جو اُنھوں نے خود مسترد نہیں کیا، یکجا کر دیا جائے۔ لیکن عجب نہیں کہ بعض چیزوں تک ہماری رسائی نہ ہوئی ہو۔ مادر خطوطِ غالب اور تکمیل شرح کلامِ غالب میں جس طرح غالب کے نام، زمانہ حال میں لکھے ہوئے رقعات اور غزلیں منسوب کی گئی ہیں ان کے پیشِ نظر اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ غالب کا غیر مطبوعہ کلام، اصلی تسلیم کرتے وقت اس پر کڑی نظر ڈالی جائے لیکن غیر مطبوعہ کلام کا اب بھی دستیاب ہو جانا ناممکن نہیں۔ لال قلعہ کی ایک جھلک میں سید ناصر نذیر فراق، قلعہ کی ایک ملازمہ کی زبانی کہتے ہیں "جب میاں غلام نظام الدین (ابن میاں کالے صاحب) کا بیاہ ہونے لگا تو مرزا نوشہ نے ایسا سہرا لکھا جو ولیعہد کے سہرے سے اچھا تھا مگر میں بھول گئی۔ دو ایک شعر یاد رہ گئے ہیں وہ سنائے دیتی ہوں" ؎

جس طرح تک معصوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا چاند کا دائرہ لے زہرا لے گا یا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں باندھنے کے لئے اٹھایا سہرا

میاں کالے صاحب کے ساتھ مرزا کے تعلقات کو دیکھتے ہوئے یہ حکایت چنداں مستبعد معلوم نہیں ہوتی اور ممکن ہے کہ کسی معاصرانہ تذکرے میں یہ سہرا مل جائے۔

مرزا نے اس رسالے کی جن لاتعداد فارسی غزلیات کو اپنے خطوط میں درج کیا ہے وہ تو شاعرانہ نقطۂ نظر سے مرزا کے بہترین کلام کے ہم پایہ ہیں لیکن اس رسالے کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں، جو مرزا کے عام معیار شعر سے گرے ہوئے ہیں ہم نے انہیں ترک کا

اس نسخہ کی بنا پر دیوان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ۱۸۶۱ء میں اردو دیوان کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی، دہلی سے اور جون ۱۸۶۲ء میں جو تھا ایڈیشن مطبع نظامی، شہر کانپور سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن نسخہ رام پور کے مطابق ہے۔ لیکن چوتھی اشاعت میں چھ اشعار کا اضافہ ہوا۔

فارسی دیوان ۱۸۴۵ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد کئی فارسی قصائد اور غزلیات لکھی گئیں۔ ان سب کو نواب ضیاء الدین نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا۔ اور ۱۸۶۳ء میں کلیاتِ نظم فارسی شائع ہوئی۔ لیکن اس میں سے بعض چیزیں رہ گئی تھیں۔ اور بعض بعد میں اضافہ ہوئیں۔ مرزا نے انہیں کلیات میں شامل کرنے کے بجائے اگست ۱۸۶۷ء میں سبدِ چین کے نام سے ایک علیحدہ کتاب شائع کی +

ان مجموعوں کی ترتیب و اشاعت کے علاوہ، ستمبر ۱۸۶۶ء میں مرزا نے نواب کلب علیخاں کی فرمائش پر اپنے اردو اور فارسی کلام کے دو انتخاب مرتب کئے تھے۔ ان دونوں کا مجموعہ اب انتخابِ غالب کے نام سے کتبخانۂ رام پور کی طرف سے شائع ہوا ہے +

ان دواوین کی اشاعت سے مرزا کو اپنی زندگی میں ہی اپنا کلام بہ طریقِ احسن منضبط اور مدوّن کرنے کا موقع ملا لیکن اب بھی ان سے باہر کئی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک فارسی قطعہ تذکرۂ غوثیہ میں درج ہے۔ جو نہ کلیات میں ہے۔ نہ سبدِ چین میں۔ بہادر شاہ کے ایما پر مرزا نے جو فارسی مثنوی، بادشاہ کے عقائد کی توضیح میں لکھی۔ وہ بھی اگر ایک نثری نوٹ کے ساتھ شائع ہو جائے۔ تو نامناسب نہ ہو۔ اسی طرح مرزا نے اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر عربی مثنوی دعاء الصباح کا فارسی اشعار میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ بھی کلامِ غالب کے مجموعوں میں نہیں[1] +

[1] مولوی امتیاز علی عرشی نے نگار۔ لکھنؤ، بابت مئی ۱۹۴۱ء میں اس مثنوی کو ایک فاضلانہ نوٹ کے ساتھ شائع کرایا ہے۔

ان کے درباری دور کے اشعار سے متشابہ ہیں۔ کلام میں سادگی اور شوخی ہے اور تلمیحات اور
دُور از کار تشبیہات کی بھرمار نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دیوانِ والی اُن تک پہنچ
گیا تھا اور دیوانِ حافظ کو بھی انہوں نے زیادہ توجہ کی نظر سے دیکھا۔ سبدِ چین میں کم از کم تین
غزلیات ایسی ہیں جن میں حافظ کی طرف اشارہ ہے اور ایسی غزلیات بھی متعدد ہیں جن کی
بحریں اور لفظوں کی ترتیب اور خوش آہنگی والی کی یاد دلاتی ہے ؎

اے خداوند خرد مند جہاں داور دانا — دے بہ پیرایشِ حرم برہمہ کردار توانا
بہ ادا پایہ فزایا، بہ نظر عقدہ کشایا — بہ کرم ارز عطایا، بعصب برق سماما
بہ نگہ خستہ نوازا، بہ سخن مدلہ طرازا — بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشایا

ایک اور فارسی غزل کی ردیف اور بحر بڑی دلچسپ ہے ؎

بازرس عاشق دائم تساما پایا ہو — ناظر حسن معاتم تساما پاما ہو

مرزا کی یہ جدت طرازیاں فارسی تک ہی محدود نہ تھیں انہوں نے امیر کلب علی خاں
کی تعریف میں جو دو اُردو قطعے اور نواب علاءالدین کے ایما پر جو اُردو غزل لکھی ہے وہ بھی بحر و
قافیہ کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ان دنوں کہن سالی اور خرابی صحت
کی وجہ سے تلاشِ مضمون میں تو بہت محنت نہ کر سکتے تھے اس لئے الفاظ کی تراش خراش
اور اشعار کی عروضی خصوصیات میں جدتیں پیدا کر کے دلچسپی بہم پہنچاتے رہے +

اسی زمانے میں مرزا نے اپنے اُردو اور فارسی کلام کے نئے ایڈیشن شائع کئے۔ اور
اپنی تصانیف کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ اُردو دیوان دو مرتبہ غدر سے پہلے ۱۸۴۱ء اور
۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد بہت سے اُردو اشعار درباری دور میں لکھے گئے
ان سب کا مجموعہ ۱۸۶۱ء میں نواب یوسف علی خاں کے لئے مرتب ہوا اور مرزا نے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

اِن پری زادوں سے لینگے خُلد میں ہم انتقام　　قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

پانچواں دَور کلامِ غالب کی پہلی تاریخی تدوین کرتے وقت ہم نے ان اشعار کو جو غدر کے بعد لکھے گئے باقی اشعار سے علیحدہ ترتیب دیا تھا لیکن اشعار کی تعداد تھوڑی تھی۔ اس لئے ہم نے ان کی بنا پر ایک مستقل دورِ شاعری معیّن نہ کیا۔ غالب نامہ کی پہلی اشاعت کے بعد سبدِ چین اور مکاتیبِ غالب شائع ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری رسائی غالب کے نئے کلام تک ہوئی ہے۔ اور بعض پرانی غزلوں اور قصیدوں کے مستند ہونے کی تصدیق بھی ہوئی ہے۔ اب اس حصہ کلام کو جداگانہ طور پر مطالعہ کرنے میں شاید کوئی ہرج نہ ہو۔

درباری تعلقات کی وجہ سے غدر سے پہلے کئی سال تک مرزا نے زیادہ توجہ اردو کی طرف رکھی۔ اس اثنا میں انہوں نے فارسی اشعار بھی کہے لیکن ان اشعار، بالخصوص فارسی غزلیات کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ کلام کا بیشتر حصہ اُردو میں ہے۔ غدر کے بعد دربار اور درباری تعلقات ختم ہوگئے۔ اب مرزا نے فارسی پر پھر زیادہ توجہ دینی شروع کی۔ اور غدر کے بعد انہوں نے جو اشعار کہے ہیں۔ ان میں فارسی اشعار کی تعداد اُردو اشعار سے زیادہ ہے۔ بلکہ شاید ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۲ء تک انہوں نے سوائے ایک قصیدہ کے، جو منشی شیو نرائن کے نام سے لکھا گیا، اور چند اشعار کے، جن میں غدر کی مصائب کا رونا ہے، ایک بھی اُردو شعر نہیں کہا۔

غدر کے بعد مرزا نے جو اردو فارسی اشعار کہے۔ وہ طرزِ تحریر اور خیالات کے لحاظ سے

اس کی عام شاعری میں نمایاں ہے۔ اور اس عظیم الشان ذہنی انقلاب کا آئینہ ہے جو ان کے
دل و دماغ کی گہرائیوں میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ ابتدا میں شاعر پر یہ ساخت غالب تھی لیکن
بتدریج خیالات منشکل ہوتے گئے اور معاملات میں توازن آتا گیا۔ اس ذہنی ارتقا کی انتہائی بلندی
غالب کے اردو خطوط میں نظر آتی ہے جو صرف نادر و نایاب ادبیت (Belles Lettres) بلکہ مرزا کی
ظرافت کے بہترین نمونے ہیں۔ لیکن جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے شوخی اور ظریفانہ اشعار
کی جو کثرت ان کے دور میں ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔

مرزا کی عام شاعری کا میدان وسیع تھا۔ اسی طرح شوخی اور ظرافت کو بھی انہوں نے
صرف مضامین تک محدود نہیں رکھا۔ ان کی ظرافت بہت پاکیزہ تھی اور تبسم زیر لب سے آگے
کبھی نہ بڑھتی لیکن اس میں رعایت کسی کی نہ تھی گاہے گاہے اپنے اوپر بھی ہنس لیتے تھے ؎

غالب ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ایک دوسری جگہ تو شوخی حد سے گزر گئی ہے اور محمل لیلیٰ کی طرف ہاتھ اٹھتا نظر آتا ہے ؎

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کی کبھی — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

یہ ظریفانہ اشعار زیادہ تر شوخیٔ طبع کا اظہار ہیں لیکن جس کثرت اور جس چھپے ہوئے طریقے سے
انہوں نے جنت کا تمسخر اڑایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موضوع انہیں بہت بھاتا تھا ؎

میں جو کہتا ہوں کہ ہم حشر میں لیں گے تم کو — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

تعزیت کے موقعے پر بھی ظریفانہ انداز قائم رکھا۔ اور اظہار رنج اور تلقین صبر کے بجائے خطوں میں جانفزا لطیفے ہی لکھے۔ موت کے متعلق مرزا کا یہ انفرادی نقطۂ نظر کسی حد تک تو اُن کی بدعت پسندی کی وجہ سے ہوگا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ خاص زاویۂ نگاہ اسی عارفانہ چشم بصیرت کا عطیہ تھا جس نے اُن کے لیے سختی و سستی اور رنج و آرام سب کو ہموار کر دیا تھا۔ شروع میں جب اُنھوں نے جذبات کی باگ ابھی تک عقل کے ہاتھوں میں نہ دی تھی۔ اُن کے اشعار میں موت کا بیان اسی طرح تھا۔ جس طرح عام شعرا کے کلام میں۔ مثلاً "ہائے ہائے" کی ردیف میں ان کی مشہور غزل پڑھیے۔ جو اُنھوں نے تئیس چوبیس سال کی عمر میں "کسی" کی وفات پر لکھی تھی۔ اگرچہ یہ مرثیہ بہت پُر درد ہے۔ لیکن اسلوب خیال بالکل رسمی اور عامیانہ ہے تب ہم اس کا مقابلہ عارف کے مرثیے سے کرتے ہیں۔ جو اس سے پچیس تیس برس بعد لکھا گیا۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس عرصے میں شاعر کا نقطۂ نظر بہت بدل گیا ہے۔ بعد کے مرثیے میں مرزا نے ہجوم غم کی وجہ سے اپنا سکون اور توازن نہیں کھو دیا۔ اور موضوع دردناک ہونے کے باوجود اُنھوں نے اپنی شوخ نگاری برقرار رکھی ہے۔ عارف سے خطاب ہے ؎

تم کونسے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور!

پچیس تیس برس کے وقفے سے مرزا نے جو دو مرثیے لکھے۔ ان میں جو فرق ہے وہی

لہ ایک غیر مطبوعہ منظوم خط کے دو اشعار ہیں ؎

زر نجو رئے من مخور غم کہ من — نہ دارم غم ہستئ خویشتن
نہ جاں را من است و نہ جسم آنِ من — خود از مردنِ من چہ نقصانِ من!

ظرافت

زبان کی سلاست اور خیالات کی سادگی کے علاوہ جس خصوصیت نے اس دور کے اشعار کو امتیازی رنگ دے دیا ہے وہ مرزا کی شوخی اور ظرافت ہے ابتدائی دور میں مرزا کے اکثر اشعار معمہ تھے۔ شاعرانہ حس سے عاری متین اور سنجیدہ لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ جب مرزا کی خارجی اور داخلی کشمکش پر ان کی عقل سلیم غالب آئی۔ تو ان کے اشعار میں ایک طرح کی شگفتگی آگئی ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ جو آدمی احساسات کا غلام ہے اس کے لئے زندگی ایک ٹریجیڈی ہے۔ اور سوچنے سمجھنے والے کے لئے کامیڈی مرزا بے شک قوی احساسات اور جذبات کے مالک تھے لیکن ان کی فہم و ادراک قوی تر تھی اور جوں جوں انہیں زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی ہوتی گئی وہ ان واقعات پر مسکرانے لگے جن کے لئے پہلے آنسو بہاتے تھے ؎

رازداں جوئے دہرم کردہ اند   خندہ بر دانا و ناداں می زنم

یہ صحیح ہے کہ مرزا کی شوخی کی اصل بنا ان کی جدت طرازی اور ہر بات میں نیا پہلو نکالنے کی عادت تھی لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طریقے سے انہوں نے رنج و غم کی باتوں میں شگفتگی طبع کو برقرار رکھا وہ اسی آدمی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ جس نے بقول ان کے سختی و سستی در رنج و غم کو ہموار کر دیا ہو اور جو رنج و غم کی شدت سے اس قدر آشنا ہو گیا ہو کہ رنج و غم کے سوا اسے اور کچھ نظر ہی نہ آئے۔

ازاں شکستن گیتی نشاط مے ورزی
کہ بوئے زہر نہ شنوی ز شیر کالش

دنیا کے حوادث میں شاید المناک ترین واقعہ کسی کی موت ہے۔ جس پر دوست کیا دشمن بھی آنسو بہاتے ہیں لیکن اردوئے معلیٰ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مرزا نے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا　　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہونگیں کہ پنہاں ہو گئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں　　روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو　　نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اس دور کی ایک خصوصیت ایک خاص رنگ کے اشعار کی فراوانی ہے۔ جن میں دو مصرعوں کے اندر شاعر نے جہانِ معنی جلوہ گر کیا ہے۔ اور ان میں تاسف تخیل اور تجربے کا اس طرح عطر کھینچا ہے کہ ان سے کاغذ کا دل و دماغ معطر ہوتا ہے۔ اور پڑھنے والے کے ذہن میں نئے نئے شگفتہ خیالات اور لطیف تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دیر نہیں حرم نہیں۔ در نہیں آستاں نہیں　　بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار　　یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

فارسی ترکیبیں اسقدر ہوں جس قدر آٹے میں نمک دور مرے اور محاورے کی افراط ہو چنانچہ مرزا پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ اور اس دور کی بعض غزلوں پر ذوق کا رنگ غالب ہے مثلاً ان کی وہ مشہور غزل جس کے مقطع میں بہادر شاہ کے ارادہ حج کی طرف اشارہ ہے اس غزل کا شاید کوئی شعر ایسا نہیں جسے ذوق نہ لکھ سکتا ہو۔ مضامین سادہ اور عامیانہ ہیں اور روزمرہ کی افراط ہے ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

اس دور میں اس طرح کی غزلیات، جو معنوی حسن سے بیشتر عاری ہیں اور غالب کے عام معیار شاعری پر پوری نہیں اترتیں کئی ہیں مثلاً دل کے مطلعوں والی غزلیں ؎

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے — اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی "کہ وہ آئے"

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

غالباً یہ غزلیں استاد شاہی کی تعمیل میں، یا کسی مشاعرے میں پڑھنے کے لیے بعجلت لکھی گئیں اور ان پر شاعر نے اپنا پورا وقت صرف نہیں کیا ورنہ اس دور میں بھی جس پایہ کے اشعار غالب لکھ سکتا تھا اس کا اندازہ ذیل کی غزلیں دیکھنے سے ہوگا ؎

فارسی قصائد لکھے۔ اور ایک آدھ فارسی غزل بھی اس زمانے کی یادگار ہے۔ لیکن دربار سے تعلقات استوار ہونے کی وجہ سے انہیں درباری زبان کو اپنی زبان بنانا پڑا۔ اور اس زمانے کے اکثر اشعار اُردو میں ہیں۔ بیشتر غزلیں ہیں جو مرزا نے بادشاہ کو خوش کرنے یا قلعہ کے مشاعروں میں پڑھنے کے لئے لکھیں۔ لیکن اُن کے علاوہ بادشاہ یا شہزادوں کی تعریف میں قصائد اور قطعات بھی ہیں۔ جب مرزا نے پہلی دفعہ دیوان ریختہ مرتب کیا تھا تو اس وقت تک کسی رئیس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ نسخۂ حمیدیہ میں کوئی مدحیہ قصیدہ نہیں۔ اس کے بعد فارسی زبان میں قصائد لکھے گئے لیکن درباری دَور میں مرزا کو اُردو زبان میں کئی مدحیہ قصائد لکھنے پڑے۔ جو اُن کے دیوان میں موجود ہیں +

ان قصائد میں سے ایک دو کسی قدر پُر لطف ہیں۔ لیکن اس زمانے کی صحیح یادگار اُردو غزلیں ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ یہ دَور مرزا کی پختگی کا زمانہ ہے۔ اُنہوں نے بیدل کی پیروی بیس اکیس برس کی عمر میں ترک کر دی تھی۔ لیکن وسیع اور پیچیدہ مضامین سے اُنس باقی تھا۔ اس لئے اُنہیں شعر میں ادا کرنے کے لئے فارسی ترکیبوں کا استعمال گوارا کرنا پڑتا تھا۔ دورِ ثانی کے کئی اشعار میں زبان اور ندرتِ خیال میں ایک طرح کا تصادم ہے۔ لیکن مرزا نے لطفِ زبان کے لئے خیالات کو قربان نہیں کیا۔ درباری دَور میں البتہ لطفِ زبان ندرتِ خیال پر غالب آگیا ہے۔ اور اخیر کی چند غزلیات میں تو خیالات شگفتہ الفاظ اور دلپذیر طرزِ اظہار کے لئے محض زنگارِ آئینہ کا کام دیتے ہیں +

مرزا کی شاعری میں اس نمایاں تغیّر کی وجہ درباری تعلق تھا۔ بادشاہ اور شہزادے شاہ نصیر کی طرز کے مدّاح تھے۔ جسے ذوق نے برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا بھی مشاعروں میں دیکھتے تھے۔ کہ وہی غزلیں مقبول ہوتی ہیں۔ جن کی زبان سادہ اور آسان ہو تشبیہیں اور

قطعہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور کسی میں ہندوستان کے بہترین فارسی شعرا سے پیچھے نہیں رہے +

ہندوستان کے فارسی شعرا لیسوں کے متعلق مرزا اچھی رائے نہ رکھتے تھے اور یہاں کے فارسی شعرا میں بھی امیر خسرو اور کسی حد تک فیضی کے سوا وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے خیالات اور طرز بیان کے لحاظ سے بالعموم ان فارسی شعرا کی پیروی کی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے یا ایران سے آکر ہندوستان میں ایسے بسے کہ یہیں کی خاک ہو گئے۔ ابتدا بیدل کے رنگ میں کی تھی اس کے بعد اُنھوں نے جن شعرا کا تتبع کیا۔ ان میں عُرفی، نظیری اور فیضی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں مرزا غالب حقیقتاً فارسی شعرا کی اُس لڑی کے آخری موتی ہیں جس کا سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع اور اقبال پر ختم ہوا آج ایران کے ادبی نقاد اور ان کے ہمنوا یورپین مؤرخ قومی عصبیت یا معروفی طرزِ تعلیم کی دلفریبیوں کے زیر اثر ان شعرا کی قدر نہیں کرتے۔ ادھر ہندوستان میں بھی کئی لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو ہندوستان کی فارسی شاعری کو ہندوستانی ادبیات کا حصہ نہیں سمجھتے ان دونوں طبقوں کی سرد مہری کی وجہ سے ہندوستان کی فارسی شاعری سے لوگ بےتوجہی برتی جا رہی ہے لیکن جو لوگ ملکی اور مذہبی اختلافات سے بالا ہو کر شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ اس شاعری کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور کلیات غالب میں سے جو طویل فارسی انتخابات ہم نے اوراقِ غالب میں درج کئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان کے فارسی شعرا کے کلام میں بھی ایسی چیزیں موجود ہیں۔ جو زور بیان اور رفعت تخیل کے لحاظ سے دور آخر کی ایرانی شاعری سے بدرجہا بلند ہیں +

چوتھا دَور | چوتھا دور مرزا کی شاعری کا اردو دور ہے۔ اس زمانے میں مرزا نے کئی

۱۸۴۷ء کے بعد بہادر شاہ سے مرزا کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ اور اب انہوں نے "انبساطِ خاطر حضرت" کے لئے اُردو کو اپنی زبان بنایا۔ اس زمانے میں انہوں نے کئی فارسی قصائد بہادر شاہ، شاہانِ اودھ اور انگریزی حکام کی تعریف میں لکھے۔ لیکن اس دَور کی بہترین یادگار اُن کا اُردو کلام ہے۔ جس پر ہم آیندہ سطور میں تبصرہ کریں گے۔

مرزا اپنے فارسی کلام کو اُردو کلام کے مقابلے میں جس قدر اہم سمجھتے تھے اس کا اظہار انہوں نے اشعار اور خطوط میں جا بجا کیا ہے۔ اور حقیقتاً جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ تیس برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک انہوں نے زیادہ فارسی زبان میں شعر لکھے، تو مرزا کا یہ اظہارِ خیال کچھ عجیب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت محض شخصی نہیں۔ اُن کا فارسی کلام صرف اس لئے اہم نہیں۔ کہ یہ اُردو کے بہترین شاعر کا نتیجۂ فکر ہے۔ بلکہ فی نفسہٖ اس کلام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ فارسی قریباً سات آٹھ سو سال تک شمالی ہندوستان کی ادبی زبان رہی ہے۔ اور اس دوران میں بہت سے خوشگو فارسی شعرا اس سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن اقبالؔ اور شاید امیر خسروؔ کے سوا کوئی ہندوستانی فارسی شاعر ایسا نہیں۔ جس کا مرتبہ غالبؔ سے بلند ہو۔ مرزا کا فارسی کلیات قریباً پانسو صفحوں پر مشتمل ہے۔ جو قصائد اور غزلیات سبدِ چین[1] میں ہیں۔ وہ اس پر مستزاد ہیں۔ مرزا نے غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی

[1] یہ مجموعہ مدت سے نایاب تھا۔ ۱۹۳۸ء میں مسٹر مالک رام ایم۔اے نے نواب حبیب الرحمان کے کتب خانے سے حاصل کر کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مکمل ہے۔ لیکن اس وقت بھی غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جو نہ کلیات میں ہیں۔ نہ سبدِ چین میں۔ مثلاً مثنوی در مدح الناصل (ملاحظہ ہو دستور العمل اودھ قلمی نمبر ۲۲۹ کتب خانہ رام پور) یا مرزا کی پانچ مختصر فارسی مثنویاں جو نسخہ دیوان غالب بانکی پور کے حاشیئے پر درج ہیں۔

کہ اگرچہ مرزا کی اس رسالے کی فارسی غزلیں دقیق اور خیالی مضامین سے پُر ہیں لیکن اُنکے اس رسالے کی فارسی مثنویاں اور قصیدے ان نقائص سے بری ہیں تحفۂ دیر اور باد مخالف دونوں کی زبان بہت صاف اور شگفتہ ہے اور اُن کے اس رسالے کے قصائد میں بھی خیال اور زبان کی وہ الجھنیں نہیں جو اس رسالے کی فارسی غزلیات میں نمایاں ہیں +

مرزا کی فارسی غزل گوئی کا عہد زرّیں وہ زمانہ ہے جس کا انتخاب ہم نے گُل رعنا میں دیا ہے ان کے ضخیم فارسی کلیات میں سوا تین سو سے زیادہ غزلیں ہیں اور ان میں اُنچاس غزلوں کے سوا باقی تمام غزلیں اس زمانے تک لکھی جا چکی تھیں اور صرف یہی نہیں کہ مرزا کی غزلوں کا بہت بڑا حصہ اس زمانے میں لکھا گیا بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی مرزا کی اکثر بہترین غزلیں اس زمانے کی یادگار ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ غزلیات کا ایک حصّہ سفر کلکتہ سے پہلے لکھا جا چکا ہوگا اور اس دور کی کئی غزلیں ہیں جو زبان اور خیالات کے لحاظ سے قیام کلکتہ کی غزلوں سے ملتی جلتی ہیں لیکن جو انتخاب ہم نے گل رعنا کے عنوان سے درج کیا ہے اُس کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں مرزا کی فارسی شاعری کا رنگ بہت نکھر گیا تھا اور اُن کی اکثر بہترین غزلیں اسی زمانے کی ہیں +

۱۸۳۸ء کے قلمی دیوان میں طویل فارسی قصائد اور ترکیب بند نسبتاً کم ہیں غزلیات کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان مرتب کرنے کے بعد مرزا نے طویل نظموں پر زیادہ توجہ شروع کی ۱۸۴۳ء کے مشاعروں کے لئے مرزا نے فارسی غزلیں لکھیں اور انکے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں۔ جو قلمی دیوان مرتبہ ۱۸۳۸ء کے بعد اور مطبوعہ دیوان ۱۸۴۵ء کی ترتیب سے پہلے لکھی گئیں لیکن اُن کی تعداد تھوڑی اور طویل نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے سب سے اہم فارسی مثنوی ابر گہربار بھی اس زمانے کی یادگار ہے +

یہ کر دیا۔ لیکن مرزا کے اپنے بیانات اور ان کے کلام کے معاصرانہ قلمی نسخوں سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنی عمر کے ایک طویل حصے میں اردو سے دانستہ کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ اور غالباً اس کی ایک وجہ ذوق سے ان کی چشمک تھی۔ جس کا اظہار انہوں نے ایک ابتدائی فارسی قصیدے میں کیا ہے ؎

ملالِ خاطرِ حاسد زمن بداں ماند
کہ گرد رہ بہ ہوا پیچد از سبکساری

چہ ننگ اگر بہ سخن ہم فن است جہل بہ سخن
ز دودہ ام زورقِ داغِ ننگِ ہمکاری!

مرزا کے اس زمانے کے فارسی اشعار کو جب فارسی کی طرف ان کی زیادہ توجہ تھی ہم نے تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ لالۂ صحرا کے تحت میں ہم نے ان اشعار کا انتخاب درج کیا ہے۔ جو سفرِ کلکتہ کے دوران میں یا اس سے پہلے کہے گئے۔ گلِ رعنا کے تحت میں وہ اشعار ہیں۔ جو مرزا کے قلمی دیوان منقولہ ۱۸۳۳ء میں موجود ہیں۔ لیکن سفرِ کلکتہ کے بعد کے معلوم ہوتے ہیں تیسرے حصے میں ان اشعار کا انتخاب ہے۔ جو قلمی دیوان منقولہ ۱۸۳۸ء میں تو موجود نہیں لیکن خارجی اور داخلی شہادت کی بنا پر ۱۸۴۷ء سے پہلے کے کہے جا سکتے ہیں۔

مرزا کی ان غزلیات کے مطالعہ سے جو انہوں نے سفرِ کلکتہ کے دوران میں لکھیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جہاں تک اردو غزل گوئی کا تعلق ہے، وہ اس زمانے میں بیدل کا رنگ ترک کر چکے تھے۔ لیکن فارسی غزلیات میں یہ رنگ ابھی نمایاں تھا۔ اور ان غزلوں کے اکثر اشعار دقیق خیالات اور دور از کار تشبیہات سے پر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ چونکہ فارسی زبان میں یہ طرزِ شاعری نیا نہ تھا۔ اس لئے مرزا کی ان فارسی غزلیات میں وہ اجنبیت اور غرابت نظر نہیں آتی۔ جو ان کی ابتدائی اردو غزلیات میں نمایاں ہے۔ پھر بھی ان غزلیات اور بعد کی بلند پایہ فارسی غزلیات میں واضح فرق ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے

ذیل کی غزل بھی جو مندرجہ بالا غزل کی طرح شاعر کے دل مجروح کی ایک اور دلآویز تصویر ہے ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی

فارسی شاعری
(۱۸۲۷ء تا ۱۸۴۷ء)

یادگار غالب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا نے فارسی شعر گوئی اس وقت شروع کر دی تھی جب وہ آگرہ چھوڑ کر ابھی دہلی نہ آئے تھے اور جب اُس کی عمر غالباً سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ شروع میں اُن کی توجہ زیادہ تر اُردو کی طرف تھی اور فارسی کی طرف بہت کم لیکن سفر کلکتہ سے کچھ عرصہ پہلے اُنہوں نے فارسی شعر گوئی پر زیادہ توجہ شروع کر دی اور اس سفر کے دوران میں متعدد فارسی غزلیں، ایک مسدس یا یہ فارسی مثنوی اور کئی ایسے فارسی قصائد لکھے جو ایک نو مشق کا نتیجۂ فکر نہیں معلوم ہوتے۔

قیام کلکتہ کے زمانے میں اور اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا نے فارسی اشعار زیادہ لکھے اور اُردو اشعار کم اور غالباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۷ء یا اس سے کچھ عرصہ بعد سے لے کر ۱۸۴۷ء تک مرزا کی اصل ادبی زبان فارسی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا اس زمانے میں گاہے گاہے اُردو اشعار کہتے رہے اور اس کے بعد بھی جب درباری تعلقات کی وجہ سے اُنہوں نے اُردو پر زیادہ توجہ کی تو اس وقت بھی اُنہوں نے فارسی شعر گوئی کو یک قلم ترک

ہاں وہ نہیں خدا پرست۔ جاؤ وہ بے وفا سہی   جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

سودا کی غزلوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان قصیدے کی زبان ہے۔ اور فارسی ترکیبوں سے تغزل کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سادہ زبان میں مٹھاس زیادہ ہے۔ اور یاس و حزن کے اظہار میں وہ زیادہ موثر ہوتی ہے لیکن محبت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں طرح طرح کی حسیات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور انہیں نظم کرنے کے لئے ایک کامیاب شاعر الفاظ اور تراکیب بھی مختلف انتخاب کرے گا۔ غالب کی ایک مشہور غزل ہے؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اس میں محبت کی اس حالت کا بیان ہے۔ جس میں بجھا ہوا دل بھی اٹھتا ہے۔ اور عشق و محبت کے ولولے طبیعت کو پھر بیقرار کرتے ہیں۔ یہ تمام غزل فارسی ترکیبوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن جوش و ولولہ کا بیان ہونے کے باعث یہ ترکیبیں اظہارِ مضمون کو اور بھی موثر کرتی ہیں۔ اور اردو شاعری میں اس کیفیت کی اس سے بہتر تصویر شاید ہی کہیں ہو +

اس کے برعکس جب مرزا مایوسی اور غم کا بیان کرتے تو فارسی ترکیبیں بہت کم ہوتی تھیں۔ مثلاً؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند   کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے   اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

خیال بعینہٖ تھا لیکن لفظی رعایت نے شاعر کے محسوسات حقیقت پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن غالب
شاعر کے شاہکاروں میں سے ہے ۔ اس میں لطف بیان نے خیال کو اس طرح پیش کیا
ہے کہ اس سے بہتر طریق اظہار قطعی نہیں ہو سکتا ۔

بہت دلوں میں لطف نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ خیالات سے قطع نظر غالب
کو طرز بیان کا بھی بہت خیال رہتا تھا ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خیالات غالب کے اعلیٰ ہیں
اور زبان دقیق کی ۔ اگر زبان سے مطلب روزمرہ اور محاورات کا استعمال ہے جو ایک جگہ
مقبول ہیں اور دوسری جگہ نا پسند ۔ یا آج مستعمل ہیں اور کل متروک تو یہ خیال ٹھیک ہے لیکن اگر
ہم زبان سے مراد لیں الفاظ کا انتخاب، اُن کی ہم آہنگی اور نشست تو مرزا کا مرتبہ تمام
اُردو شعرا سے بلند ہے ۔ وہ صرف معنی پرست نہ تھے بلکہ حسن ظاہری کی قدر و قیمت بھی پہچانتے
تھے ۔

ہیں گر سرد برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

گر معنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است
خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

مرزا نے اپنے کلام کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بھی پوری نظر رکھی ہے اور ان کے شعر میں
الفاظ فقط اظہار مطلب ہی کا وسیلہ نہیں ۔ بلکہ شاعرانہ حسن پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہیں
ان کا استعمال اور ترتیب ایسی ہے کہ معنی اور مضمون سے قطع نظر ان کا ترنم اور ہم آہنگی ہی
بہت پر لطف ہے ۔ مثلاً ۔

وہ دل کھول کے تک جائیں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

پہلے "داغِ حسرتِ دل" کی رعایت سے "گرہ" نہیں بلکہ "بے گنہی" لکھا تھا۔ اور شعر یُوں تھا۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے حسابِ بے گنہی اے خدا نہ مانگ

ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو   ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

پہلے "تکیہ گاہ" کے خیال سے "گراں خوابی" لکھا تھا۔ لیکن لفظی رعایت قائم رکھنے سے مضمون پیچیدہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پہلا مصرع بدل کر مضمون صاف کر دیا۔ نقشِ اوّل ملاحظہ ہو سہ

ضعف نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی اسد   ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

زبان کی اس ترمیم اور الفاظ کے تغیر و تبدل کے علاوہ غالب کے کلام میں کئی جگہ ایک خیال مختلف صورتوں میں نظم ہوا ہے۔ یعنی نفسِ مضمون تو اصولاً ایک ہے۔ لیکن مختلف اشعار میں اظہارِ خیال نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ بعض جگہ یہ مضامین ایسے ہیں۔ جو خود شاعر کو مرغوب ہیں (مثلاً بہشت کا استہزا۔ قلبِ انسانی کی فطری غمگینی۔ انسان کی بے بسی۔ رشک مذہب کے معاملے میں آزاد خیالی) اور چونکہ شاعر کے دل میں ان کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ انہیں بار بار نظم کرنے پر مجبور تھا۔ بعض جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ شاعر کو ایک مضمون سُوجھا۔ اُس نے اسے نظم کر دیا۔ لیکن اظہارِ خیال سے مطمئن نہ ہوا۔ اور وہ خیال اُسے گدگداتا رہا حتّے کہ نقشِ ثانی میں وہ بہتر طریقے سے ادا ہوا۔ مثلاً سہ

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا   یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مضمون بہت بلند پایہ نہیں۔ اور اس میں کسی شاعرانہ رفعت کی گنجائش کم ہے۔ لیکن جہاں تک طرزِ ادا کی لطافت۔ زبان کی تاثیر اور بے ساختگی کا تعلق ہے۔ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر ہے سہ

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے   بیٹھنا آکے وہ اُس کا تری دیوار کے پاس!

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار   جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

سادہ بنانے کے لئے کی گئی ہیں اور دقیق فارسی الفاظ یا تراکیب کی جگہ آسان الفاظ لکھے ہیں یا جن الفاظ میں کوئی سقم تھا انہیں بدل دیا ہے مثلاً

گرمگاہ گرم فریاتی رہی تعلیم ضبط　　شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

گرمگاہ گرم فریاتی رہی تعلیم ضبط　　شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

یا

ٹوٹے گل بہ نالۂ دل، دُود چراغ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

عشرت ایجادی ٹوٹے گل ہو کو دود چراغ　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بعض جگہ چند الفاظ بدلنے سے مختلف مضمون پیدا ہو گیا ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہر گردوں ہے چراغ رہگذار بادیاں

پہلے یہ شعر اس طرح تھا ؎

ہے مری وحشت عدوئے اعتدالات چمن　　مہر گردوں ہے چراغ رہگذار بادیاں

یا

ہے جنوں کی حسرت یوسف سے لیلی بھی جامہ آرائی　　سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

پہلے مضمون اس سے قدرے مختلف تھا ؎

ہیں بند زلیخا سے تکلف ماہ کنعاں پر　　سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

شروع شروع میں کئی تشبیہیں یا ترکیبیں کسی مضمون یا لفظ کی رعایت سے لکھی تھیں جس سے مضمون زیادہ دقیق ہو گیا تھا غالب نے انتخاب کے وقت لفظی رعایت کو قائم نہیں رکھا۔ مثلاً

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہیں تنوع کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ رندی اور درویشی، خوشی اور افسردگی، بیقراری اور تسلیم و رضا ان سب منزلوں سے گزر چکے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنے ذہنی مشاہدات پر اسی طرح ٹھنڈے دل سے اور جذبات و احساسات کو قابو میں رکھ کر غور کرتے۔ جس طرح ایک سائنسدان اپنے کیمیائی تجربات کو دیکھتا ہے۔ اس لئے انہیں اس مشاہدات کی دنیا میں وہ چیزیں نظر آجاتیں۔ جن سے بعض اس لئے بے خبر ہوتے ہیں۔ کہ وہ ان کے تجربے سے باہر ہیں۔ اور بعض اس لئے کہ وہ انہیں محسوس کرتے وقت، شدت احساس سے اس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں کہ صحیح مشاہدہ نفس کے قابل نہیں رہتے۔ مرزا اپنے مسلک کی نسبت ایک خط میں مرزا قربان علی بیگ کو لکھتے ہیں: "اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔"

لیکن مرزا کا علم نفسیات اپنے مشاہدہ نفس تک محدود نہ تھا۔ وہ بڑے مردم بیں اور مردم شناس تھے۔ آدمیوں کو پرکھنا، اور ان کے افعال و اعمال بلکہ ان کے "نہانخانۂ دل" کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔ "ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں۔ ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہونگے۔ زمرۂ خواص میں سے، زمرۂ عوام کا شمار نہیں۔" اسی خط میں آگے چل کر کہتے ہیں۔ "میں آدمی نہیں ہوں، آدم شناس ہوں۔ شعر

نگہم نقب ہمے زد بہ نہانخانۂ دل

مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیدان رفتم"

لفظی صناعی | دوسرے دور کے آخر یا تیسرے دور کے شروع میں مرزا نے اردو دیوان منتخب کیا۔ اور اشعار کی کمی بیشی کے علاوہ الفاظ اور تراکیب میں بھی ترمیم کی۔ یہ حک و اضافہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے۔ ان میں سے بیشتر اصلاحیں تو زبان کو

سادہ بنانے کے لئے کی گئی ہیں اور دقیق فارسی الفاظ یا تراکیب کی جگہ آسان الفاظ لکھے
ہیں یا جن الفاظ میں کوئی سقم تھا انہیں بدل دیا ہے مثلاً

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

یا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پہلے یہ شعر یوں تھا ؎

عشرت ایجاد جو بوئے گل و دودِ چراغ — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

بعض جگہ چند الفاظ بدلنے سے مختلف مضمون پیدا ہو گیا ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

پہلے یہ شعر اس طرح تھا ؎

ہے مری وحشت عدوئے اعتبارات جہاں — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

یا

نہ چھوڑی حسرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

پہلے مضمون اس سے قدرے مختلف تھا ؎

ہیں بند زلیخا سے تکلف ماہ کنعاں پر — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

شروع شروع میں کئی تشبیہیں یا ترکیبیں کسی مضمون یا لفظ کی رعایت سے
لکھی تھیں جس سے مضمون زیادہ دقیق ہو گیا تھا غالب نے انتخاب کے وقت لفظی
رعایت کو قائم نہیں رکھا۔ مثلاً

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہیں تنوع کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ رندی اور درویشی، خوشی اور افسردگی، بیقراری اور تسلیم و رضا، ان سب منزلوں سے گزر چکے تھے۔ اور اس پہ طرّہ یہ کہ وہ اپنے ذہنی مشاہدات پر اسی طرح ٹھنڈے دل سے اور جذبات و احساسات کو قابو میں رکھ کر غور کرتے۔ جس طرح ایک سائنسدان اپنے کیمیائی تجربات کو دیکھتا ہے۔ اس لئے انہیں اس مشاہدات کی دنیا میں وہ چیزیں نظر آجاتیں۔ جن سے بعض اس لئے بے خبر ہوتے ہیں۔ کہ وہ ان کے تجربے سے باہر ہیں۔ اور بعض اس لئے کہ وہ انہیں محسوس کرنے وقت، شدت احساس سے اس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں کہ صحیح مشاہدہ نفس کے قابل نہیں رہتے۔ مرزا اپنے مسلک کی نسبت ایک خط میں مرزا قربان علی بیگ کو لکھتے ہیں۔ "اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔"

لیکن مرزا کا علم نفسیات اپنے مشاہدہ نفس تک محدود نہ تھا۔ وہ بڑے مردم بیں اور مردم شناس تھے۔ آدمیوں کو پرکھنا، اور ان کے افعال و اعمال بلکہ ان کے نہاں خانۂ دل کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں۔ "ستّر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں۔ ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہونگے۔ زمرۂ خواص میں سے، زمرۂ عوام کا شمار نہیں۔" اسی خط میں آگے چل کر کہتے ہیں۔ "میں آدمی نہیں ہوں، آدم شناس ہوں۔ شعر

گہم نقب ہے زد بر نہانخانۂ دل
مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم"

لفظی صناعی | دوسرے دور کے آخر یا تیسرے دور کے شروع میں مرزا نے اُردو دیوان منتخب کیا۔ اور اشعار کی کمی بیشی کے علاوہ الفاظ اور تراکیب میں بھی ترمیم کی۔ یہ حک و اضافہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے۔ ان میں سے بیشتر اصلاحیں تو زبان کو

چند اشعار درج ذیل کرتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ جہاں جہاں نفسیات کا علم وسیع ہوتا جائے گا
غالب کے کئی اشعار کی دلچسپی بڑھتی جائے گی مثلاً ؎

شوق کو مشغلہ نہ کر یار کو التجا سمجھ

یا ؎ میانہ من و او شوق حائل افتاد است

روش نہ ماند کہ دگر ہم ملامتیست   مرغ نفسی کشمکش دام ندارد

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے   تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

مُدّعی خواست رود بر اثر من غالب   آکہ خود داشت بہ سودائے خُوش لولی مست

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے[1]

مرزا غالب کی کامیاب نفسیات نگاری کی کئی وجہیں ہیں ایک تو ان کا ذہنی اور
عملی تجربہ بہت وسیع تھا ان کی زندگی میں "مسوہ بالتسلسل" اور اہم واقعات تھوڑے تھے
لیکن شاعرانہ زود حسی نے روزمرہ کے معمولی واقعات کو چمکا دیا تھا اور مرزا کے مشاہدہ و تجربہ

---

[1] یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مرزا کے رشک کے اشعار جو بعض لوگوں کو بے حد پسند ہیں نفسیاتی
حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ غالب میں انانیت بہت کمال کی تھی اور قدرتی امر تھا کہ وہ رشک کے بہت سے
مضامین نظم کرتے لیکن ان اشعار میں انھوں نے مبالغے اور شوخی سے اس قدر کام لیا ہے کہ مضمون تو
مزے دار پُرلطف ہو گیا ہے لیکن نفسیاتی حقیقت نظر سے پنہاں ہو گئی ہے +

ہماری کم نگہی کی وجہ سے پوشیدہ پڑے رہتے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

مرزا اگر اپنا بیان محبت تک ہی محدود رکھتے۔ اور اس کی گوناگوں کیفیتوں کو اس وسعت اور بالغ نظری سے بیان کر دیتے۔ تب بھی مشرقی شعرا میں وہ بے نظیر تھے۔ لیکن مرزا فقط فلسفۂ محبت ہی کے رازدار نہ تھے۔ بلکہ محبت کے علاوہ قلب انسانی کی باقی تمام کیفیتوں سے بھی خوب واقف تھے۔ دوسرا شعر جو ہم نے نقل کیا ہے۔ وہ فقط محبت سے متعلق نہیں بلکہ انسان کی عام جذباتی زندگی پر صادق آتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں لوگ پروفیسر جیمز کے اس نظریے سے عام طور پر متفق ہیں۔ کہ جذبات کا اظہار ان کی توسیع بلکہ تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن نفسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ جب شروع شروع میں جیمز نے یہ نظریہ پیش کیا۔ تو سائنسدانوں کو بہت عجیب معلوم ہوا۔ اور آج بھی عام توقعات کے خلاف نظر آتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ معلم نفسیات کا ایک مسئلے کو دلیلوں اور مثالوں سے ثابت کرنا اور ایک شاعر کا اپنے احساسات کو نظم کر دینا دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن آخر یہ ایک امر واقعی ہے۔ کہ مرزا نے یہ شعر جیمز کی کتاب سے بہت پہلے لکھا تھا۔ اور شاعر کی چشم بصیرت اس "رازِ نہانِ روزگار" سے "محرم" ہوگئی تھی۔ جس کے لئے سائنسدان کو ابھی برسوں انتظار کرنا تھا۔ یہی وہ اشعار ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے ؎

مشو منکر کہ در اشعارِ این قوم ورائے شاعری چیزے دگر ہست

غالب کے ہاں اس قبیل کے اشعار بہت ہیں جن میں قلب انسانی کی وہ کیفیتیں نظم ہیں۔ جو بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن فی الحقیقت واقعات پر مبنی ہیں۔ ہم یہیں سے

پہلوؤں پر حاوی تھی۔ مثلاً پہلے شعرا کے نزدیک تو عاشق ہی نامراد اور مایوس ہوتا تھا اور
دوسرے سب کامیاب لیکن مرزا کی نظر ایسی ناکامی اور مایوسی کی چٹانوں سے ٹکرا کر رُک رہ جاتی۔
اور تو ظاہری مدارات کے باوجود وہ زندگی کی صحیح تصویر ہی دیکھتے۔ چنانچہ اس مضمون پر ان کے
کئی شعر ہیں جو مشرقی عشق کے رسمی نقطۂ نظر سے بہت مختلف ہیں مثلاً ؎

عشق کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

تمہاری طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے　　رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

ایسے اشعار کئی ہیں۔ لیکن ایک فارسی شعر تو بہت ہی پُرلطف ہے ؎

ما ہم بہ لاف ولا تسلی شویم کاش　　یاراں ز بزم دوست چہ خوشنود میروند

اس خصوصیت کے علاوہ کہ مرزا کی نظر محبت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے ایک
اور قابل ذکر خصوصیت مرزا کی ژرف بینی ہے یعنی ان کی نظر محبت بلکہ انسانی زندگی کے ان
حقائق پر پڑتی ہے جن کی طرف عام طور پر خیال نہیں جاتا اور ان کے کئی اشعار میں
ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو بظاہر غلط یا محبت کی توقعات کے خلاف نظر آتے
ہیں لیکن جب ان پر غور کیا جائے تو اُن کی صحت و صداقت سمجھ میں آتی ہے اور وہ
انسانی فطرت اور واقعات کے عین مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ غالب نے ۲۶ برس کی عمر
سے پیشتر ہی دو شعر ایسے لکھے تھے۔ جو اس خصوصیت کی بہترین مثال ہیں اور جنہیں
پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ شاعر کی نگہ جادو اثر پر وہ حقیقت کیسے عُریاں ہو گئی جس پر

۱؎ غالب عُرفی کی نسبت کہتے ہیں ؎　　ہو جستہ جستہ غالب ز من دستہ دستہ ام
عرفی کشاست لیک نہ چوں من زمیں پرکشا

اُردو شعر گوئی یک قلم ترک کر دی تھی۔ قیام کلکتہ کے دوران میں جب وہ فارسی غزلیں۔ قصیدے قطعے اور مثنویاں لکھ رہے تھے۔ اس زمانے میں بھی اُنھوں نے اُردو شعر کہے ہیں۔ (مثلاً چکنی ڈلی کی تعریف میں) اس کے علاوہ جب اُنھوں نے (۱۲۴۸ ہجری میں ؟) منتخب اُردو دیوان اشاعت کے لئے مرتب کیا۔ تو پرانی غزلوں کے تتمے لکھے۔ اور بعض دوسرے اشعار کا اضافہ بھی کیا۔ اس کے بعد چند ایک اہم اُردو مشاعروں کے لئے اُردو غزلیں لکھیں لیکن ان اشعار کی تعداد اس قدر تھوڑی ہے۔ کہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک کے بیس سال، مرزا کے فارسی کلام کا دَور سمجھے جا سکتے ہیں۔

نفسیاتی ژرف بینی | دوسرے دَور میں آئینہ طبیعت کا زنگ صاف ہو گیا ہے۔ فارسی ترکیبیں کم ہیں۔ اور خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہیں۔ کلام میں بیدلؔ اور صائبؔ کے بجائے عرفیؔ اور نظیریؔ کا رنگ غالب ہے۔ تشبیہیں نیچرل اور موزوں ہیں اور اظہارِ خیالات میں خلوص بہت نمایاں ہے۔ مضامین کے نقطۂ نظر سے اس دَور کی اہم ترین خصوصیت نفسیاتِ انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات ہیں۔ جو دیوانِ غالب کے صفحے صفحے پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ہم اس سے پہلے مرزا کا بیان نقل کر چکے ہیں۔ کہ جب ہوش آیا۔ تو عرفیؔ اور نظیریؔ کی تقلید نے انہیں اس سراب سے نکالا۔ جس میں بیدلؔ کی تقلید انہیں لے گئی تھی۔ عرفیؔ اور نظیریؔ کی مقبول ترین خصوصیت معاملہ بندی تھی۔ جس میں عشق و محبت کی کیفیتیں بیان ہوتی تھیں۔ لیکن معاملہ بندی کا دائرہ بہت تنگ تھا۔ محبت کی وسیع اور متفاوت دُنیا میں سے فارسی شعرا نے چند حالتیں انتخاب کر لی تھیں اور انہی کو مختلف دلآویز طریقوں سے بیان کر دیا جاتا تھا۔ غالب کے پیشِ نظر بھی انہی شعرا کے نمونے تھے لیکن ان کی نظر عہدِ اکبر کے فارسی شعراء سے بہت وسیع تھی۔ اور محبت کے تمام

وآہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی۔ اور خیالات اور معانی بھی شگفتہ اور سہل الفہم ہوتے جاتے تھے۔ اس دور ارتقا کے کئی اشعار ایسے ہیں جن میں بیدل کا رنگ غالب تھا اور کئی نہایت صاف مثلاً :-

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لئے　　آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دوسرا دور
۱۸۲۱ء – ۱۸۲۷ء

دوسرے دور میں ہم نے وہ اردو اشعار درج کئے ہیں جو نسخۂ بھوپال کی تاریخ کتابت کے بعد لکھے گئے لیکن نسخۂ شیرانی میں موجود ہیں +

مرزا کے ابتدائی طرز شاعری کے متعلق ہم یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ غالباً انیس بیس سال کی عمر تک (یعنی ۱۸۱۷ء – ۱۸۱۸ء کے قریب) وہ بیدل کی تقلید ترک کر چکے تھے اور زبان وخیال کے لحاظ سے ان کے کلام میں وہ خصوصیات آگئی تھیں جو دوسرے دور کا مابہ الامتیاز ہیں معنوی نقطۂ نظر سے شاید بہتر ہوتا کہ ہم دوسرے دور کو ۱۸۲۱ء کی بجائے ۱۸۱۷ء سے شروع کرتے لیکن ۱۸۱۷ء تا ۱۸۱۸ء تک کے اشعار معین کرنے کا ہمیں قیاس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں اس لئے ہم نے دوسرے دور کو ۱۸۲۱ء سے شروع کیا ہے تاہم جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ۱۸۲۱ء سے بہت پہلے مرزا اپنا طرز شاعری بدل چکے تھے اور جن اشعار کو ہم نے دور اول کے ضمن میں درج کیا ہے۔ ان میں کئی اشعار ایسے ہیں جو زبان اور مضمون کی خصوصیات کے لحاظ سے دوسرے دور کے سمجھے جانے چاہئیں +

مرزا کا دوسرا دور شاعری ہم نے ۱۸۲۷ء پر ختم کیا ہے اس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ ان کی توجہ اردو کی نسبت فارسی کیطرف زیادہ ہوگئی اور ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۷ء تک انہوں نے زیادہ تر فارسی زبان میں شعر کہے ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ انہوں نے

تب ترک کیا۔ لیکن چونکہ نسخۂ حمیدیہ میں صاف اور اعلےٰ درجے کے اشعار کی تعداد بہت کافی ہے اس لئے قرین قیاس ہے۔ کہ ۲۰-۲۲ سال کی عمر تک یعنی دہلی آنے کے پانچ چھ سال بعد وہ ابتدائی طرز بالکل ترک کر چکے ہو نگے۔ مرزا نے جس طریقے سے اپنا اسلوب نگارش بدلا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ ذیل کے مطلعوں والی غزلیں اور اپنا اردو کا بہترین قصیدہ وہ ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھ چکے تھے:۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی	سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے	کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	امتحاں اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ سہی
جبتک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مندرجہ بالا غزلوں کے علاوہ بھوپالی نسخہ میں کئی صاف اور بلند پایہ اشعار ایسے ہیں جن میں بیدل کا رنگ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ اور جو دورِ ثانی کے بہترین اشعار کے ہم پایہ اور طرز تحریر کے لحاظ سے انہی کے مشابہ ہیں۔ مضمون اور زبان کی خصوصیات کے لحاظ سے نوجہ اشعار دوسرے دور کے اشعار کے ساتھ ترتیب دئے جانے چاہئیں۔ لیکن قیاس آرائی کے سوا ان کی تدوین کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ اور ہم نے خارجی شہادت کی بنا پر انہیں نسخہ بھوپالی کی باقی غزلوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ویسے یہ ظاہر ہے۔ کہ بیس ۲۰ سے پچیس ۲۵ برس کی عمر تک مرزا نے جو اشعار لکھے وہ اس زمانے کی یادگار ہیں۔ جب انکی زبان

جب بعد میں فارسی شعرا کے مطالعہ یا دوسرے اثرات سے طبیعت پر تصوف کا رنگ زیادہ چڑھا۔ تو غالب نے مندرجہ بالا مطلع کی بجائے ذیل کا مشہور مطلع لکھ دیا جو صوفیانہ خیالات کا آئینہ ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں!

یہ زمانہ مرزا کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ لہٰذا بظاہر اس میں عشق و محبت کے مضامین کی فراوانی ہونی چاہیئے لیکن اس زمانے میں مضامین محض خیالی تھے قلبی واردات کا اظہار نہ تھے۔ اسلئے عنفوان شباب کا کلام ہونے کے باوجود اس دور شاعری میں بہت عشقیہ اشعار نہیں +

اس زمانے میں مرزا نے کئی قصیدے منقبت میں لکھے اور بہت سی اردو غزلوں میں بھی حضرت علی سے متعلق اظہار عقیدت کیا ہے لیکن بعد میں بالخصوص بعد کی اردو غزلوں میں یہ اظہار اس کثرت سے نہیں۔ مرزا کو ابھی تک کسی دربار تک رسائی کی ضرورت نہ تھی اس لئے پہلے دور میں مدحیہ قصیدہ کوئی نہیں +

بالعموم یہ کہنا صحیح ہے کہ مرزا کی اس زمانے کی شاعری کتابی اور دماغی شاعری ہے۔ مرزا کی جن خصوصیات پر لوگ سر دھنتے ہیں ان کا وجود دکھائی دیتا ہے لیکن اس دور کو سرے سے بے فائدہ نہیں کہا جا سکتا۔ بیشک اس زمانے کی اصلی پیداوار بے کیف ہے لیکن دماغی کاوش و محنت کی جو عادت اس زمانے میں پڑی تھی وہ مفید تھی اور جب مرزا نے اسے صحیح طریقے سے استعمال کیا تو اس کاوش و محنت کی بدولت مرزا کے اشعار تازگی، ندرت اور فکر کی گہرائی میں سب سے بڑھ گئے +

مادۂ ایہام رسی | یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا نے یہ طرز شاعری

کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں کتابی اور مروجہ تشبیہوں پہ زورِ دماغ صرف کرکے انہی سے
ایک نیا خیال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس طرح یہ اشعار حقیقت سے بہت دور
ہوگئے ہیں۔ مثلاً شعرا شانہ کو ہاتھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مرزا نے اس تشبیہ کو کسی نفسیاتی
حقیقت کی وضاحت یا طرزِ ادا کی دلکشی کے لئے تو شاید کہیں استعمال نہیں کیا۔ لیکن تشبیہ کے
مختلف پہلوؤں پہ نظر کرکے اور نئے پہلو سوچ کر انہی پہلوؤں کو مضمونِ شعر قرار دیا ہے۔ مثلاً

کس کا دل زلف سے بھاگا کہ اسد — دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

ایک شعر میں اس تشبیہ کو بطور تشبیہ کے استعمال کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی اس کے اتنے
دور از کار اور غیر طبعی پہلو پر توجہ کی ہے۔ کہ اس سے نفسِ مضمون میں اور پیچیدگیاں پڑ جاتی
ہیں۔ اور کوئی شاعرانہ خوبی بھی پیدا نہیں ہوتی ؎

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں — جوں شانہ پشتِ دست بہ دنداں گزیدہ ہوں

ناصر علی سرہندی اور غنی کے مقلدین تو ان اشعار کو "ندرتِ خیال" اور "مضمون آفرینی"
کا بہترین نمونہ سمجھتے۔ لیکن مرزا متاخرین فارسی شعرا سے بہتر مذاقِ شعر رکھتے تھے۔ اور وہ
آہستہ آہستہ سمجھ گئے۔ کہ یہ "خیالی قلابازیاں" کمالِ شاعری نہیں +

ان خصوصیات کے علاوہ ظرافت جو مرزا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کا بھی اس
زمانے میں نشان نہیں ملتا۔ تصوف کے اشعار بھی ایک دو ہیں اور وہ بھی محض رسمی۔ چنانچہ
یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ان کا مشہور اردو قصیدۂ منقبت تو ۲۵ سال کی عمر سے پہلے
لکھا جا چکا تھا۔ لیکن اس وقت مطلع یہ تھا ؎

توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں
سجدۂ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

کثرت سے زباں بہت ثقیل ہوگئی تھی اور چونکہ مضامین بھی عجیب و غریب اور عوام مشاہدے یا میلانِ شاعری سے بہت دور تھے اس لئے ان اشعار کا سمجھنا آساں نہیں۔ اس کے علاوہ یہ استعارات شاعرانہ حسن سے بھی عاری ہیں بلکہ ان میں آکثر سے سادگی اور فصاحت زیادہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی تمام محنت عجیب و غریب خیالات اور دور از کار تشبیہیں ڈھونڈنے میں صرف ہوتی تھی شعریت کی طرف وہ توجہ نہ کر سکتے تھے۔ مرزا اس دور کے ایک مطلع کی نسبت خود لکھتے ہیں "اس مطلع میں خیال ہے دقیق مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن لطف زیادہ نہیں"۔ یہ مطلع حسب ذیل ہے ؎

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

مرزا کی اہم ترین خصوصیت انسانی فطرت سے واقفیت ہے جو ان کے بعد کے کلام کے ہر صفحے سے ظاہر ہوتی ہے لیکن ابتدائی دور میں اس کا وجود قریب قریب عنقا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف استعارہ بیدار ہم تھے بلکہ جیسا کہ غالب نے خود کہا ہے "مضامین بیتر خیالی" تھے۔ یہ استعارے کسی طبعی یا نفسیاتی حقیقت کا بیان نہ تھے بلکہ ان کا وجود فقط شاعر کے بے پرواہ دماغ میں تھا کیونکہ ان کی بنیاد محض رعایت لفظی پر ہے اور وہ معنوی حسن سے بالکل عاری ہیں مثلاً

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں میرے ہاتھوں کو خدا باندھتے ہیں

یا

اسد قربانِ لطفِ جورِ بیدل جبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

یا

شاید کہ مر گیا ترا رخسار دیکھ کر پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

غالب کی شاعری کے پانچ دور

ہم نے ارمغانِ غالب میں مرزا کے کلام کو ردیف وار نہیں بلکہ سن ترتیب سے شائع کیا ہے۔ اور ان کی شاعری کے پانچ دور قرار دیئے ہیں۔ پہلے دور میں اُن اشعار کا انتخاب ہے جو پچیس برس کی عمر (۱۸۲۱ء) سے پہلے لکھے گئے۔ اور قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں درج ہیں۔ دوسرے دور میں وہ اشعار ہیں۔ جو قلمی نسخہ بھوپال کے متن میں درج نہیں۔ لیکن دیوان غالب کے اس قلمی نسخہ میں موجود ہیں۔ جو علامہ شیرانی کے کتب خانہ میں ہے۔ اور جس میں ۱۸۲۷ء سے پہلے کے اشعار ہیں۔ تیسرے دور میں اس زمانے کے اشعار ہیں۔ جب مرزا کی توجہ بیشتر فارسی شعر گوئی کیطرف تھی اگرچہ کبھی کبھار وہ کسی ضرورت سے اُردو اشعار بھی کہہ لیتے تھے۔ اس دور میں ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک کے فارسی کلام کا انتخاب اور اس زمانے کے اُردو اشعار ہیں۔ چوتھا دور مرزا کا درباری دور ہے۔ اس میں ہم نے وہ اُردو اشعار درج کئے ہیں۔ جو ۱۸۴۷ء کے بعد اور ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھے گئے۔ اور اس زمانے کے فارسی اشعار کا انتخاب بھی درج کیا ہے۔ پانچویں دور میں ان اردو فارسی اشعار کا انتخاب ہے جو ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے گئے۔

کلامِ غالب کی تاریخی تدوین سے ہم نے مرزا کی شاعرانہ شخصیت کو نئے طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے۔ کہ جب اس نقطۂ نظر سے ان کے کلام کا غائر مطالعہ ہوگا۔ تو مرزا کی شاعری کی ارتقا زیادہ وضاحت اور صحت سے لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ اس تدوین کے دوران میں ہمیں جو باتیں قابلِ ذکر معلوم ہوئیں۔ ان کا ملخص نذرِ ناظرین ہے۔

ابتدائی دور

ابتدائی دور کی نسبت عام طور پر معلوم ہے۔ کہ فارسی الفاظ اور تراکیب کی

غالب اس انتہائی شاعرانہ بلندی پر تو کبھی نہیں پہنچے لیکن کہیں کہیں کی بیباکی جو اس
اسلوب کو ممتاز کرتی ہے۔ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی اور تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں
ظاہر ہوتی مثلاً حمد میں کہا ہے ع

اے فلکہا حباب قلزم تو

یا ایک فارسی مصرع ہے ع

حوتا کہ گنبد چرخ کہن مرو برد

یا

از مہر جہاں تاب امید نظرم نیست — ایں تشت پر از آتش سوزاں بسرم ریز

قدیم یونانی ڈرامہ میں ٹریجیڈی کا ہیرو ایک غیر معمولی اوصاف کا آدمی ہوتا تھا جن
مشکلوں سے اُسے واسطہ پڑتا۔ وہ انسانی بس کی نہ ہوتیں مگر وہ پھر بھی ہمت نہ ہارتا۔ غالب
نے اپنی زندگی کے متعلق یہی خیال تشبیہوں کی مدد سے ظاہر کیا ہے۔ اور ان میں سے ایک دو
تو اس قدر موزوں ہیں کہ ان سے بہتر خیال میں نہیں آسکتیں ؎

بوادئے کہ دراں خضر را عصا خفت است — بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفت است

یعنی زندگی کی ایک ایسی دشوار گزار وادی میں جہاں خضر کی رہنمائی کسی کام نہیں دیتی اور جہاں میرے
پاؤں چلنے سے عاجز ہیں وہاں میں سینے کے بل چل رہا ہوں۔

غالب نے ایک اور جگہ اپنی حالت اور انسانی بےبسی کی تصویر نہایت واضح اور مؤثر
تشبیہوں کی مدد سے پیش کی ہے فرماتے ہیں ؎

می ستیزم با قضا از دیرباز — خویش را بر تیغ عریاں میزنم
لعب با شمشیر و خنجر می کنم — بوسہ بر ساطور و پیکاں میزنم

گھونسلا بنایا ہے یا "گُلِ دستارِ یار" کو سوا نیزے پر آئے ہوئے "آفتابِ صبحِ محشر" سے مانا قرار دیا ہے۔ لیکن بعد کی تشبیہیں اس طرح شاعرانہ حُسن یا موزونیت سے عاری نہیں۔ وہ نئی ہیں۔ لیکن اس لئے کہ جن مضامین کی توضیح کے لئے انہیں استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی نئے تھے۔ مثلاً

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بشرع آویزد حق میجوز مجنوں کم نہ آرے — کہ دل با محمل است اما زباں با ساربان دارد

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر — بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

غم چو بہم درافگند رو کہ مراد میدہد — دانہ ذخیرہ می کند کاہ بباد میدہد

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے — کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

تشبیہ اور استعارہ کا استعمال فقط مضمون کی وضاحت کے لئے ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک کامیاب شاعر کے استعارے بسا اوقات اس کے مضامین سے بھی زیادہ دلآویز ہوتے ہیں۔ حافظ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اور ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے بھی عمر خیام کی ایک رُباعی کا ترجمہ کیا ہے:-

Ah, Love! could you and I with Fate conspire
To grasp this sorry Scheme of Things entire,
Would not we shatter it to bits—and then
Remould it nearer to the Heart's Desire!

خصوصیت سے ڈاکٹر بجنوری نے بہت سراہا ہے۔ بعض لوگوں کو بڑی پسند ہے۔ سادہ ہندوستان
میں اکثر ایسے اشعار پسند کئے جاتے ہیں جن کے لکھنے اور سمجھنے کے لئے ذہن پر زور دینا پڑے۔
چنانچہ سنسکرت میں چند ایک ایسی نظمیں مشہور ہیں۔ جنہیں دائیں سے بائیں پڑھا جائے تو
رام کی تعریف ہوتی ہے اور اوپر سے نیچے پڑھیں تو کرشن کی لیکن ظاہر ہے کہ ایسے
اشعار کا تعلق دل سے نہیں دماغ سے ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں کمال شعر گوئی سمجھا جائے تو
شاعری جسے دلی جذبات کا اظہار ہونا چاہیے معموں کا ایک مجموعہ بن جاتی ہے +

باقی تین خصوصیتیں ضرور قابل تعریف ہیں اور حالی نے مناسب مثالوں سے
انہیں بہت واضح کر دیا ہے ڈاکٹر بجنوری نے ان مثالوں میں اضافہ کیا ہے اور اپنی
کتاب کے باب نہم میں ان تشبیہوں کی مثالیں دی ہیں جو غائر مشاہدۂ فطرت پر مبنی ہیں
لیکن جن ترکیبوں کو انہوں نے مرزا کی الفاظ سازی اور جوش نگاری کا نمونہ بتایا ہے (صفحہ ۱۴۴)
ان کا حسن وعالب بھی استعارے ہی ہیں جس سے دو لفظوں میں غالب نے ایک مکمل تصویر
کھینچ دی ہے۔ مثلاً موجِ نگہ، وادیٔ خیال، فردوسِ گوش، دامِ تمنا وغیرہ۔ فی الحقیقت
مرزا تشبیہ اور استعارہ کے بادشاہ تھے اور دنیا کے شاید ہی کسی شاعر کے کلام میں نئی
اور موزوں تشبیہوں اور استعاروں کی وہ افراط ہو جو ان کے کلام میں ہے +

غالب کی تشبیہیں اور استعارے

مرزا کا بہت سا ابتدائی اردو کلام صائب کے رنگ
میں تھا اور اکثر غزلوں میں مصرع ثانی تمثیلی
ہوتا تھا جو تشبیہوں کی افراط اس زمانے کے اشعار میں تھی وہ بعد کے اشعار میں نہیں
یہ صحیح ہے کہ یہ تشبیہیں نئی تھیں لیکن ان میں سے کئی انگریز شاعر جان ڈن کی تشبیہوں
کی طرح غرابت سے خالی نہ تھیں۔ مثلاً جہاں مرزا نے اپنے تئیں طائرِ رنگ پریدہ کا

کیا ہے۔ وہ وسیع مطالعہ اور غور و خوض پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کی تصنیف کو محاسن کلامِ غالب کا جواب سمجھنا چاہیئے۔ ان کی کتاب میں جنوبی ہندوستان کی باقاعدگی اور منطق ہے اور کلامِ غالب کا مطالعہ جن اصولوں پر انہوں نے کیا ہے۔ وہ شاید ضرورت سے زیادہ کڑے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ ایک تو غالب کے متعلق اندھی خوش اعتقادی کا جو سیلاب بہا آتا تھا۔ اسے انہوں نے روکا اور الہلال کے اجرا کے بعد جو جذباتی طرزِ تحریر اور طرزِ تنقید اردو میں عام ہو گیا تھا اس کی اصلاح کی کوشش کی۔ دوسرے غالب اور کلامِ غالب کے متعلق کئی اہم باتیں تھیں۔ جن کی طرف سب سے پہلے انہوں نے توجہ دلائی۔ لیکن شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرزِ تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متفق ہوں گے۔ کہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو انگریزی سے قریب قریب نابلد تھا یعنی حالی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یادگارِ غالب پرانے اصولوں پر لکھی گئی ہے۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا ہے۔ اس میں کئی خامیاں ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اور تبصرہ ایسا نہیں شائع ہوا۔ جس میں اس سے کم خامیاں ہوں۔ اور پھر یادگار کے مطالعہ سے یک طرفہ اور غیر معتدلانہ رائے قائم ہونے کا کوئی احتمال نہیں جو ڈاکٹر بجنوری یا ڈاکٹر لطیف کی کتابوں سے قائم کی جاسکتی ہے۔

کلامِ غالب کی خصوصیات

حالی نے مرزا کے کلام کی چار خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ ایک تو جدّتِ مضامین اور طرفگیٔ خیالات کے علاوہ ایسی تشبیہوں کا استعمال جو نہ صرف نئی تھیں۔ بلکہ اظہارِ مطالب کے لئے بھی بہت موزوں تھیں۔ دوسرے استعارہ اور کنایہ کا زیادہ استعمال تیسرے شوخی اور ظرافت۔ چوتھے ایسے اشعار کی بہتات جن کے ایک سے زیادہ معنی لئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے چوتھی

غالب کی تصنیفات کی خصوصیات بیان کر دے مشکل اشعار کی الجھنیں صاف کر دے اور
اس کی تصنیفات کا ایک نمایاں حصہ طویل فارسی کلیات اور دوسری تصانیف سے اصحاب نظر کے
ناظرین کے سامنے پیش کر دے تاکہ وہ اسے سمجھ کر اس میں اس کی خوبیوں کے مطابق دلچسپی
لینا شروع کریں۔ کتاب میں جہاں کہیں غالب کا اردو اور فارسی شاعروں اور شارحوں کے
ساتھ مقابلہ کیا ہے وہاں بھی سلامت روی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ اور کوئی رائے ایسی نہیں
ظاہر کی جو بے انصافی اور جنبہ داری پر مبنی ہو۔

بجنوری۔ لطیف

یادگار کے بعد غالب کے متعلق مضامین اور کتب کا سلسلہ اب تک
برابر جاری ہے۔ متعدد کتابیں اردو دیوان کی شرحیں ہیں جن میں
ضمناً مرزا کے حالات درج ہیں اور ان کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے مستقل اور قابل ذکر کتابیں
جو یادگار غالب کے بعد غالب کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ دو ہیں[1] محاسن کلام غالب اور
ڈاکٹر لطیف کی کتاب۔ جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے ابھی تک حالی سے آگے کوئی
نہیں بڑھا اور اگرچہ ڈاکٹر لطیف کی کتاب میں اور حالات کے بہت سے قیمتی اصول درج
ہیں ان اصولوں پر عمل کرنے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی مرزا
کی اردو نثر اور فارسی نظم و نثر پر کوئی تبصرہ یادگار سے بہتر آج تک شائع نہیں ہوا البتہ ان کے
اردو کلام کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یادگار کے بعد دوسری کتاب ڈاکٹر بجنوری کا مقدمہ
تھی بدقسمتی سے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے اس میں کئی فقرے ایسے لکھ گئے ہیں جو حقیقت سے
زیادہ عقیدت پر مبنی ہیں اور انہوں نے کئی اشعار کو بھی ایسے معنی پہنائے ہیں جو شاعر کے
خیال میں نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا مقدمہ اردو کی ایک قابل ذکر تصنیف ہے ایک تو طرز تحریر
اور زور عبارت کے نقطۂ نظر سے۔ اور دوسرے کلام غالب کے کئی پہلوؤں پر جو تبصرہ انہوں نے

[1] یہ اندراج ۱۹۳۶ء کا ہے۔

یادگارِ غالب کا تنقیدی حصّہ نفسِ مضمون کے لحاظ سے چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے دو حصوں میں اُردو نظم اور اُردو نثر پر تبصرہ ہے۔ اور باقی دو حصّوں میں فارسی کلام اور فارسی نثر پر فنی نقطۂ نظر سے یادگارِ غالب کا تنقیدی حصّہ اس قدر عمیق اور بلند پایہ نہیں جس قدر مقدمہ دیوانِ حالی۔ لیکن اس طویل حصّۂ کتاب کے صفحے صفحے سے حالؔی کی سلامت روی، حُسنِ مذاق اور عوام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور ان کی استعداد کے مطابق طرزِ تحریر اختیار کرنے کی قابلیت نمایاں ہے۔ کتاب کا مقصد عوام کو مرزا کی شخصی اور ادبی خوبیوں سے واقف کرانا تھا۔ اس لئے وہی اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا۔ جو اس مقصد کے حصُول کے لئے موزوں تھا۔ کتاب کا بہت سا حصّہ اُردو اور فارسی نظم و نثر کے نہایت بامذاق انتخاب پر مشتمل ہے۔ مشکل اشعار کا مطلب آسان اُردو نثر میں شعر کے ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اور جہاں کہیں کسی شعر کے متعلق مزید تشریح یا تبصرے کی ضرورت تھی۔ وہاں وہ بھی مہیّا کر دیا ہے۔ ہر حصّے کے شروع میں ایک عام تبصرہ ہے۔ جس میں نفسِ مضمون کے مطابق اُردو یا فارسی نظم و نثر کی خصوصیات درج کی ہیں۔ اور انہیں مثالوں سے واضح کیا ہے۔ تمام کتاب میں حالؔی نے کہیں خطیبانہ جوش و خروش یا مبالغے سے کام نہیں لیا۔ ناظرین کو مرعوب کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں۔ شروع سے اخیر تک مصنّف کی یہی کوشش رہی ہے۔ کہ سیدھے سادھے الفاظ میں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸۵)
آج بھی جبکہ حالات بہت بہتر ہیں۔ اور غالب کی شہرت کو کسی جائز تنقید سے ضعف پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہیں۔ غالب نامہ کے بعض اندراجات سے متاثر ہو کر قتیل اور غالب کے مصنف نے غالب کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ حالؔی کے لئے "کمُکمل طریقہ سے" غالب کی سوانح عمری لکھنا کس قدر خطرناک تھا +

باتیں دھیان میں رکھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یادگار غالب میں کوئی اصولی غلط بیانی یا بے انصافی نہیں۔ دوسرے یہ کہ حالی خود طبعاً اسقدر نیک تھا۔ کہ اس کی نظر دوسروں کی نیکیوں پر ہی پڑتی حالی کی یہ "نگاہ پاک بیں" ایک نقادانہ خوبی نہ سہی لیکن اس کی اخلاقی پاکیزگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض وجوہ ایسے تھے جن کی بنا پر حالی نے قصداً غالب کی خامیاں نمایاں کرنے سے احتراز کیا۔ حالی نے جس وقت یادگار غالب لکھی اس وقت غالب کی شہرت عام اور مسلمہ نہ تھی۔ اور کتاب کی تصنیف کا مقصد عوام کو غالب سے روشناس کرانے کا تھا۔ اب اگر ایسی حالت میں حالی نے خوبی سے شاعر کے تمام نقائص نمایاں کر دیتا تو ڈر تھا کہ ان کی بنا پر ظاہر بیں عوام بدک جاتے اور کتاب کی تصنیف کا اصلی مقصد فوت ہوجاتا حالی نے خود اس الجھن کا اظہار حیاتِ جاوید کے دیباچے میں کیا ہے اور اپنی ابتدائی سوانح عمریوں (حیاتِ سعدی اور یادگار غالب) کی نسبت لکھا ہے :-

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب ناصواب کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی مکمل طریقے سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں چنانچہ اسی خیال سے ہم نے خود دو ایک معمولی لائف اس سے پہلے لکھی ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ ان کے نقصوں کو کہیں ظاہر نہیں کیا ہے"

لہ حالی نے خود تسلیم کیا ہے کہ ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی" لیکن جن حالات میں یادگار غالب لکھی گئی ان کا خیال کرتے ہوئے حالی کا طریق کار ہی صحیح معلوم ہوتا ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بے ترتیبی سے لکھے گئے ہیں۔ اور تاریخی تسلسل کا لحاظ نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کتاب میں سطحی واقعات درج ہیں۔ لیکن غالب کی ذہنی نشو و نما اور اس کی باطنی کشمکشیں اور الجھنیں نمایاں کرنے کی کوئی کوشش نہیں۔ تیسرا اعتراض ہے۔ کہ یادگار میں شاعر کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی گئی ہے۔ وہ ہو بہو واقعات کے مطابق نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراضات بالکل بے وزن نہیں۔ لیکن ان سے کتاب کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یادگار میں تاریخی تسلسل نہیں لیکن اس میں ایک قسم کا فنی تسلسل ضرور ہے۔ کتاب پڑھتے وقت اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ کہ اس میں واقعات بے ترتیبی سے درج ہیں۔ اور اندراجات کی دلچسپی کا یہ عالم ہے۔ کہ کتاب شروع کر کے ختم کئے بغیر اسے بند کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم سوانح نگاری میں تاریخی تسلسل کی اہمیت مانتے ہیں لیکن اس کا فقدان ایک ایسی کمی ہے۔ جس کی تلافی دوسری خوبیاں بآسانی کر سکتی ہیں۔ اور اگر دوسری خوبیاں موجود نہ ہوں۔ تو اس کی موجودگی ایک ایسی بڑی خوبی نہیں۔ کہ دوسری کوتاہیوں کو چھپا سکے۔ حالی نے حیاتِ جاوید میں سرسید کے واقعاتِ زندگی بڑی باقاعدگی اور تاریخی تسلسل سے لکھے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یادگارِ غالب حیاتِ جاوید کی نسبت بدرجہا زیادہ کامیاب سوانح عمری نہیں!

یادگار میں نفسیاتی تعمق کی کمی کی جو شکایت ہے۔ وہ ضرور صحیح ہے۔ لیکن اگر یہ کمی یادگارِ غالب میں ہے۔ تو اس دور کی کونسی سوانح عمری ہے۔ جس میں یہ کمی نہیں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ علمی نفسیات کی نشو و نما مغرب میں بھی حال ہی کی چیز ہے۔ اور حالی سے اسکی توقع رکھنا بے انصافی ہے۔ تیسرا اعتراض بھی بالکل بے جا نہیں۔ اور یادگارِ غالب کے چند ایک بیانات ایسے ہیں جن میں سوانح نگار کے حسن ظن کو دخل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں دو تین

ریسرچ[1] کا ثمرہ ہیں بہت حد تک تو یہ تحقیق و تفتیش غالب کی اپنی تصنیفات میں کی گئی۔
لیکن یادگارِ غالب کی تصنیف کے وقت بہت سے ایسے اصحاب زندہ تھے جنہیں مرزا سے ملنے
اور ان کے واقعاتِ زندگی جاننے کا موقع ملا تھا حالی نے ان کی معلومات سے فائدہ اٹھایا اور
اسی کتاب میں کئی ایسے واقعات درج کر دئے جن کی تفصیلات غالب کی کتابوں میں نہیں
حالی کی کتاب کے دو بڑے حصے ہیں پہلا سوانحی۔ دوسرا تنقیدی پہلے حصے
پر حال میں کئی اعتراض کئے گئے ہیں ایک بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ اس میں واقعات

[1] یادگارِ غالب میں سن اور تاریخ کی دو تین معمولی غلطیاں ہیں مولانا مہر نے اپنی کتاب میں
انہیں پھیلا کر حالی پر نکتہ چینی کی ہے لیکن ان غلطیوں کو غور سے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ حالی کو ان امور
میں سہو اس لئے ہوا کہ اس نے غالب کی اپنی تصنیفات سے معلومات اخذ کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً
غالب کے سفرِ کلکتہ کی غلط تاریخ غالب کے ایک اردو خط پر مبنی ہے اور سفرِ لکھنؤ کے دوران میں [illegible]
اودھ اور نائب السلطنت کے ناموں میں حالی نے جو غلطی کی ہے وہ اس فارسی قصیدے کی بنا پر ہے
جس میں سفرِ لکھنؤ کے حالات ہیں اور جس میں نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ بہادر کے نام آتے
ہیں غالباً یہ قصیدہ اس وقت لکھا گیا جب غازی الدین حیدر بادشاہِ سلطنت اور معتمد الدولہ نائب تھے
(اسکے بعض اشعار کلیاتِ غالب کے دیباچہ میں درج ہیں) لیکن چونکہ اس وقت پڑھا نہ گیا بعد میں ناموں کی تبدیلی
سے پیش ہوا غالب نے بعد کے ناموں کو ہی اصل نام سمجھا اور غلطی میں مبتلا ہو گیا حالی کو تحقیق و تنقید کی وہ بعض
سہولتیں (مثلاً مکمل جنتریاں۔ شاہانِ اودھ کی انگریزی اور اردو تاریخیں اور اصل [illegible] موجودہ تذکرہ نگاروں کو
میسر ہیں اور دو ایک غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا جن سے مہر صاحب کی کتاب غالب نامہ محفوظ ہے لیکن پھر بھی
یادگارِ غالب میں تحقیق و ریسرچ کی مخلصانہ اور بالعموم کامیاب کوشش کے آثار نمایاں ہیں۔

حالی کی کتاب کو سوانح نگاری کا معجزہ سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کتاب کو غالب کی شہرت اور مقبولیت میں اتنا ہی دخل ہے۔ جتنا دیوان غالب اور اردوئے معلّے کو۔ حالی کی کامیاب سوانح نگاری کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ کہ عام طور پر اب یہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ حالی اور غالب عمر بھر ایک دوسرے کے رفیق رہے۔ اور ایک نقاد نے اس بات کی شکایت کی ہے۔ کہ حالی جو غالب کی رفاقت کی وجہ سے اُس کی شاعرانہ زندگی کے مختلف دوروں اور اردو غزلوں کے سنینِ تصنیف سے واقف تھا۔ اس نے شاعر کے کلام کو کیوں نہ تاریخی ترتیب سے مرتب کر دیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حالی کو مرزا کی رفاقت کا کوئی خاص موقع میسّر نہیں آیا۔ غدر سے پہلے حالی فقط دو سال دلّی رہا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اور وہ گھر سے رُوپوش ہو کر ایک بے سروسامان طالب علم کی طرح دہلی آیا تھا۔ اس اثنا میں اسے غالب کو عام مشاعروں میں غزل پڑھتے دیکھنے اور کبھی کبھار اپنا کلام سُنانے کا موقع ملا ہوگا۔ لیکن یہ بعید از قیاس ہے۔ کہ وہ غالب جیسے امیر طبع انسان کا گہرا دوست یا ہر وقت کا رفیق ہوگیا ہو۔ اور نہ ہی غالب کے خطوط یا کسی اور معاصرانہ شہادت سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ حالی کو غالب سے ملنے اور غالب کے حالاتِ زندگی جاننے کا زیادہ موقع اس وقت ملا۔ جب وہ مرزا کے قدیمی دوست اور محسن نواب مصطفٰے خاں کے لڑکوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ اور نواب صاحب کے ساتھ گاہے گاہے دہلی آنے جانے لگا۔ لیکن اس زمانے میں بھی غالب کا کوئی خط حالی کے نام نہیں ملتا۔ اور نواب مصطفٰے خاں کے نام کے ایک خط میں جو حالی کا سرسری ذکر ہے (" مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام") اس سے بھی کسی تپاک کا اظہار نہیں ہوتا۔ ہمارا اپنا خیال ہے۔ کہ یادگارِ غالب کے اندراجات ذاتی تعلقات اور معاصرانہ مصاحبت کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ بیشتر مورخانہ تحقیق اور

یادگارِ غالب | ہم ذکر کر چکے ہیں کہ شعرا کے تذکروں میں غالب کو اس وقت سے جگہ ملنی شروع ہو گئی تھی جب ابھی وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی نہ آئے تھے۔

لیکن ان تذکروں میں کئی خامیاں تھیں ایک تو ان میں اتنے شعرا کا تذکرہ ہوتا تھا کہ کسی ایک کے متعلق تفصیلی حالات کی گنجائش نہ رہتی دوسرے ترتیب الف بائی ہوتی تھی اس لئے ان میں تاریخی تسلسل نہ تھا جب مولانا آزاد نے ان نقائص کو محسوس کر کے اردو شاعری کی نئے طرز سے تاریخ لکھی تو انہوں نے غالب کو بھی اپنی کتاب میں باعزت جگہ دی اور یادگارِ غالب سے پہلے غالب کا مفصل ترین تذکرہ آبِ حیات ہی میں تھا لیکن آزاد ذوق کے شاگرد تھے اور اردو کے بہترین انشا پرداز جہاں کہیں انہیں اپنے استاد کا پلہ ہلکا نظر آتا، وہ دلائل کی کمی انشا پردازی سے پوری کر دیتے۔ چنانچہ غالب کے حالات حالی کے مذاق کے مطابق نہ ہوئے اور ۱۸۹۷ء میں حالی نے اپنی مشہور کتاب یادگارِ غالب لکھی۔

میرزا کی وفات کے بعد ریاست لوہارو کی طرف سے مرزا کی بیوہ کے لئے پنشن مقرر ہو گئی تھی۔ لیکن انہیں وہ بہت دن لینی نصیب نہ ہوئی۔ مرزا کی وفات ۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ ہجری کو ہوئی تھی۔ اور اس کے ایک سال بعد عین ان کی برسی کے دِن[۱] امراؤ بیگم بھی اپنے رفیقِ حیات سے جا ملیں ۔

بوجھ تھوڑا بہت ضرور ہلکا ہوگیا ہوگا قرضے کی ادائیگی اور امراؤ بیگم کی ضروریات کے لئے انکے چچازاد بھائی اور مرزا کے عزیز شاگرد نواب ضیاءالدین نیر و رخشاں اور ان کے بھائی نواب لوہارو نے مدد کی مولانا مہر لکھتے ہیں :۔

نواب سر امیرالدین احمد خاں مرحوم فرماتے تھے کہ نواب ضیاءالدین احمد خاں نے قرض خواہوں سے کچھ رقم معاف کرا کے باقی رقم اپنے پاس سے ادا کردی تھی۔ اور امراؤ بیگم کے لئے پچیس روپے یا پچاس روپے ماہوار لوہارو سے مقرر ہو گئے تھے جو تادم وفات انہیں باقاعدہ ملتے رہے تھے۔

اس سے پہلے بھی 'غدر' کے بعد مرزا کی پنشن انگریزوں کی تنخواہ بند ہوئی تھی تو نواب ضیاءالدین نے ہمت اور جوانمردی سے کام لیا اور امراؤ بیگم کے لئے پچاس روپے ماہوار کا انتظام کردیا مرزا کو بھی اس کی توقع تھی اور آخری ایام میں جب انہیں ایسے دلشکن کا خیال مضطرب کرتا تو وہ دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ بیوی کے لواحقین اسے بھوکا نہیں مرنے دیں گے وہ نواب امین الدین رئیس لوہارو کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

میری روح تمہاری جس 'میرے بچے تمہارے بچے ہیں خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعاگو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں تمنا یہ ہے اور انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں (نواب امین الدین اور نواب ضیاءالدین) کے سامنے مر جاؤں تاکہ اگر میں تالے کو روٹی نہ دو گے تو جیسے تو دو گے اور اگر جیتے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے میں تو موافق اپنے تصور کے ان عمر دکھ کے غم میں نہ گھلوں گا۔

بیگم صاحبہ اپنے شوہر کی روش کے خلاف مذہبی خیالات کی تھیں انہیں ان ہجوم مصائب میں بھی اپنی تکلیفوں سے زیادہ اس امر کا خیال تھا۔ کہ کسی طرح مرزا صاحب کا قرضہ ادا ہو جائے۔ تاکہ وہ عذابِ اخروی سے محفوظ رہیں۔ اسی درخواست میں وہ آگے چلکر لکھتی ہیں:۔

"اس دعاگو کی یہ تمنا ہے۔ کہ ایسی پرورش مجھ ضعیفہ کی ہو جائے۔ کہ مرزا مرحوم حق عباد سے بری ہو جائیں۔ کہ یہ سخت عذاب ہے۔ اگر حضور صورت ادائے قرض فرماویں۔ تو کمال ثوابِ عظیم ہوگا۔"

مرزا کی خاندانی پنشن کے متعلق یہ امر تعجب انگیز ہے۔ کہ یہ یک قلم کیوں بند ہو گئی بیوہ کو پوری نہ سہی اس کا کچھ حصہ تو ملنا چاہیئے تھا۔ معلوم ہوتا ہے بیگم صاحبہ نے درخواست کی تھی۔ کہ مرزا صاحب کی پنشن ان کے پسرِ متبنیٰ حسین علی خاں کے نام منتقل کر دی جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے رپورٹ ہمدردانہ کی۔ لیکن کمشنر نے حکم دیا۔ کہ حسین علی خاں کے نام پنشن نہیں جاری ہو سکتی۔ البتہ بیوہ کو دس روپے ماہوار وظیفہ مل سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کچہری میں حاضر ہو۔ بیگم صاحبہ نے یہ رقم اور یہ شرط قبول نہ کی اور ان حالات میں وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ خود مندرجہ بالا عرضداشت میں نواب رام پور کو لکھتی ہیں:۔

"اور پنشن میری دس روپیہ انگریز کرتا ہے۔ بشرط اینکہ کچہری میں حاضر ہوں۔ اور جانا میرا کچہری میں ہرگز نہ ہوگا۔ گو فاقوں ہی مر جاؤں۔ کیا میں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کروں۔ اور جو عزت اور ریاست میرے چچا کی اور حرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص و عام کے تھی حضور پر سب روشن ہے۔"

نواب صاحب رام پور نے تو غالب کا قرضہ ادا کرنے کے لئے کوئی مدد نہ دی۔ اور نہ ہی غالب کی بیوہ کا کوئی وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن مرزا کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد حسین علی خاں رامپور میں تعینہ نمبر ۲۵ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے تھے جس سے اس آفت زدہ خاندان کا

کی درگاہ کے قریب اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے مزار کے پاس دفن ہوئے +

انا للہ وانا الیہ راجعون

بیگم مرزا غالب کی وفات

علت کی وفات سے اُردو ادب کو جو نقصان پہنچا وہ ظاہر ہے۔ ملا مسالعہ اُردو نظم ونثر کا آفتاب غروب ہو گیا لیکن ان کی وفات سے جو صدمہ ان کے متوسلین، بالخصوص ان کی باہمت بیوہ کو پہنچا ان کی شہرت اور ناموری میں کوئی حصہ نہیں لیکن جو ان کی تمام مصیبتوں، بیماریوں اور تکلیفوں میں برابر کی شریک تھی اس کا جو صدمہ ہوا ہوگا۔ اس کا تصور اب بھی جگر گداز ہے +

مرزا غالب نے اپنی وفات کے وقت اپنے ورثا کے لئے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا تھا بلکہ مرتے وقت وہ آٹھ سو کے قرضدار تھے اس کے علاوہ ان کی وفات پر آمدنی کے تمام ذریعے مسدود ہو گئے۔ مرزا کا لسر اوقات رام پور کے ماہوار مشاہرے اور سرکاری پنشن پر تھا۔ اور یہ دونوں سلسلے ان کی وفات کے ساتھ ختم ہو گئے ان کی وفات کے بعد ان کی بیوہ کی جو حالت ہوئی اس کا کچھ اندازہ اس عرضداشت سے ہو سکتا ہے۔ جو بیگم صاحبہ نے اگست ۱۸۶۹ء میں نواب کلب علی خاں کی خدمت میں ارسال کی ؛

حسب حالی احسن بعد سے مرزا اسد اللہ خاں نے وفات پائی ہے تو یہ عاجز بیوہ اس قدر مصائب میں گرفتار ہے کہ تحریر سے باہر ہے۔ اول تو مصیبت ہے کہ مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپیہ کے قرضدار مرے دوسری مصیبت یہ کہ پنشن انگریزی مسدود ہوئی تیسری یہ کہ تنخواہ سو روپیہ ماہوار، جو آپ ازراہ قدردانی کے مرزا مرحوم کو ارسال فرماتے تھے وہ بھی یکلخت موقوف ہوئی اب تک قرض لے کر اوقات لسری کی اب قرض بھی نہیں ملتا نوبت فاقہ کشی کی پہنچی

تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے۔ اور مقدار قرض پوچھی ہے" چنانچہ مرزا نے دوبارہ قرض کی مقدار لکھ بھیجی۔ اور نواب صاحب کو بھی یاد دہی کرائی۔ لیکن اس کے باوجود کوئی حکم صادر نہ ہوا۔ اور مرزا کی یہ خواہش بھی تشنۂ تکمیل رہی۔

اخیر عمر میں مالی الجھنوں اور ضعفِ قویٰ نے مرزا کو اس طرح پریشان کر رکھا تھا۔ تو جائے حیرت نہیں۔ کہ وہ موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔ اور ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے لیکن اس بے بسی کی حالت میں بھی شعر و ادب سے دلچسپی باقی تھی۔ اور خطوط لکھنے یا لکھوانے کا سلسلہ موت سے ایک روز پہلے تک جاری رہا۔ حالی لکھتے ہیں:۔

"مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا۔ پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوا۔ اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا۔ اور نواب علاءالدین احمد خاں کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ اُنہوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اسکے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا۔ لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا "کہ میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا۔ دوسرا مصرع یہ تھا۔ "نکرد ہجر مدارا ممن سر تو سلامت"۔ مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے"

وفات آخر مرزا کی مصیبتوں کے خاتمہ کا وقت آ گیا اور وہ ذیقعد ۱۲۸۵ھ کی دوسری یعنی فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں) کو تہتر (۷۳) برس اور چار مہینے کی عمر میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ تجہیز و تکفین نواب ضیاءالدین احمد خاں کی طرف سے ہوئی۔ اور حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ

لے دے کے ان کے پاس دربار رام پور کا سہارا تھا۔ انہوں نے نواب صاحب کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ آپ کچھ رقم عنایت فرمائیں تاکہ یہ کام سرانجام پائے اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔ رام پور سے اس کا حوصلہ افزا جواب گیا اور مرزا سے پوچھا گیا۔ کہ آپ کو کتنا روپیہ مطلوب ہے۔ مرزا نے لکھا کہ باقر علی خاں کی شادی پر ڈھائی ہزار روپے خرچ آئے تھے۔ "دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مرا حق خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں جو کچھ دو گے اس میں شادی کر دوں گا" مرزا کو امید تھی کہ یہاں سے کچھ مل جائے گا نواب مرزا خاں داغ اور جناب مظفر حسین خاں بہادر کی تحریریں نے اور بھی دل بڑھایا چنانچہ رام پور کے عطیہ کے انتظار میں شادی کی تاریخ بھی ملتوی ہوئی لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ مرزا ابھی اس امید میں تھے۔ اور طریقے طریقے سے نواب صاحب کو یاد دہانی کرا رہے تھے کہ انہیں قرضخواہوں نے دق کرنا شروع کیا اور شاید نالش کی بھی دھمکی دی چنانچہ مرزا نے حسین علی خاں کے لیے جو کچھ مانگا تھا۔ اس سے قطع نظر کی اور نواب سے درخواست کی کہ قرضخواہوں سے گلو خلاصی کرانے میں مدد دیں۔ وہ ۲۶ر نومبر ۱۸۶۸ء کے ایک خط میں نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

حال میرا سنو ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اس کی تنخواہ سے ۴۵ روپے بچے ۳۲ اپنے کا حصہ ماہوار کا سو سوا سو ماہ بہ ماہ دیا مگر آٹھ سو روپے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی اب اس بات میں عرض کروں کیا بحال کبھی نہ کہوں گا آٹھ سو روپے مجھ کو اور دیجئے شادی کیسی، میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔

اس درخواست کے جواب میں نواب مرزا خاں داغ نے مرزا کو لکھا کہ حضور نے

"کھانا لاؤ"۔ ہم سمجھے بہ خیالِ مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ لکھدیا۔ کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے دہلی اتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے۔ اور تکھی سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ پا بر کاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے "آپ کی غایت اس تکلیف سے یہ تھی۔ کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھے خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سُنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ کہ میں کیا کھاتا ہوں۔ اور کتنا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔" اتنے میں کھانا آیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل کھائے۔ اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے۔ کہ اس مقدارِ خوراک پر کیونکر بسر کرتے ہیں"۔

مرزا ان دنوں ایک تو ضعف و ناتوانی سے نیم جاں ہو رہے تھے۔ اور دوسرے مالی مشکلات بھی کچھ کم نہ تھیں۔ سب جانتے تھے۔ کہ اب مرزا چراغِ لبِ بام ہیں، اور یہ بھی نظر آ رہا تھا۔ کہ ان کی وفات کے بعد آمدنی کے سب ذریعے مسدود ہو جائیں گے۔ چنانچہ کوشش شروع ہوئی۔ کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے منہ بولے بیٹوں، مرزا باقر علی خاں اور مرزا حسین علی خاں کا رام پور سے وظیفہ مقرر ہو جائے۔ تاکہ ان کی وفات کے بعد اس خاندان کو کچھ تو سہارا ہو۔ اس کے علاوہ مرزا حسین علی خاں کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ لیکن منگنی ہو چکی تھی۔ اس کے سسرال والوں نے تقاضا شروع کیا۔ کہ اس فریضہ کو جلد سر انجام دو۔ مرزا کے پاس اخراجاتِ شادی کے لئے کچھ نہ تھا۔ اور قرض بھی اب کہیں سے نہ ملتا تھا۔

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی نے کھینچی ہے جو لکھنؤ سے کشمیر جاتے وقت راستے میں غالب سے
ملے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا ایک بڑا پھاٹک تھا جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے
میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسّی بیاسی
سال کا ضعیف العمر لیٹا ہوا ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے آنکھیں گڑوئے ہوئے
پڑھ رہے تھے یہ مرزا غالب دہلوی ہیں جو گمان غالب دلوں والی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی ہم کھڑے
کھڑے واپس آنے کا قصد کیا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی
اور ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سلام کیا بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے ہم کو
اپنے پاس بٹھایا قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا تھا
لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ دو نام و نشان
پوچھا ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انہوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی
مگر بے سود ہوئی جب ہم نے نام و پتہ لکھا تو کہا مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو تو
ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے کچھ اپنا کلام بھی سناؤ ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام بالمشافہ
سننے کی غرض سے آئے تھے بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کئے پھر اصرار کیا
کہ تم بھی کچھ سناؤ ہم نے یہ مطلع سنایا ؎

مہ مہر است داغ از رشک جہانے کہ من دارم
زلیخا گو رشد از حسرت جوانے کہ من دارم

بہت لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا اور جی سے ریلوہ تعریف کی پھر آدمی سے کہا

منقسم کیا۔ پہلے حصّے میں صاف صاف عبارت کے حل تحریر کئے تاکہ طلبائے مدرسہ فائدہ اُٹھائیں دوسرے حصّہ میں مطالب مشکلہ کی تحریر یا ورتقریظ وغیرہ لکھی تاکہ سخنوراں معنی یاب اس کے دیکھنے سے مزہ پائیں "لیکن پہلی اشاعت (۱۳۱۸ء) اور دوسری (۱۹۴۱ء) کے وقت فقط پہلا حصّہ ہی شائع ہُوا دوسرا حصّہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۹ء میں چھپا تب مولینا حالی کی فرمائش پر مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی نے دونوں حصّے شائع کئے۔ دوسرے حصّے پر مولینا حالی نے کچھ حاشیئے اضافہ کئے تھے۔ بقول ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس حصّے کو مولینا حالی نے ترتیب دیا۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ چونکہ یادگار غالب (۱۸۹۷ء) کی ترتیب کے وقت میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق نے حالی کو ان کی تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے مہیّا کر دئے تھے۔ اردوئے معلےٰ کا دوسرا حصّہ بھی اس سلسلے میں انہیں ملا ہوگا اسے انہوں نے خود جمع نہیں کیا مجروح کے دیباچہ سے ظاہر ہے کہ جب یہ دیباچہ لکھا گیا اس وقت دوسرا حصّہ جمع ہو چکا تھا بعض مصلحتوں (کتاب کی ضخامت یا اخراجات تخمینی؟) کی بنا پر اسے شائع نہ کیا گیا لیکن بعض نہیں آتا کہ جب یادگار غالب کی تصنیف کے وقت مجروح اور مشتاق نے حالی کو غالب کے متعلق باقی سارا مواد بھیجا تو ان کی تصنیفات کا یہ اہم حصّہ اپنے پاس رہنے دیا ہو اس کے علاوہ اگر حالی نے مرزا کی وفات کے پچیس ۲۵ سال بعد غالب کے خطوط جمع کئے۔ تو یہ عجب معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اتنی شدت سے ان اصولوں کی پیروی کی جو اردوئے معلےٰ کے مرتب کرنے والوں نے وضع کئے تھے اور ایک بھی خط اس طرح کا دوسرے حصّے میں درج نہ کیا۔ جو مجروح اور مشتاق کے مرتب کردہ اصولوں کے خلاف ہو آج آج بھی غالب کے غیر مطبوعہ خطوط تلاش سے مل سکتے ہیں۔ اگر حالی خطوط غالب کو نئے سرے سے ترتیب دے رہے تھے۔ تو چاہیئے تھا کہ

ایک خط (۱۶۴) فقط دو لفظوں پر مشتمل ہے۔ "خریدار ہے"!!

عودِ ہندی کی ترتیب اور طباعت اس بے قاعدگی سے ہوئی۔ تو چنداں جائے حیرت
نہیں کہ مرزا اس مجموعے سے مطمئن نہ ہوئے۔ ویسے اس مجموعے کی اشاعت میں ہی اس قدر تعویق
ہوئی تھی۔ کہ مرزا نے اس کی اشاعت سے پہلے ہی دوسرے مجموعے کی ترتیب شروع کر دی۔ یہ مجموعہ
۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو مرزا کے دوست حکیم غلام رضا خاں کے مطبع اکمل المطابع سے اردوئے معلیٰ
کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی تیاری میں مرزا نے بھی مدد دی۔ اور اپنے دوستوں سے خطوط
اور ان کی نقلیں منگائیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیماری کی وجہ سے مرزا اس پر نگاہِ تنقید
نہیں ڈال سکے۔ اور ایک دو ایسے خطوط، جن کا نظر انداز ہونا ہی بہتر تھا۔ شائع ہو گئے ہیں۔
کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ مجموعہ منشی جواہر سنگھ کی تحریک سے شروع ہوا۔ میر فخر الدین
مہتمم مطبع اور منشی بہاری لال مشتاق نے خطوط جمع کئے۔ اور دیباچہ میر مہدی۔ اور خاتمہ مرزا
قربان علی بیگ سالک نے لکھا۔ اس میں عودِ ہندی کی بہ نسبت کہیں زیادہ خطوط ہیں۔ عودِ ہندی
مرتب کرتے وقت خطوط زیادہ تر ان حضرات سے ملے تھے۔ جو صوبجات متحدہ میں مقیم تھے۔
اور جن تک تحریر اور منشی ممتاز علی خاں کی رسائی بآسانی ہو سکتی تھی۔ اردوئے معلیٰ میں ان خطوط کا
معتدبہ حصہ شامل کر لیا گیا ہے۔ اور اس کے علاوہ آگرہ، لوہارو، سورت، بڑودہ کے اصحاب
کے نام کے بہت سے خطوط ہیں۔ عودِ ہندی میں مرزا تفتہ اور میرزا علاء الدین کے نام ایک
ایک خط ہے۔ اور اردوئے معلیٰ (اشاعتِ اول) میں علی الترتیب ان کے نام ۸۹ اور ۵۶!!
قصہ مختصر اردوئے معلیٰ، عودِ ہندی کی نسبت کہیں زیادہ مکمل تھا۔ لیکن عودِ ہندی میں
کئی خط ایسے بھی ہیں۔ جو بعد کے مجموعے میں نہیں +

میر مہدی مجروح نے اردوئے معلیٰ کے شروع میں لکھا تھا۔ "ان خطوں کو دو حصوں پر

ح کئے ہوئے خطوط ہیں اور حصۂ ثانی میں منشی ممتاز علی خاں اور خواجہ غلام غوث بیخبر کے جمع کردہ
ین حصے بالکل بے ترتیب ہیں ان بزرگوں سے اتنا نہ ہوا کہ ایک مکتوب الیہ کے نام کے تمام
طوط کو یکجا کر دیتے خود جامع یعنی بیخبر کے نام جو خطوط آئے ہیں وہ مختلف جگہوں میں پریشان
یں اور اس بے ترتیبی کی واضح مثال ہیں نمبر شمار ۴ ا سے نمبر شمار ۱۱ تک کے رقعات
بیخبر کے نام ہیں اگلا رقعہ مولوی عبدالغفور خاں نساخ کے نام ہے اس سے اگلا ظہیرالدین
طرف سے ان کے چچا کے نام؎ اس کے بعد پانچ رقعے پھر بیخبر کے نام کے ہیں ان کے بعد
نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام کا ایک رقعہ ہے پھر دو رقعے بیخبر کے نام اس کے بعد ایک رقعہ
مرزا حاتم علی مہر کے نام اس کے بعد بیخبر کے نام کے رقعے پھر شروع ہو جاتے ہیں۔ اور
بے ترتیبی کا یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہتا ہے اس کے علاوہ اور بھی کئی قباحتیں ہیں مرزا
کے ایک خط (۱۶۲) کا جواب بیخبر نے لکھا وہ بھی رقعات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ خط بیخبر
کا اپنا لکھا ہوا ہے لیکن کتاب کے حاشیے پر اس خط کے سامنے لکھا ہے "خواجہ غلام غوث
بیخبر کے نام[1]" گویا یہ خط غالب کا ہے اور بیخبر کے نام لکھا گیا! ایک خط کے ساتھ بیخبر کی ایک
غزل اس طرح درج کی گئی ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ یہ غزل خط میں درج ہے حالانکہ ایسا
نہ تھا خط میں غزل کا ذکر تھا چاہیئے تھا کہ بیخبر اسے خط سے جدا نقل کرتے اور ایک دو سطریں
تشریح حال کے لئے لکھ دیتے لیکن انہیں غالباً اس کی فرصت نہ تھی خطوط جمع کرتے وقت
بیخبر کا خیال تھا کہ فقط وہ خطوط جمع کئے جائیں جو علمی یا ادبی نقطۂ نظر سے خاص طور پر قابل
وقعت ہوں دوسروں کے متعلق تھوڑا بہت اس اصول کا خیال رکھا گیا۔ لیکن بیخبر نے
اپنے نام کے تمام خطوط شامل کر دئے ہیں خواہ وہ بالکل بے وقعت بلکہ بے معنی ہی کیوں نہ ہوں

---

[1] ملاحظہ ہو عود ہندی (مطبوعہ کریمی پریس لاہور) ص ۱۴۷

مباحثہ میں تلف ہوا۔ ہاں اُردو خطوط کا بیشتر حصہ اس زمانے کی یادگار ہے۔ اور وہ مرزا کے تاجِ شہرت کے آبدار موتی ہیں۔

عودِ ہندی کی نسبت ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ اس کی ترتیب ۱۸۶۱ء میں شروع ہوئی۔ اور ۱۸۶۵ء یا ۱۸۶۶ء میں مکمل ہوئی۔ اسے منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ نے چوہدری عبد الغفور سرور اور خواجہ غلام غوث بیخبر کی مدد سے جمع کیا۔ اور بالآخر اپنے مطبع سے ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع کیا۔ عودِ ہندی مرزا کے اُردو مکتوبات کا پہلا مجموعہ ہے۔ اور اس کے جمع کرنے والوں کے ادبی ذوق کی داد دینی چاہیئے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے۔ کہ یہ مجموعہ اس قدر غلط اور بے ترتیب چھپا ہے۔ کہ اس سے کتاب کی خوبیوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اور خطوط کو صحیح طور پر سمجھنا دشوار ہے۔ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی نسبت لکھتے ہیں:-

"کاتب اس نسخے کا غلط نویس اور بد املا ہی نہیں۔ رسم الخط ہی نہیں جانتا۔ اور غلطیوں سے قطع نظر لفظوں کو بُری طرح توڑتا ہے ۔ ۔ ۔ بعض جگہ تو عبارت کا پڑھنا دشوار ہو گیا ہے خاص کر جہاں کہیں لفظ کو غلط توڑ کر ایک ٹکڑا اس کا سطر کے آخر میں، دوسرا اگلی سطر کے شروع میں لکھا ہے ۔ ۔ ۔ کتاب کی چھپائی کا اہتمام کرنے والوں نے نہ چھپتے وقت غلطیوں کی تصحیح کی۔ نہ بعد کو غلط نامہ بنایا۔ جن خطوں کے اصل نسخے "غالب" ہی کے قلم کے لکھے ہوئے خوش قسمتی سے ہاتھ آ گئے۔ ان سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ چھاپے کے نسخے میں بعضے فقرے سراسر حذف کر دئے گئے ہیں۔ اور ایسی صورت میں ہر جگہ کاتب ہی دست اندازی کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

عودِ ہندی کی کتابت اور املا میں جو بے پروائی برتی گئی۔ اس سے زیادہ بے قاعدگی کتاب کی ترتیب میں ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں چوہدری عبد الغفور سرور کے

قصائد اور قطعات انہوں نے نواب کلب علی خاں کو لکھ کر بھیجے نواب یوسف علی خاں کے لئے ہیں لکھے ۔

صفیر بلگرامی کا بیان

اسی زمانے میں جلوۂ خضر کے مؤلف سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مرزا سے ملنے دہلی آئے تھے اور ان سے ملاقات کا حال اپنی کتاب میں یادگار چھوڑ گئے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> حضرت کا لباس اُس وقت یہ تھا جامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کلی دار۔ سیاہ سمور
> ٹول کا مدل میں مرزائی سر کھلا ہوا رنگ سُرخ و سفید۔ مُنہ پر داڑھی دونوں آنکھیں
> بڑی کان بڑے قد لمبا ولائتی صورت۔ پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شراب کے موٹی
> ہو کر اینٹھ گئی تھیں اور یہی سبب تھا کہ اُٹھنے میں دقت ہوتی تھی آنکھوں میں نور موجود
> تھا کان کے سماعت میں کچھ خلل آچلا تھا ۔

سید فرزند احمد کئی روز دہلی میں مقیم رہے ۔ ان دنوں میں مرزا اور ان کے درمیان جو ادبی گفتگو ہوئی اُسے بھی انہوں نے درج کتاب کیا ہے اور مرزا کے کھانے کی تفصیل لکھی ہے ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک وہ اچھی غذا کھاتے تھے ۔

اُردو رقعات کی اشاعت

مرزا سے مؤلف جلوۂ خضر کی ملاقات ۱۲۸۲ھ میں ہوئی شعر و شاعری اس وقت بہت حد تک ترک ہو چکی تھی انہوں نے آخری فارسی غزل ۱۸۶۵ء میں نواب امین الدین کے ایما پر اور آخری اُردو غزل نواب کے صاحبزادے مرزا علاء الدین کے اصرار پر ۱۸۶۶ء میں لکھی لیکن نواب رامپور کی تعریف میں سخن گوئی اس کے بعد بھی جاری رہی مرزا کے ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے قلم میں ابھی بہت جان تھی لیکن بدقسمتی سے غدر کے بعد اُن کا بہت سا وقت برہان قاطع کے متعلق

مرزا کا اس معاملے میں جو حال تھا۔ وہ سب کو معلوم ہے۔ نواب صاحب نے مسند نشین ہوتے ہی قمار بازی یک قلم موقوف کر دی تھی۔ اور مرزا نے اس کی نا خانہ قید فرنگ بھی گوارا کر لی تھی۔ اس کے علاوہ علمی امور میں بھی وہ ہم خیال نہ تھے۔ نواب صاحب مولوی غیاث الدین مصنف غیاث اللغات کے شاگرد۔ اور مرزا نہ صرف مولوی غیاث الدین بلکہ ان کے تمام ہم پیشہ اور ہم خیال لغت نویسیاں سے متنفر۔ اندریں حالات اگر مرزا اور نواب کلب علی خاں کے درمیان کوئی گہرا ربط و ضبط نہ تھا۔ تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی نواب صاحب کی اس لئے شکایت ہو سکتی ہے۔ کہ انہوں نے مرزا کے ساتھ وہ دوستانہ سلوک نہیں کیا۔ جس کا نمونہ نواب یوسف علی خاں نے پیش کیا تھا۔ اہل ذوق کو تو نواب کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کہ انہوں نے باوجود ان اختلافات کے اور باوجود اس امر کے کہ وہ غالب کے شاگرد بھی نہ تھے، مرزا کا ماہوار مشاہرہ جاری رکھا۔ اور ضرورت کے وقت ان کی دستگیری کی۔

نواب کلب علی خاں کی مرزا سے سرد مہری ایک لحاظ سے اردو ادب کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ مرزا کی نواب یوسف علی خاں سے بے تکلفی تھی۔ اور ان کی خوشنودی کے لئے وہ تازہ کلام یا مدحیہ قصائد بھیجنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ لیکن نواب کلب علی خاں سے وہ اس طرح کی وارستہ مزاجی کیسے روا رکھتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ باوجودیکہ نواب کلب علی خاں سے مرزا کے تعلقات نواب یوسف علی خاں کی نسبت تھوڑی دیر برقرار رہے۔ اور اس زمانے میں ضعف اور پیرانہ سالی کی وجہ سے وہ شعر گوئی سے معذور بھی تھے۔ لیکن جس قدر تازہ اشعار

---

[1] مرزا نے مولوی غیاث الدین کے خلاف جو بری طرح زہر اگلا ہے۔ اس کے لئے ملاحظہ ہو عود ہندی صر ۱۳ - ۱۵ و اردوئے معلے صر ۳۷۱

بجالیسیم وزد تا نوشتہ ام باشد — دلے رحیم لبالب چو لب رعد گناہ
خدا کند کہ مشرف شود چو ایں قرطاس — بہ پیش مسند عالی رسد بہ درگاہ
امیر کلب علی خاں بہادر و کلف — بسوے غالب حزیں حکم کند نگاہ
کہ ایں فلک زدہ گر عرض کرد مصلحتے — ز رحم بندہ را خلاص کردہ ناگاہ
خلاف طبع مبارک نبادہ آں تقریر — پے خطا بود از بندگان خجلت خواہ
تو بادشاہ و شہنشاہ تاجدار فرنگ — خطاب می طلبد بادشہ ز شاہنشاہ
خدائے من نپذیری کہ عرض می گرید — بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ

اس سے ایک سال بعد کے ایک خط میں بھی اسی طرح کی معذرت طلبی ہے:۔
ضعف نے مستولی بڑھاپے کے بیست و معطل کر دیا ہے حضرت کے قدموں کی قسم!
نہ حواس درست، نہ رائے صحیح نہ سال سے مکروہات میں مبتلا رہتے رہتے اب طاقت تحمل
کی نہ رہی۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے کیا سمجھتا ہوں۔ کیا کہا جائے کیا کہتا ہوں
.. اگر عرض مسابق میں کوئی بات گستاخی و دیوانگی و بد حواسی کی ہو تو فقیر کی خطا معاف ہو
نہ کسی صاحب کے مخالف طبع اگر کوئی لفظ ہو تو وہ بھی درگزر کریں

واقعہ یہ ہے کہ نواب کلب علی خاں اور مرزا کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہیں
کئی تھیں۔ نواب صاحب پکے سنی[1]، مرزا شیعہ، نواب صاحب تمام شرعی امور کے پابند اور

[1] مرزا رام پور سے ایک خط میں نواب سجاد مرزا کو لکھتے ہیں یہ سمجھے تھے کہ ملنا در مرزا تحصیلداری کا مسئلہ ہی بکار ہے
ہیں یہاں معلوم ہوا کہ تمام قلمرو میں چھ تحصیلداریاں اور چھ تھانہ داریاں ہیں ساتوں ملاعہ
کہاں سے پیدا کیا جائے۔ نہ ہی مصاحبت اس کو پہلے قسمت اور پھر علوم رسمیہ سے آگہی پھر
زبان آوری پھر قسمت کی یاوری شرط ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا اور نواب کلب علی خاں کے تعلقات شروع سے ہی کسی قدر کشیدہ ہو گئے تھے۔ اور کئی ایسے واقعات ہوتے رہے۔ جن کے لئے مرزا کو عذر خواہی کرنی پڑی۔ ایک واقعہ تو جلوس کے پہلے سال میں ہی ہوا۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔ کہ جب نواب مسند نشین ہوئے۔ تو مرزا نے ایک خط میں انہیں مشورہ دیا۔ کہ وہ سرکار انگلشیہ سے مزید اعزاز اور خطاب حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"پیر و مرشد! ارادہ خیر خواہی ایک امر عرض کرتا ہوں۔ محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں رئیس ٹونک نے اول مسند نشینی گورنمنٹ کو "امیر الدولہ" اور "وزیر الملک دلیر جنگ" لکھ کر دیئے۔ اور وہاں سے وہ ان کو عطا ہوئے۔ حضور کے اجداد امی دنے سلاطین بابریہ کا خطاب قبول کیا۔ مگر حضرت کے جد امجد کو احمد شاہ درانی نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا۔ حضرت کو مناسب ہے۔ نواور خلاف کو مع دو جزو "شمس الملک وبہرام جنگ" جناب ملکہ معظمہ سے بذریعہ گورنمنٹ لینے واسطے لیں"

مرزا کے مشورے میں ایک طرح کا تملق تھا۔ نواب صاحب کو برافروختہ کرنے والی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن فرمانرواؤں کی طبیعت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے بخشند۔" نواب صاحب کو یہ مشورہ ناگوار گزرا۔ خط میں تو فقط انہوں نے یہی لکھا۔ "استعمال الفاظ خطاب دستور ایں ریاست نبودہ است" لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ رامپور میں اس مشورے پر سختی سے نکتہ چینی کی گئی۔ جس کی اطلاع مرزا کے خیر خواہوں (نواب مرزا خاں داغ یا امیر؟) نے انہیں دہلی میں دی ہوگی۔ چنانچہ مرزا نے ایک فارسی قطعہ لکھ کر بڑی لجاجت سے اپنے "جرم" جسارت کے لئے عذر خواہی کی۔ اس قطعہ کے چند اشعار ہیں:۔

اب مراد تھی کہ کہیں نواب صاحب ناراض ہو جائیں اور اس سے کسی کی حالت میں رسوگی کا جو سہارا ہے جاتا رہے چنانچہ انہوں نے ایک معذرت آمیز خط اس کے جواب میں لکھا۔

"آج ۔۔ کہ توقیع وقیع آیا پڑھتے ہی کانپ اٹھا اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا اگر حضور کے ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو تو مجھے جناب الٰہی اور حضرت رسالت پناہ کی قسم اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر خدا امیدِ خدا اور موت حاتم الانبیاء کا دل معتقد اور سرمان معترف ہوں خدا اور رسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا البتہ بحث سے مراد یہ تھی کہ سوائے اہل ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو لاوبتی اور اہم جہاں کے عقول میں اختلاف ہیں اس میں میں کلام نہیں کرتا اپنی تحقیق کرلے ہوئے ہوں اوروں سے مجھے بحث نہیں تاہم صحب حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان دونوں باتوں کو میں نے مانا لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق" یہ کلمہ موجب عتاب نہیں ہو سکتا اور اگر اس کو گستاخی کہا جائے تو گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں گناہ معاف کیجئے اور نوید عفو سے مجھ کو تقویت دیجئے

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عفو کا طالب غالب"

نواب صاحب نے یہ معذرت قبول کر لی۔ اور جواب میں لکھا "عاد کہ تاں بھر مار سادلیش پڑا احتقد اور آں دریغ شکوک لاحقہ گردید جاطر لطف مظاہر مقبول جمعیت مانند" لیکن جیسا کہ مولوی امتیاز علی عرشی نے لکھا ہے " اس کے بعد نواب صاحب نے بغیر کوئی نثر اصلاح کے لئے نہیں بھیجی جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ ان کی طبیعت کا تکدر کلیتہً دور نہیں ہوا۔"

نیوس کے بموجب بلکہ اپنے خداوندِ نعمت کے حکم کے مطابق۔

تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزوں

انصاف کا طالب غالب"

نواب صاحب کو یہ خط ناگوار گزرا۔ ایک تو اس میں مرزا نے ان لغت نویسوں کی ہنسی اُڑائی تھی۔ جن کی نواب صاحب کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ دوسرے نواب صاحب نے چند ایک جملوں کے ایسے معنی مراد لئے۔ جو مرزا کے خیال میں نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے مرزا کو ایک طویل اور دُرشت خط فارسی میں لکھا۔ جس کا ماحصل یہ ہے :۔

آپ کا عجیب و غریب خط، جس میں قدیم ہندی نژادوں کی نسبت غلط معنی بتانے کا التزام اور دوسرے اعتراض، اور یہ اظہار تھا۔ کہ راقم کو بحث کا طریقہ نہیں آتا۔ موصول ہوا۔ اور بڑی حیرانی کا باعث ہوا۔ اس لئے کہ ابھی تک سوائے علمی امور کی تحقیق و تفتیش کے کوئی بات ظہور پذیر نہ ہوئی تھی۔ لیکن میں اس یگانۂ روزگار کی موشگافیوں پر حیران ہوں۔ کہ میری تحریر کو بحث و اجتہاد پر محمول کیا گیا۔ اور اس طرح کے کنائے، مثلاً راقم کو اُستاد کہنا، یا لفظ بحث، جو دونوں خلافِ واقع اور شکر رنجی کا باعث ہیں، لکھے گئے، پس اگر آپ کو یہی منظور ہے۔ تو اس امر کا اشارہ کر دیں۔ کہ فریقین کے درمیان "ترسیل رسائل" بند ہو جائے۔ ورنہ قلم کو غیر ضروری خارج البحث باتوں کی تفصیل سے باز رکھیں۔ جس کا نتیجہ دردِ سر کے سوائے کچھ نہیں ہو سکتا۔ راقم نے ان محققین کا پایہ، جن کی تصنیفات مقبول عام ہیں، اپنے سے زیادہ سمجھ کر ان کے کلام کے حوالے دئے تھے۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک وہ قابلِ قبول نہ تھے۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ آپ مہربانی سے ایسا لکھ بھیجتے میری سمجھ سے باہر ہے۔ کہ بات کو اس قدر طول کیوں دیا گیا۔ . . اس سے زیادہ لکھنا لقمان کو نصیحت کرنا ہے۔"

خود مو سپارم رہا کہ مرا از آں مسعی واسطۂ تلمذ بودہ است نہ از عربی و دیگراں ؎

نواب صاحب نے خط بڑی متانت اور خوش اخلاقی سے لکھا تھا لیکن مرزا کو ہندوستانی لغت نویسوں کے نام سے چڑ تھی اس کے جواب میں قاطع برہان کی تھوڑی بہت تلخی آ گئی :۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا مرا از آں مسعی واسطۂ تلمذ بودہ است " یہ دلیل کہ مرسیدی اور وکالت سے دلیل کی جھیلی گئی ہے میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں

مبدء فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ محکم کو ملے ہمارے مرزا و ساکن اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کئے اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے بحث کا طریق یاد نہیں

میاں ابو جامع فرہنگ جہانگیری تتبع رشیدی انجم فرہنگ یہ سب ہندی علمائے عجم میں سے نہیں ہیں ہندوستان کا مولد ماخذ ان کا استعداد ہمارا بادی ان کا قیاس ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی ! لا حول ولا قوۃ الا

فقرا اشعار قدما کا معتقد ان لوگوں کے کلام کا عاشق مگر جو لغات ان کے کلام میں ہیں اس کے معنے جو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں اب پیرو مرشد نے لکھا کہ " اورنگ و اورنگ مترادف المعنی اور آسمان سامان دستی و جیدان گھوڑ بسلا سابلے کے معنی یہ ہے " تو میں نے بے تکلف مان لیا لیکن ہم ماننے کے

اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ اور ضعفِ بصر جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں۔ حرف سوجھنے سے رہ گیا۔" ایک اور خط میں لکھا ہے "رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطافتِ طبیعت، یہ سب اسباب لُٹ گیا۔"

جب مرزا رام پور سے لوٹے۔ تو نواب کلب علی خاں کے تعلقات ان سے خوشگوار تھے۔ لیکن اس سے قریباً ایک سال بعد بدقسمتی سے ایک ایسی علمی بحث پیدا ہوگئی۔ جس نے ان تعلقات کو ضعف پہنچایا۔ اس بحث کی تہہ میں بھی مرزا کا عام ہندوستانی لغت نویسوں سے اختلاف تھا۔ جس سے متاثر ہو کر انہوں نے قاطع برہان لکھی تھی۔ اور ایک بااثر علمی حلقے کی مخالفت گوارا کی تھی۔ آغاز اس کا اس طرح ہوا۔ کہ مولوی محمد عثمان خان بہادر مدارالمہام ریاست رام پور نے قصاید بدر چاچ کی ایک شرح مرتب کی۔ جس کے شروع میں نواب صاحب نے دیباچہ لکھا۔ اور یہ دیباچہ بغرض اصلاح مرزا کے پاس بھیجا۔ اس دیباچہ میں نواب صاحب نے "ارتنگ" کو "ارژنگ" اور "آشیاں جیدن" کو "آشیاں بستن" کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ مرزا نے ان جملوں میں ترمیم کر دی۔ لیکن نواب صاحب اس ترمیم سے متفق نہ ہوئے۔ انہوں نے فرہنگ رشیدی اور فرہنگ جہانگیری اور لغت کی دوسری کتابوں سے اپنی عبارت کے جواز میں نظیریں دیں۔ اور مرزا کو لکھا:-

"اکثر مالک رقابان علم لغت ارتنگ و ارژنگ را بمعنے واحد پنداشتہ اند۔ و عامۂ مفسران کلام شیرازی مشارٌ الیہ "آشیاں جیدن" را مرادف "آشیاں بستن" نگاشتہ۔ چنانچہ نظر سرسری ملفوف عنبریں نامۂ ہذا است۔ بمطالعہ خواہد رسید۔ معہٰذا اگر طبع آں اوستادِ زماں بہ ترقیم الفاظ فی الجملہ نفورے داشتہ باشد۔ ہمچناں حوالۂ قلم نمایند۔ کہ مبعوث عنہ را از تقریظ اصلاح شدہ چوں نفسانیت

طوائف کا وہ ہجوم حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو "طوائف الملوک" کہنا چاہیئے۔"

مالی نقطہ نظر سے مرزا کا دوسرا سفر رام پور بالکل ناکام رہا تھا۔ مولوی امتیاز علی عرشی مرزا کی آمد ورفت کا ذکر کرکے لکھتے ہیں۔

"نواب خلد آشیاں ۷ نومبر ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپیہ عطا فرما چکے تھے تاہم ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو ۲۰۰ روپیہ بوجہ زادِ راہ مرحمت فرما کر مرزا صاحب کی اس آرزو کی بھی تکمیل کردی گئی۔"

اس کے علاوہ رام پور کے سفر سے پہلے مرزا نے اپنے تعلقات ریاست کے متعلق جو تشویش ناک صورت تھی۔ اُسے بھی نواب صاحب کے کرم والتفات نے غلط ثابت کر دیا لیکن رام پور سے واپسی کے وقت ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے مرزا کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اور انہیں ہمیشہ کے لئے ادھ موا کر دیا۔

مرزا ۲۴ دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے راستے میں دریائے گنگا کو پار کرنا تھا جو ان دنوں سرمائی بارش کی وجہ سے طغیانی پر تھا مرزا کی پالکی کشتیوں کے عارضی پُل کو پار کرچکی تو یہ پل ٹوٹ گیا۔ اور ان کے اسباب کی گاڑیاں اور نوکر چاکر سب پیچھے رہ گئے ناچار مرزا کو یکہ و تنہا بغیر بچھونے بستر کے اور بغیر کسی کھانے کے مراد آباد کی سرائے میں رات گذارنی پڑی اُن کی عمر اس وقت ستّر سال کی تھی وہ اس سردی کی تاب نہ لا سکے۔ اور بیمار ہو گئے مولوی محمد حسن مراد آباد میں صدر الصدور تھے انہیں خبر ملی تو وہ مرزا کو گھر لے گئے اور پوری طرح تیمار داری اور غمخواری کی پانچ سات دن کے بعد صحت ہوئی تو مرزا دہلی پہنچے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ انہیں عارضی طور پر افاقہ ہو گیا طبیعت اس کے بعد خراب رہی وہ اس واقعہ کے قریباً چھ ماہ بعد ایک خط میں لکھتے ہیں "آگے ناتواں تھا اب نیم جان ہوں آگے بہرا تھا اب

بخاک پائے تو گر دستگاہ داشتمے — نبودمے بغمِ دوریٔ درِ تو صبور
من آں کسم کہ ز افراطِ ورزشِ اخلاص — بغیبت است مرادِ دعوئے دوامِ حضور
تولی رحیم دل و من سفیہم، دوری بہ — مباد رنجہ شوی از نظارۂ رنجور
نظر بخستگی و پیری و تہیدستی — قبول کردنِ تسلیمِ من خوش است از دور!

نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے وقت تو مرزا نے قصیدہ بذریعہ ڈاک بھیج دیا لیکن جب انہوں نے چند ماہ بعد مسند نشینی کا باقاعدہ جشن کیا۔ تو مرزا کو رام پور جانا پڑا۔ وہ خود کہتے ہیں:

"رام پور کی سرکار کا فقیر، تکیہ دار، روزینہ خوار، رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوئے دولت کو در دولت پر جانا واجب ہوا"۔

چنانچہ وہ غازی آباد۔ ہاپوڑ۔ مراد آباد ہوتے ہوئے ۱۲ ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچے۔ اور جشن میں شریک ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے۔ جشن بہت شاندار تھا۔ مرزا ۶ ر دسمبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں۔ کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ برسوں صاحب کمشنر مع چند میموں اور صاحبوں کے آئے اور خیموں میں اترے کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رام پور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ ر دسمبر حضور پر نور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر واپس آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ ٹفن[1] اور شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔"

[1] یعنی ٹفن (Tiffin) دوپہر کا کھانا۔

باب دہم

سنہ ۱۸۶۵ء سے سنہ ۱۸۶۹ء تک

نواب کلب علی خاں

ہم نواب یوسف علی خاں سے مرزا کے تعلقات کا ذکر کر چکے ہیں ان کی وفات اپریل سنہ ۱۸۶۵ء میں ہوئی اور ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ مرزا کے تعلقات نواب یوسف علی خاں سے بالکل ذاتی تھے اور جو تھوڑی بہت خدمت وہ والیٔ ریاست کی کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ان کا خیال بہت زیادہ رکھا جاتا تھا اس لئے ڈر تھا۔ کہ کہیں نئے دور میں یہ تعلقات ختم نہ ہو جائیں۔ مرزا کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ انہوں نے نئے رئیس کی تخت نشینی پر تہنیت نامہ لکھا اور اس کے ساتھ اپنے وظیفے کے متعلق بھی درخواست کی نواب خلد آشیاں نے خود جواب دیا۔

مشفقا آنچہ مشاہرۂ آں کرم مادر عہد نواب صاحب فردوس مکاں مقرر است

انشاء اللہ تعالےٰ بدستور جاری مانده حسب ضابطہ ماہ بماہ خدمت رسیده خواہد بود۔

تہنیت نامہ کے ساتھ مرزا نے جو قصیدہ لکھا تھا اس میں انہوں نے اپنے بڑھاپے اور اپنی کمزوری کا ذکر کر کے حاضر نہ ہونے کی معذرت کی تھی ؎

نہ آمدن ز رسیدم بہ ناتوانائی   دلے لعرض تنا و دعا یم معذور

تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ اَلْمُؤمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ یَدِہٖ وَلِسَانِہٖ ؎

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کُن　　که در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پُوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰؑ سے پھر ہم سے پُوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰؑ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

جب مرزا غالب کی وفات ہوئی، شاہ صاحب زندہ تھے۔ کسی نے آکر یہ خبر سُنائی۔ شاہ صاحب نے بڑا افسوس کیا۔ کئی حسرت بھرے شعر پڑھے اور مرزا کی نسبت کہا:۔

"نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجۂ غائت اور خلیق از حد تھے ایک روز جو ہم اُن کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے۔

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار　　ساقی و مغنی و شرابی و سرودے

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند　　حق را بسجودے و نبی را بدرودے

قطعہ

بروزِ حشر الٰہی چو نامۂ عملم　　کنند باز کہ آں روز باز خواہ من است

بجنبِ مقابلہ آں را ز سرنوشتِ ازل　　اگر زیادہ و کم باشد آں گناہِ من است

رندِ مشرب بے تمر رحم دل تھے اور فنِ شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔"

مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ جیسے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک
خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجئے مگر وہ کب مانتے تھے
ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل کہاں ہوں میں تو رند سیاہ گنہگار
مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ بولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت
اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھا لیا۔ اُن کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی
ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانہ عجائب لکھنو سے آئے
مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اُردو زبان میں کس کتاب کی عمدہ ہے
کہا چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے اور فسانہ عجائب کیسی ہے۔ مرزا نے ساختہ کہہ اٹھے
اجی لاحول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس
وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔
بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس
آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آئیے آج اُن کے
مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم اُن کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور کی فرودگاہ
پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب
ہو کر بولے کہ حضرت مولوی صاحب رات میں نے فسانہ عجائب کو بغور دیکھا تو اُس کی خوبی
عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو
ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض
اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور اُن کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت
مسرور کیا۔ دوسرے دن اُن کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت

کے آسودہ دلوں نے ان کی کوئی قدر نہ کی۔ اور انہوں نے نواب مختار الملک کی تعریف میں جو نفیس قصیدہ ۱۸۶۱ء میں لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کا انہیں کوئی صلہ نہ ملا۔[1] لیکن حیدر آباد کے علاوہ تمام ہندوستان میں ان کے قدردان اور مداح موجود تھے۔ اب ان کی شہرت اس قدر مستحکم ہو گئی تھی۔ کہ اہلِ نظر ان کی زیارت کے لئے آتے۔ اور اس بادشاہِ اقلیم سخن کو خراجِ عقیدت ادا کرتے۔

ہندوستانی صوفیہ کے تذکروں میں شاید ہی کوئی کتاب تذکرۂ غوثیہ سے زیادہ دلچسپ ہوگی۔ جس میں اس زمانے کے ایک اور آزاد خیال بزرگ شاہ غوث علی قلندر کے ارشاد جمع ہیں۔ شاہ صاحب بھی مرزا سے ملتے گئے تھے۔ اور چونکہ دونوں کی طبیعتیں ایک رنگ کی تھیں اس لئے جلد ہی ان میں دوستی ہو گئی۔ اور مرزا اور شاہ صاحب کی ملاقاتوں کا ذکر تذکرۂ غوثیہ میں محفوظ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے تھے:۔

"ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسنِ اخلاق سے ملے۔ لبِ فرش تک آکر لے گئے اور ہمارا حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب! ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علے الخصوص یہ شعر ؎

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو   تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب! یہ شعر تو میرا نہیں کسی اُستاد کا ہے۔ فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔ اُس دن سے

[1] مرزا غالب، ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں:۔ "میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا۔ کچھ قدر دانی نہ فرمائی۔ ردِ فرقہ وہابیہ پر ایک مثنوی جو سابق میں لکھی تھی۔ وہ محی الدولہ کو بھیجی۔ رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں۔ کہ مولوی غلام امام شہید شاگردِ قتیل وہاں کوسِ انا ولا غیری بجا رہے ہیں۔ اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں۔"

بالآخر یہ مجموعہ مصنف کے دیباچہ کے بغیر منشی ممتاز علی خاں کو طباعت کے لئے بھیجا گیا منشی
صاحب نے تحریر اور تقریر کے مجموعوں کو یکجا کیا اور خود دیباچہ لکھ کر انہیں عودِ ہندی کے نام
سے شائع کیا +

عودِ ہندی کی ترتیب ایک لحاظ سے ۱۸۶۱ء ۱۲۸۵ھ میں شروع ہوگئی تھی کیونکہ چودھری
عبدالغفور نے اپنے خطوط کا مجموعہ "مہرِ غالب" جس پر عودِ ہندی کی بنیاد رکھی گئی اس سال جمع
کر لیا تھا لیکن دوسرے خطوط کے جمع ہوتے دیر لگی اور اشاعت کو تو اور بھی تاخیر ہوئی۔ بالآخر
یہ مجموعہ ۱۹ر اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی مرزا کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے شائع ہوا لیکن چونکہ اس میں
۱۸۶۵ء کے بعد کا کوئی خط نہیں اس لئے خیال ہوتا ہے کہ اس سال تک یا زیادہ سے زیادہ
۱۸۶۶ء تک عودِ ہندی کی ترتیب مکمل ہو گئی ہوگی +

عام مقبولیت

قاطع برہان جو ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی اس کا دوسرا ایڈیشن
مارچ ۱۸۶۶ء میں رئیس سورت نواب میر غلام بابا خاں کی مالی امداد
سے شائع ہوا اس امر سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرزا کے مداح اس وقت سارے ہندوستان
میں موجود تھے بنگال میں ٹیپو کے شاہی خاندان کے رکن شاہزادہ بشیر الدین اور حاجی
عبدالغفور نساخ۔ سورت میں نواب میر غلام بابا خاں۔ لوہارو میں نواب لوہارو کے صاحبزادے
مرزا علاء الدین اور بھائی نواب ضیاء الدین غالب کے شاگرد تھے۔ بڑودہ کے رئیس نواب
میر ابراہیم علی خاں غزلیں اصلاح کے لئے بھیجتے تھے اور الور کے مہاراجہ غالب کے مداح
تھے۔ الہ آباد میں خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر اگرچہ قاطع برہان کی بحث میں مرزا سے متفق نہ
تھے۔ لیکن ان کے کمالِ شاعری کے معترف تھے اسی طرح پنجاب میں ان کی دستنبو بہت
مقبول ہوئی۔ اور وہاں ان کے اردو رقعات کی بہت مانگ تھی یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد

جو نامہ کہ بنام میرے بعبارت اُردو تحریر کیا۔ مختلف سادہ رویوں سے دلربا تر اور ہر سطر اسکے
بسلسلہ مویوں سے تاب فرسا یاران ہے ۔ بس تنہا ملتذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اٹھانا
خلاف انصاف جانا دل بکل تمام بشہرت ہوا۔

چوہدری صاحب ابھی اپنا ارادہ پورا نہ کر سکے تھے۔ کہ انہیں ان خطوط کو ایک ایسی
مجلس میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جہاں منشی ممتاز علی خاں مالک مطبع مجتبائی و رئیس میرٹھ موجود
تھے۔ انہوں نے چوہدری صاحب سے کہا۔ کہ اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے
سنائے ہیں جمع کرو۔ تو میں اس کے انطباع کا بیڑہ اٹھاتا ہوں "چنانچہ چوہدری صاحب
نے ان خطوط کو جمع کیا۔ اور مرزا غالب اس مجموعہ کا تاریخی نام رکھا۔ لیکن ابھی طباعت کی
نوبت نہ آئی تھی۔ کہ منشی ممتاز علی نے سوچا۔ کہ اگر مرزا صاحب کے رقعات جو دوسروں
کے نام ہیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کرلئے جائیں تو احسن ہو۔ چنانچہ انہوں نے ان رقعات
کی تلاش شروع کی۔ حسن اتفاق سے انہیں پتہ چلا۔ کہ خواجہ غلام غوث بیخبر مرزا کی مدد
سے ان کے رقعات جمع کررہے ہیں۔ انہوں نے ان رقعات کو بھی حاصل کیا۔

غلام غوث بیخبر نے ۱۸۶۱ء سے خطوط جمع کرنے شروع کردئے تھے۔ اور چوہدری
عبدالغفور سرور والے خط تو ان کے پاس پہلے ہی موجود تھے۔ لیکن اس مجموعہ کی طباعت
واشاعت کوئی آٹھ سال کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ مرزا جو ۱۸۶۳ء سے ہی طباعت
کے منتظر تھے۔ بے قرار ہوگئے اور بیخبر کو لکھا۔

"اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چھپےگا بالفتح یا چھپےگا بالضم۔ حیف ہے کہ ہے۔ نوحق التصنیف
کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو بھیجے"

بیخبر کا ارادہ تھا۔ کہ مجموعہ رقعات کے شروع میں مرزا کا اپنا دیباچہ ہو لیکن انہوں نے نہ مانا۔

اور درحالت حیات ہیم رندہ ہو

درکشاکش ضعیفم مگسلد روان از تن   اس کر من بے میرم ہم رہا تو اینہامت

دو تین سال مصیبتیں جھیلنے کے بعد مرزا ان بیماریوں سے عالب تو آ گئے لیکن ان سے وہ کمزور بہت ہوگئے تھے وہ نومبر ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں قاضی عبدالجمیل کو لکھتے ہیں :۔

"اب میں سلامت ہوں پھوڑا پھنسی کہیں نہیں مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ! اور ضعف کیونکر نہ ہو۔ برس دن سے صاحب فراش ہوں ستر برس کی عمر ہے متناحون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا سن کہاں جو اس پھر تولید دم صالح ہو بہرحال زندہ ہوں اور ناتواں اور آپ کی پرستشہائے دوستانہ کا ممنون احسان ہوں"

عودِ ہندی کی ترتیب ہم اس شہرت کا ذکر کر چکے ہیں جو مرزا کو اطراف و اکناف ملک میں بطور ایک شاعر کے حاصل ہو گئی تھی لیکن ان کی شہرت فقط شعر کے قدردانوں تک محدود نہ تھی ان کی اردو نثر کے مداح بھی بہت تھے خطوط غالب سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ۱۸۵۸ء میں (رائے ہلدر) منشی شیو نرائن اکبر آبادی اور منشی ہرگوپال تفتہ ان کے اردو رقعات چھپوانا چاہتے تھے لیکن مرزا نے مخالفت کی اور یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اس کے دو تین سال بعد ۱۸۶۱ء میں چوہدری عبدالغفور ملرہروی کو خیال آیا کہ مرزا کے جو خطوط ان کے نام آئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انہیں شائع کر کے خاص و عام کو ان کے پڑھنے کا موقع دیا جائے وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

"عجب کلام بلاغت نظام منشیٔ صاحب شُہرہ آفاق جناب اسداللہ خان صاحب غالب کا دیکھا دل کو بھایا یکتا پایا ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا مرکبات کا جواب آیا

نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں :۔

"نہ تپ نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ۔ ان سب سے بدتر ایک صورت بُرکدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے۔ ہر پھوڑے پر ایک زخم، ہر زخم پر ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ نبرہ پھاہے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خورد و خواب رہا۔ اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں۔ کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی۔ دو گھڑی غافل رہا ہوں گا۔ کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی۔ جاگ اٹھا، تڑپا کیا۔ پھر سو گیا، پھر ہوشیار ہو گیا۔"

مرزا کی یہ حالت تھی۔ تو جائے تعجب نہیں۔ کہ وہ زندگی سے بیزار اور موت کے آرزومند تھے۔ وہ جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"سنہ ۱۲۷۷ ہجری میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں . . . روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے۔ جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے۔ بے مبالغہ اور بیانِ واقع ہے ع

حرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم

مرزا کی اس بیماری نے اس قدر طول پکڑا۔ کہ بعض حلقوں میں تو ان کی وفات کی خبر مشہور ہو گئی۔ وہ فروری ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں نواب انور الدولہ کو لکھتے ہیں :۔

"آپ کی پرسش کے قربان جاؤں۔ کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا۔ میری خبر نہ لی۔ میرے مرگ کے مخبر کی تقریر اور متلہ میری یہ تحریر، آدھی سچ اور آدھا جھوٹ! درصورتِ مرگ نیم مردہ

جس مداحوں نے تہذیب و شائستگی کے تمام اصول نظرانداز کر دئے۔ لیکن یہ بھی ماننا پڑتا ہے
کہ ستمگی و تمسخر کی ابتدا مرزا نے کی تھی۔

طویل علالت غدر کے بعد ایک عرصے تک تو غالب کو پنشن، ملعت اور دربار کے ختم ہونے کی پریشانی رہی اور جب ان مشکلوں سے نجات ملی۔ تو قاطع برہان کی اشاعت سے جو ہنگامہ برپا ہوا تھا اس کی تلخی اور اذیت برسوں تک سوہان روح بنی رہی لیکن غالب کی اس زمانے کی پریشانیاں انہی قصیوں تک محدود نہ تھیں وہ اس سلسلے میں فساد خون کے مرض میں مبتلا تھے جس نے ان کی حالت اور بھی قابل رحم بنادی تھی۔

فساد خون اور جلد کی بیماریاں، جب ایک دفعہ جڑ پکڑ لیں تو وہ مہینوں نہیں برسوں تک رو بہ اصلاح نہیں ہوتیں۔ مرزا بھی دو تین سال تک ان میں گرفتار رہے وہ تیس مئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"پچھلا مہینہ ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت پیدا کی پھوڑا پک کر پھوٹا اور پھوٹ کر ایک زخم، زخم کا ایک غار بن گیا ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا بگڑتا گیا دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے سلائیاں دوڑتی ہیں نشتر سے گوشت کٹ رہا ہے میں دل سے افاقہ کی صورت نظر آتی ہے"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ افاقہ عارضی تھا اور جب ایک پھوڑا اچھا ہوتا تو دوسرا پھوڑا نمودار ہوجاتا ۱۶ اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں تفتہ کو لکھا ہے:-

"ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا طاقت نے جواب دیدیا دن رات لیٹے رہتا ہوں۔"

ان پھوڑوں نے جو تکلیف وہ حالت پیدا کر دی تھی اس کا ذکر کئی خطوں میں ہے ایک خط میں

مرزا نے جو فارسی قطعہ مولوی احمد علی کو لکھ کر بھیجا۔ اس میں صاحب برہان کے متعلق اپنی "درشت" گفتار اور "زشت" گوئی کا اقرار کیا ہے۔ لیکن مولانا حالی اس مسئلے کے متعلق لکھتے ہیں:

"اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسا نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی کے برائے تعلیم یافتہ جو آجکل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں۔ ان کے لیے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا۔ کہ کسی سربرآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر ظاہر کریں۔ کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔"

حالی نے سرسید کی مخالفت کی بھی یہی وجہ دی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ استدلال کسی اعتراض کا جواب نہیں۔ آخر اگر سرسید رسولِ کریمؐ کے متعلق الفنسٹن کے ناشائستہ الفاظ اپنی کتاب میں درج نہ کرتے یا اپنے عجیب و غریب مذہبی عقائد کا، جن کا آج بھی کوئی قائل نہیں، پرچار نہ کرتے۔ تو ان کی کیوں اتنی مخالفت ہوتی۔ اسی طرح اگر مرزا اس علمی بحث میں ذاتیات کو نہ لے آتے اور بلاوجہ تمسخر و استہزا سے کام نہ لیتے تو مخالفین بھی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیتے۔ علاوہ ازیں اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے۔ کہ برائے تعلیم یافتہ اپنی شہرت کیلئے مشہور آدمیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ تب بھی نا ملائم الفاظ کے استعمال میں جو عیب ہے۔ وہ کم نہیں ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے اور مرزا کے سوانح نگار کو اس امر کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ مباحثہ کرتے وقت وہ اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کرتے تھے۔ اس سے پہلے جب ان کے کلام پر قتیل کے مرتب کردہ اصولوں کی بنا پر اعتراض ہوئے تھے۔ تو وہ اس کا سارا شجرۂ نسب ڈھونڈ لائے تھے۔ اور اب جو انہوں نے برہان قاطع کے مصنف سے اختلاف کیا۔ تو دلائل و براہین پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے قلم سے تیر اور نشتر کا کام لیا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ مرزا کی شوخ نگاری اور میاں امین الدین کی فحش نگاری میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ اور برہان کے

اختلافات سے ہو سکتا ہے فی الحقیقت صحت ہی ایسا تھا۔ کہ اس میں اختلاف رائے کی گنجائش بھی اور پھر مرزا کا اختلاف فقط صاحب برہان قاطع سے نہ تھا۔ وہ کسی بھی ہندوستانی فرہنگ نویس کے قائل نہ تھے اور جو لوگ ان فرہنگ نویسوں کو اپنا قبلہ اور امام مانے ہوئے تھے ان کی طرف سے مرزا کی مخالفت ایک امر لازمی تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ایک علمی بحث اس تدریسیت سطح پر جاری رکھی گئی اس کی وجہ ایک حد تک مرزا کا طرز تحریر تھا ان کی کتاب قاطع برہان صاف اور موثر زبان میں لکھی گئی ہے لیکن طرز تحریر ضرورت سے زیادہ شوخ ہے اور صاحب برہان کا جا بجا مضحکہ اڑایا گیا ہے اس سے برہان قاطع کے طرف دار ضرور آگ بگولا ہوئے ہوں گے اس کے علاوہ اگر برہان قاطع میں غلطیاں تھیں۔ تو قاطع برہان بھی غلطیوں سے پاک نہ تھی اور مرزا کا یہ دعویٰ تو کسی طرح قابل قبول نہ تھا کہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود آغا احمد علی کو اہل زبان نہ سمجھا جائے لیکن مرزا باوجودیکہ نہ ان کے آبا ایران سے آئے، نہ وہ خود ایران میں پیدا ہوئے اہل زبان بنے جاتے اور نامۂ غالب میں لکھتے ہیں:۔

"اگر کوئی مجھ سے کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے میری طرف سے جواب یہ ہے کہ سعدی ہندی ولد و فارسی زبان ہے۔

ہر چہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند تا بنالم ہم از آں جملہ زبانم دادند"

اسے بھلا سوائے غالب کے معتقدین کے کوئی کیسے مانتا اور واقعہ یہ ہے کہ مرزا نے سعدی نژاد فارسی نویسوں پر جو اعتراضات کئے ہیں اگر کوئی اہل زبان کرتا تو لوگ اتنے برا فروختہ نہ ہوتے لیکن چونکہ مرزا خود سعدی نژاد اور ترکی النسل تھے ان کا دعوئے برتری کوئی نہیں مانتا تھا۔

سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ کا خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں "خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں" القاب ہے۔ جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی ہے اس کو سڑی اور کتا اور گدھا کیوں کر لکھوں۔ فی الحقیقت یہ تذلیل بفحوائے صرب الغلام اہانت المولے گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وضیع و شریف ہند کی مخالفت ہے۔ مرا کیا اگڑا؟ مولوی نے اپنا باجی پن ظاہر کیا۔ میں نے معلم "امن بے دین" کو نسیطان کے حوالے کیا۔ اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کیا۔ اور ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا"

تیغ تیز کے علاوہ مرزا نے اکنیس شعر کا ایک فارسی قطعہ مولوی احمد علی کے نام لکھ کر بھیجا جس میں ان کی کتاب پر بڑے پُراثر طریقے میں نکتہ چینی کی ہے۔ مولوی صاحب ڈھاکہ کے باشندے تھے۔ لیکن ایرانی النسل ہونے کے دعویدار تھے۔ مرزا اس کے متعلق لکھتے ہیں ؎

ہر کہ بینی بانہ بانِ مولدِ خود آشنا است — سازِ نطقِ موطنِ اجداد بے جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودنِ آبا چہ سود — خانقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است

آگے چل کر جو شوخ فقرے انہوں نے خود صاحب برہان کی نسبت لکھے تھے۔ ان کی بڑے لطف سے توضیح کی ہے۔ اور مولوی صاحب کی بدکلامی کی شکایت کی ہے ؎

صاحبِ علم و ادب وانگہ را افراطِ غضب — چوسفیہاں دفترِ نفرین و ذم واکردہ است
در جدل دشنام کارِ سوقیاں باشد ولے — ننگ دارد علم زاں کارے کہ خواجہ کردہ است
انتقامِ جامع "برہان قاطع" مے کشند — آنچہ ما کردیم باوے خواجہ با ما کردہ است
من سپاہی زادہ ام گفتارِ من باید درشت — وائے بروے گر بہ تقلیدِ من اینہا کردہ است
زشت گفتم لیک دادِ بذلہ سنجی دادہ ام — شوخیٔ طبعے کہ دارم ایں تقاضا کردہ است!

قاطع برہان کی اشاعت پر جو تلخ بحث شروع ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ مندرجہ بالا

بشنا عرت کی سا پر غالب کی مقدمہ آمارت ۱۸۶۸ء میں اسسٹنٹ کمشنر دہلی کی عدالت میں پیش ہُوا غالب کی طرف سے لالہ پیارے لال آشوب حکیم لطیف حسین ۔مولوی نصیر الدین اور للّلہ حکم چند بطور گواہ پیش ہُوئے اور فریق مخالف کی طرف سے مولوی ضیاء الدین اور مولوی سدید الدین اور دُوسرے علما گواہ تھے ۔بحث ساری یہ تھی کہ میاں امین الدین نے مرزا کے متعلق جو فقرے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں اور استعارے کنائے استعمال کئے ہیں ان سے تحسین و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا ہیں ۔مولوی ضیاء الدین اور کئی دوسرے رحم دلوں نے کرم گستری کے لئے کے لئے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کئے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو جب مرزا نے یہ دیکھا کہ ان ترجمانیوں کی وجہ سے مقدمے میں کامیابی مشکل ہے تو اُنھوں نے راضی نامہ داخل کر کے مقدمہ[1] واپس لے لیا۔

قاطع برہان کے خلاف اور برہان کے حق میں سب سے مفصل کتاب مرزا احمد علی نے لکھی جو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرّس تھے اور ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح کیا کرتے تھے یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی اس کے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ تیغ تیز کے نام سے شائع کیا جس میں قاطع برہان کے مخالفوں پر نکتہ چینی کی ہے ۔ اور مؤید برہان کے اعتراضوں کے جواب دیے ہیں اس میں وہ مرزا احمد علی کی نسبت لکھتے ہیں

"عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر وا عنصت میں برابر، لیکن دشنام گوئی میں کمتر، مختصر المعانی مطول کے ہیں دو میں جن کو میرے واسطے استعمال کئے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم ہیں، شاعر ہیں، آخر شرافت و انسانیت میں ایک پایہ رکھتا ہے ، صاحب ہندوستان ہے عالی خاندان ہے امرائے ہند رؤسائے ہند، جہاں لوگاں ہند سب اس کو جانتے ہیں رئیس زادگاں

[1] اس مقدمہ کی مکمل روداد رسالہ اُردو کی اشاعت اپریل ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی ہے

کہ یہ کتاب مرزا نے خود لکھی ہے۔ مولینا حالی غالب کی اردو نثر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"مرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں۔ اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہان قاطع کے خلاف داروں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائف غیبی تیغ تیز اور نامۂ غالب"

مرزا کے خطوط پڑھنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ نہ صرف انہوں لطائف غیبی خود لکھ کر سیاح کے نام سے چھپوائی۔ بلکہ کبھی کبھی وہ سیاح کے نام سے اعتراضات اخباروں میں چھپوائے تھے۔ اور سیاح کو اس کی اطلاع اعتراض چھپ جانے کے بعد ہوتی تھی۔ مرزا ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں :۔

"الکہ سی پان منشی محمد مرزا خاں میرے سبھی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکلا ہے۔ اشرف الاخبار۔ اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے۔ کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھپایا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے"

دافع ہذیان کے بعد جو کتاب قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی۔ مرزا رحیم بیگ کی ساطع برہان تھی۔ اس کے جواب میں مرزا نے ایک طویل اردو خط مصنف کے نام لکھا۔ جو اس زمانے میں نامۂ غالب کے نام سے چھپا تھا۔ اور اب عودِ ہندی (مطبوعہ لاہور) میں شائع ہو گیا ہے۔ اس میں بدلائل و براہین مکتوب الیہ کے اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے +

تیسری کتاب میاں امین الدین کی قاطع القاطع (۱۸۶۶ء) تھی۔ یہ کتاب اس طرح فحش و دشنام اور غلیظ کنایوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہ مرزا نے اس کے مؤلف کے خلاف

جب مرزا نے یہ خط لکھا اس وقت تک محرق کی تردید میں دافع ہذیان اور سوالات عبدالکریم لکھے جا چکے تھے لیکن مرزا چاہتے تھے کہ اردو میں کوئی رسالہ شائع ہو جائے جس میں محرق کی غلطیاں اور جامع محرق کی کوتاہیاں پورے طور پر ظاہر ہوں چنانچہ انہوں نے میر غلام حسین قدر بلگرامی پر ڈورے ڈالنے شروع کئے عام طور پر یہاں کے خط قدر کے نام رسمی ہوتے تھے اور "بندہ پرور" "قبلہ صاحب" "مشفق میرے" اور اسی طرح کے دوسرے رسمی القاب سے شروع ہوتے تھے اب انہوں نے میر صاحب کو ایک بڑا دلستانہ خط لکھا اور اپنی ادبی جنگ میں مدد چاہی خط کا آغاز تھا۔ "قرۃ العین میر غلام حسین سلمکم اللہ تعالے" اس میں یہ لکھ کر کہ مولوی احمد علی نے بغیر کسی ملاقات اور بغیر کسی حق کے میری حمایت کی ہے مرزا لکھتے ہیں:-

"تم میرے یار ہو اور میری خدمت گزاری کے حقوق ہیں تم پر مجھ کو مدد دو اور اپنی قوت علمی صرف کرو محرق قاطع برہان میرے پاس موجود ہے مجھ سے منگا دو میں ہر موقع پر خطا اور زلت مولف کا اشارہ کردوں گا تمہارے پاس دو نسخے ایک دافع ہذیان ایک سوالات عبدالکریم مع استفتا و فتاے دستخطی علمائے دلی موجود ہیں اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشارات سود مند پہنچیں گے تم کو معاملہ بہت آسان ہوگا محرق اور صاحب محرق کا خاکہ اڑ جائے گا"[1]

مگر مرزا کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور قدر نے محرق کا جواب نہ لکھا۔ چنانچہ مرزا نے دوسری سمت نظر دوڑائی۔ اور بالآخر لطائف غیبی میاں اللہ داد خاں کے نام سے شائع ہوئی یہ ۴۴ صفحے کا رسالہ ہے کتاب کے باہر میاں اللہ داد خاں سیاح کا نام بطور مصنف کے لکھا ہوا ہے لیکن فی الواقع یہ غالب کی تصنیف ہے اور شروع سے ہی سب کو معلوم تھا

---

[1] خطوط غالب نمبر ۱۹۶ ۱۹۷

مخالفت میں کتابیں شائع ہونی شروع ہوگئیں۔ سب سے پہلے جو کتاب شائع ہوئی غالباً سید سعادت علی سابق میر منشی واجد بانہ ریذیڈنسی کی محرق قاطع تھی۔ مرزا اس کی نسبت تیغ تیز میں لکھتے ہیں:-

"ایک مدرسہ مشروع الذہن، نہ فارسی داں، نہ عربی خواں نے میری نگارش (قاطع برہان) کی تردید میں ایک کتاب بنائی۔ اور چھپوائی۔ اور محرق قاطع اس کا نام رکھا۔"

ایک اردو خط میں منشی صاحب اللہ خاں ذکی کو لکھا ہے:-

"ہاہا! محرق قاطع کا نسخہ تمہارے پاس پہنچا ہے۔

کامے کہ خواستم ز خدا شد میسرم

میں اس خرافات کا جواب کب لکھتا۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی میں اس کے عیوب ظاہر کئے۔ دو طالب علموں نے اردو میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے۔ کہ مؤلف اس کا احمق ہے۔ اور جب وہ احمق دافع ہذیان سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی کو پڑھکر متنبہ نہ ہوا۔ اور محرق کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔"

محرق کی مخالفت اور قاطع برہان کی حمایت میں جن تین کتابوں کا ذکر مرزا نے مندرجہ بالا خط میں کیا ہے۔ ان میں سے دافع ہذیان فارسی میں ہے۔ یہ مولوی نجف علی کی تصنیف ہے۔ مولوی صاحب کی مرزا سے ملاقات نہ تھی۔ فقط اتفاق رائے کی وجہ سے انہوں نے مرزا کی حمایت کی۔ مرزا ایک خط میں مولوی نجف علی کی نسبت میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:-

"واللہ اگر کبھی مولوی صاحب میرے گھر آئے ہوں۔ یا میں نے اون کو دیکھا ہے، چہ جائے اختلاط و ارتباط! صرف بہ رعایت جانب حق چند کلمات انہوں نے لکھا۔"

مرزا کا یہ خیال کہ اگر لغت میں مصدر کے معنی دئے جائیں تو مشتق کے معنی دینے کی ضرورت نہیں رہتی درست ہے اور اس اصول کو نظر انداز کر کے مصنف برہان نے الفاظ کا ذخیرہ بہت بڑھا دیا تھا اسی طرح شعرا نے الفاظ سے جو معانی استعارے کے طور پر کسی خاص نظم میں مراد لئے تھے ۔ انہیں بھی مصنف نے علیحدہ لغت کے طور پر درج کیا تھا چنانچہ مرزا لکھتے ہیں :-

" افزودن شمارۂ لغات بہر صورت مبتنی نہاد   چنانکہ کمال سمعی را اطلاق المعانی
لغت است اگر ایں بزرگوار را اطلاق الالفاظ خوانم چہ عجب است "

ان اصولی اعتراضوں کے علاوہ مرزا کو بعض الفاظ کے معانی سے بھی اختلاف تھا اور یہ اختلاف انہیں اکثر فرہنگ نویسوں سے تھا وہ وجہ اس کی یہ دیتے تھے :-

" معنی فرہنگیں اس موجود ہیں مشہور و غیر مشہور کچھ کم سو رسالے ہونگے مال سب رسالوں کے جامع سندی ہیں کوئی اہل زبان نہیں ہے استاد اساتذہ ایران کو جامد ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے بمناسبت مقام ان لغات کے معنی لکھ دئے بتخالط معنی کا مدار قیاس پر " مرزا کہتے تھے کہ ایسی فرہنگیں بے وقعت ہیں جو اہل زبان کی نہیں صحیح ہے حقیقتاً یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر آج بھی اہل الرائے متفق نہیں اور اگرچہ مرزا کی رائے بہت حد تک صحیح ہے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ آخر اساتذہ شعرا بھی تو بیشتر اہل زبان ہیں اور اہل زبان اپنے الفاظ کے جو معنی بتائیں گے انہیں اساتذہ کے کلام پر ٹھیک بیٹھانا بھی ضروری ہوگا اور اس طرح ان کے معانی اور فرہنگ نویسوں کے دئے ہوئے معانی میں فرق نہ ہوگا ۔

قاطع برہان کی مخالفت | قاطع برہان ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی اور جلد ہی اس کی

نہیں پہنچتے۔ چنانچہ جب دستنبو ختم ہوگئی۔ اور انہیں برہان کو بغور پڑھنے کی فرصت ملی۔ تو انہیں کئی بے قاعدگیاں نظر آئیں۔ انہیں اکٹھا کرکے انہوں نے دس تیرہ دن کو ایک رسالہ قاطع برہان کے نام سے شائع کیا۔ یہ رسالہ نواب کمیاب ہے لیکن اس کی اشاعت کے تین چار سال بعد مرزا نے دوسرا ایڈیشن درفش کاویانی کے نام سے شائع کرایا تھا جس کی ایک جلد برٹش میوزیم لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو ایک سرسری مطالعہ سے بھی واضح ہوتی ہے مرزا کی آزادئ قوتِ فیصلہ ہے۔ ہم نے اس کتاب کے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ کہ جس طرح مولینا اسمٰعیل شہید نے کورانہ تقلید کے خلاف لوگوں کو ابھارا تھا مرزا بھی رائے عامہ کے پابند نہ تھے۔ اور ہر ایک مسئلہ پر آزادانہ تنقید جائز بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ درفش کاویانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

"مرا نیز خردے در روانے دادہ اند۔ فراز آوردہ (یعنی نتائج) اندیشہ بیگانگاں را چوں بہ بذیرم و از سروئے خرد چہ داد او کار چرا نگرم"

وہ نہ صرف اپنے معاصرین کی رائے کو بہ نظرِ تنقید دیکھتے تھے بلکہ مولینا اسمٰعیل کی طرح اگلوں کے فیصلہ کے سامنے اندھا دھند سر نہ جھکاتے تھے۔ چنانچہ وہ تفتہ کو اسی زمانے میں ایک خط میں لکھتے ہیں "یہ نہ سمجھا کرو۔ کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں۔ وہ سب حق ہے۔ کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے۔"

ظاہر ہے۔ کہ جس طرح یہ نقطۂ نظر کہ جو اگلے کہتے تھے۔ سب درست ہے صحیح نہیں۔ اسی طرح کورانہ تقلید کو چھوڑ کر اندھا دھند مخالفت اختیار کرنے میں بھی کوئی مصلحت نہیں۔ ہر ایک مسئلہ کا فیصلہ اس کے اپنے حسن و قبح سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عام اغلاط اور الفاظ کے معانی سے قطع نظر فنِ لغت میں مرزا نے جو اصول وضع کئے ہیں۔ اور ان کے لحاظ سے برہان قاطع پر نکتہ چینی کی ہے۔ وہ بیشتر صحیح ہیں۔ مثلاً

باب نہم

سنہ ۱۸۶۱ء سے سنہ ۱۸۶۵ء تک

قاطع برہان | غدر کا ہنگامہ فرو ہوئے اب کئی سال ہو چکے تھے۔ دہلی جہاں تک تبدیل حالات کے ساتھ ممکن تھا ابھی پرانی حالت برقرار تھی۔ بظاہر تو غالب کو اس وقت ہر طرح مطمئن ہونا چاہیئے تھا۔ نام پورے باقاعدہ سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ پنشن جاری تھی۔ دربار اور خلعت بھی بحال ہو چکے تھے لیکن قاطع برہان کی اشاعت سے انہوں نے جو مخالفت عام مول لی اس نے یہ زمانہ ان کے لیے بہت تلخ کر دیا۔ قاطع برہان اوائل سنہ ۱۸۵۹ء میں لکھی گئی اور اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء کے بعد شائع ہوئی۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو دستنبو کا تتمہ ثانوی سمجھنا چاہیئے۔ دستنبو کی تحریر میں مرزا نے عربی الفاظ استعمال نہ کرنے کا التزام کیا تھا۔ اسے انہیں الفاظ کے اصل اور معانی پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت پڑی جس کے لئے انہوں نے مشہور فارسی لغت برہان قاطع کا غائر مطالعہ کیا۔ علاوہ ازیں اس وقت ان کے پاس پارسیوں کی کتاب دساتیر بھی تھی۔ اور چونکہ عربی الفاظ ترک کرنے کی وجہ سے قدیم فارسی کے کئی الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ "برہان قاطع" میں جو معنی دیے ہیں وہ دساتیر کی عبارت کے

"تمہارا کبھی یہ گمان نہ کیجے گا کہ دہلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے
یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین جس حاکم کے جوالے میں آئے وہ ویسا ہی کرے"
اسی معاملے کی عدالتی کارروائی کے متعلق یوسف مرزا کو ایک لطیفہ لکھا ہے۔

"مسمّو حافظ ممّو بے گناہ ثابت ہو چکے رہائی پا چکے حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے
ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے صرف حکم کی دیر ہے پرسوں
وہ حاضر ہوئے مثل پیش ہوئی حاکم نے پوچھا "حافظ محمد بخش کون" عرض کیا کہ "میں"
پھر پوچھا کہ "حافظ ممّو کون" عرض کیا کہ "میں" اصل نام میرا محمد بخش ہے ممّو ممّو مشہور
ہوں" فرمایا "یہ کچھ بات نہیں حافظ محمد بخش بھی تم حافظ ممّو بھی تم سارا جہان بھی تم
جو دنیا میں ہے وہ بھی تم ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخل دفتر ہوئی میاں ممّو اپنے گھر
چلے آئے۔"[۱]

میر مہدی جو دہلی کے حالات بار بار پوچھتے تھے انہیں غدر کے بعد دلی کا جو نقشہ
بدلا تھا اس کی تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راج گھاٹ
دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ
جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس
نشیب تھا اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ
بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا کشمیری دروازہ کا حال تم
دیکھ گئے ہو اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا
پنجابی کٹرہ۔ دھوبی واڑہ رام جی گنج سعادت خاں کا کٹرہ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔

ٹکٹ ملنے شروع ہوئے۔ اور پھر بعض کو شہر میں چند شرطوں کے ماتحت رہنے کی اجازت ملی۔ تحریری ٹیکس نومبر ۱۸۵۹ء میں عائد ہوا۔ چنانچہ مرزا ۹ر نومبر کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ٹون ڈیوٹی (Town Duty) کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۷ر نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنامل، بھیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام لگوانالی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں ہے۔ کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا ازدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکانِ مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں پرپرسوں سے حکم ہو گیا ہے۔ کہ کرایہ دار بھی رہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا ہم کوئی اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہ رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے کرایہ کے مکان میں رہتے تھے وہ بھی آرہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔"

اسی سال دسمبر میں جب گورنر جنرل نے میرٹھ میں دربار کیا۔ تو "مسلمانوں کی املاک کے واگزاشت کا حکم عام ہو گیا۔ جن کو کرایہ پر ملی تھیں۔ ان کو کرایہ معاف ہو گیا"۔ علاوہ ازیں مرزا ۳۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اتنا مسموع ہوا ہے۔ کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے۔ کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اُس کا معاوضہ دیک سرکار سے ہوگا۔"

دہلی کو چونکہ پنجاب کے حکام نے فتح کیا تھا۔ اس کا نظم و نسق بھی اب انہی کے ہاتھ میں تھا۔ اور نئے انتظامات کے ماتحت دہلی صوبۂ پنجاب کا حصہ تھی۔ لیکن اکثر اہالیانِ دہلی اس انتظام سے خوش نہ تھے۔ سر سید نے بڑے زور سے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ اور مرزا بھی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

رام پور بھیج دئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک فارسی ترجمہ نواب کی خدمت میں بھیجی جس میں ستاروں اور سیاروں کی روش بتا کر لکھا تھا کہ میں نے علم نجوم کے حساب سے پتہ لگایا ہے کہ غسل صحت ایسی ساعت مبارک میں ہو رہا ہے کہ اس کے اثر سے آپ عرصۂ دراز تک بیماری سے محفوظ رہیں گے لیکن علم نجوم کی بے اعتباری یا مرزا کی ناواقفیت ملاحظہ ہو کہ عرصۂ دراز تک بیماری سے محفوظ رہنا تو درکنار نواب صاحب جس صحت کے جشن کی خوشی میں تھے اور مرزا کی شرح جس سے ایک مہینے کے اندر راہگرائے عالم بقا ہوئے اور ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے

غدر کے بعد دہلی کی حالت

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ معظمہ کا اعلان معافی ہو چکا تھا اور ہندوستان کی عنان حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا قصیدہ ؎

در روزگار ما ستوا مد شمار یافت

خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

جس کی نسبت حالی کا خیال ہے کہ اعلان معافی کی تقریب پر لکھا گیا۔ اس سے پہلے کا ہے۔ اعلان معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا اور یہ قصیدہ اس سے پہلے ستمبر ۱۸۵۸ء میں دستنبو کے ساتھ چھپ چکا تھا جب مرزا اس اعلان سے قطعاً بے خبر تھے۔ اس قصیدہ کے کئی اشعار پیچیدہ اور ذومعنی ہیں لیکن غالباً یہ فتح کی مبارکباد ہے نہ کہ اعلان معافی کا شکریہ۔

اعلان معافی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا اور اس سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا لیکن اگرچہ سوائے ان لوگوں کے جن کے خلاف خاص شبہ تھے عوام کی جان بخشی کا حکم ہو گیا۔ دہلی کا شیرازہ جو بکھر اہوا تھا اسے بندھتے بہت دیر لگی۔ ہندوؤں کی آبادی کا حکم جنوری ۱۸۵۸ء ہی میں ہو گیا تھا بعد میں کچھ مسلمانوں کو شہر میں آنے جانے کیلئے

ایک شعر خاص غالب کے رنگ میں ہے ؎

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظمؔ کسے خبر ہے کہ انجامِ کار کیا ہوگا

ایک پُر لطف شعر رشک کے مضمون میں ہے ؎

کس کس کا کروں رشک کہ اس رہ گذر میں ہر ذرہ مجھے دیدۂ بینا نظر آیا

بعض اور پاکیزہ اور پُر لطف اشعار ہیں ؎

شبستاں میں رہو، باغوں میں کھیلو مجھ کو کیوں پوچھو کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں، دن کیونکر گزرتے ہیں

جس کو منظور ہو عالم کا پریشاں رکھنا اس کو کیا کام پڑا ہے، کہ سنوارے گیسو

مرزا اور نواب یوسف علی خاں کے مخلصانہ تعلقات کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جائے تعجب نہیں کہ جب نواب صاحب اخیر ۱۸۶۴ء میں بعارضۂ سرطان بیمار ہوئے۔ تو مرزا کو بے حد فکر لاحق ہُوا۔ وہ خود نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"جب سے حضرت کی ناسازیِ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہُوا ہے۔ عالم الغیب گواہ ہے۔ کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر پر روٹی نہیں پکی۔ ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبرِ وحشت اثر غلط نکلی۔ حواس ٹھکانے لگے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا۔ کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا۔ اور قطعہ تاریخ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا۔"

مرزا کو نواب صاحب کے غسلِ صحت کی اتنی جلدی تھی اور اتنا انتظار تھا۔ کہ ابھی اس کی تاریخ کے تعین کے متعلق انہیں کوئی پختہ اطلاع دربارِ رام پور سے ملی بھی نہیں لیکن انہوں نے ایک سُنی سُنائی افواہ کی بنا پر قطعہ تاریخِ غسلِ صحت اور قصیدۂ تہنیت[1] تاریخ غسلِ صحت سے بہت پہلے

[1] مطلع ہے: [illegible]

اے گُل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری!

اس لئے ہم چند ایسے منتخب اشعار جن میں غالب کا رنگ زیادہ نمایاں ہے ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش کرتے ہیں ؎

میں نے کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیر آہ و زاری سہہ ہائے تار گھونٹ — آوارۂ قبول دعائے سحر غلط

سوز جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افترا — شور فغاں سے جنبش دیوار و در غلط

ہاں سجدہ سے نمائش داغ و نقش و وضع — ہاں آنکھ سے تراوش خوں جگر غلط

بوس و کنار کے لئے بس قریب ہیں — اظہار پاکبازئ ذوق نظر غلط

چند اشعار میں غالب کی شوخئ اندیشہ صاف نمایاں ہے انہیں پڑھ کر دیوان غالب کے بعض اشعار یاد آتے ہیں ؎

رخصت عرض حال کیا مانگوں — کہہ نہ بیٹھیں کہیں کہ رخصت ہو!

دیکھنا شوخی کہ میرا بوجھ چھپتے پھرتے ہیں گھر — سُن لیا ہے یہ کہ اس کو کچھ نہیں گھر سے غرض

سمجھے ہیں اپنے دوش کے آنسو وصال میں — ناظم مجھی کو نیند نہ آئی تمام رات

وہ گھر کو دیکھنے آتے ہیں ناظم — نہ کیوں بیٹھا رہا میں گھر لُٹا کر

دل قافلہ منزل پہ بھی پہنچا مگر اب تک — ہم کہتے ہیں صحرا میں نہ آوارہ دوار قص

جو مرزا نے لکھ کر اپنے شاگرد کو ہبہ کر دئے تھے ۔ تو ادبِ اُردو میں ایک بیش قدر اضافہ ممکن ہے"۔

ہم نے یہ روایت کئی لوگوں سے سُنی ہے ۔ کسی کے پاس کوئی قابلِ وقعت ثبوت نہیں لیکن غالب کے ایک خط سے جو مکاتیبِ غالب میں شائع ہُوا ہے ۔ خیال ہوتا ہے ۔ کہ نواب صاحب کے اشعار کی اصلاح لفظوں کی تبدیلی اور معمولی حک و اضافہ تک محدود نہ تھی ۔ نواب صاحب کے ایک خط کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں :-

"حضور نے یہ تحریر فرمایا ہے ۔ کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے ۔ اگلی غزلوں کی طرح نہوں ۔ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی اور اون اشعار میں کلام خوش نہ تھا ۔ حضرت کا تو اون غزلوں میں بھی وہ کلام ہے ۔ کہ شاید اوروں کے دیوان میں ڈھونڈا ایک نسخہ بھی نہیں نکلے گا ۔ میں بقدر اپنے فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں قصور نہیں کروں گا"۔

ہم نے دیوانِ ناظم دیکھا ہے ۔ اور اس میں سے چند اشعار بھی پیش کریں گے لیکن اس میں غالب کے طرز کے اشعار تھوڑے ہیں ۔ اور ایسی غزل شاید ہی کوئی ہو ۔ جو دیوانِ غالب کے عام معیار کے مطابق ہو ۔ ویسے اگر نواب فردوس مکاں کا اپنا مرتبہ بحیثیت ایک شاعر کے نہ بھی مانا جائے ۔ تب بھی ان کی ذات ستودہ صفات میں ایسی خُوبیاں موجود تھیں ۔ جو انہیں اپنے تمام ہمعصر والیانِ ریاست سے ممتاز کرتی ہیں ۔ اور ہمارے نزدیک تو ان کی شاعری فقط شاعر پروری کا ایک بہانہ تھی[1]!

دیوانِ ناظم میں معمولی اشعار زیادہ ہیں ۔ لیکن آخر اس کلام کو غالب نے اصلاح دی ہے اور بڑی محنت سے اصلاح دی ہو گی ۔ بعض اشعار میں غالب کا رنگ جھلکتا ہے ع

[1] مرزا خود لکھتے ہیں ۔ "مخمس اور غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی ۔ یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کیا ہے"
خطوطِ غالب ص ۳۰۰

قابل اعتماد واقفیت ہم پہنچائی ہوگی منشی امتیاز علی عرشی مکاتیب غالب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"مرزا صاحب کے ہمدیدۃ الاستادی کے قیام پر چند ماہ گزرے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے آثار پیدا ہوئے لگے میرزا صاحب نے اپنے محسن شاگرد کی خدمت میں کچھ خطوط لکھے جو ان کی حسب ہدایت حاک کر دئے گئے اس ہدایت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ان تحریروں کا مضمون سیاسیات سے متعلق تھا اس لئے کہ جب آتش غدر بھڑک اٹھی اور نواب مذکور مکین کے لئے ماگزیر ہوگیا کہ اسا رویہ معین کریں انہوں نے انتہائی ہوشمندانہ طریق کار اختیار کیا

یہ رویہ جسے مرزا صاحب نے پیام خشک سے تعبیر کیا ہے اور اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا تھا جب تک حالات کا صحیح علم اور ان کے پیدا ہونے کے واقعی اسباب قبل از وقت نہ معلوم ہو چکے ہوں"

جب نواب یوسف علی خاں مرزا کے شاگرد ہوئے اس وقت تک انہیں شعر گوئی سے کوئی رغبت نہ تھی وہ مرزا کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے ابھی تک ایک مصرعہ موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ناظم تخلص بھی غالب کا تجویز کردہ تھا نواب صاحب نے پہلی غزل میں یوسف تخلص استعمال کیا تھا لیکن مرزا نے انہیں لکھا میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے ناظم عالی اور شوکت بیسان ان میں سے جو پسند آئے رہنے دیجے۔ نواب صاحب کا ایک مختصر سا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح کلیات ظفر میں ذوق کا بہت سا کلام شامل ہے۔ دیوان ناظم میں بھی غالب کے سائج فکر موجود ہیں۔ الناظر کی ایک اشاعت میں لکھا تھا۔

"البتہ اگر نواب یوسف خاں ناظم کے دیوان سے وہ اشعار کسی صورت علیحدہ کئے جا سکیں

نواب صاحب کی کرمفرمائی اور فیاضی کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے۔ کہ اگرچہ ایک لحاظ سے ماہوار تنخواہ حقِ شاگردی ادا کرنے کے لئے تھی۔ لیکن باوجودیکہ مرزا نے ضعفِ پیری کی بنا پر اصلاحِ اشعار سے معذرت چاہی، اور بقول مولوی امتیاز علی عرشی اکتوبر ۱۸۶۳ء کے بعد انہوں نے بہت کم اشعار کو اصلاح دی، لیکن ان کا وظیفہ انہیں باقاعدہ ملتا رہا مرزا خود ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"رئیس رام پور سو روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔ سال گزشتہ اُن کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے۔ اور میں ایسے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے۔ عوض خدماتِ سالقہ میں شمار کیجئے۔ تو میں سکھ نمبر[1] سہی۔ ورنہ خیرات خوار سہی۔ اور اگر یہ عطیہ بشرطِ خدمت ہو تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آئی۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب ازراہِ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔"

مرزا نے اپنے کئی خطوں میں نواب صاحب سے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ نواب خلد آشیاں مرزا کو اپنا مخلص اور خیرخواہ دوست سمجھتے تھے۔ مکاتیبِ غالب کے ایک خط سے خیال ہوتا ہے۔ کہ غدر کے آغاز میں مرزا اور نواب کے درمیان خفیہ خط و کتابت ہوتی تھی۔ اور غالباً اس موقع پر مرزا نے انہیں دربارِ دہلی کے متعلق صحیح اور

[1] یعنی سک نمبر (Sick Number) مرزا کے خطوط میں انگریزی الفاظ کی تعداد خاصی ہے۔ بعض تو فقط شوخی سے استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ مرزا کو اردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے سے اس طرح گریز نہ تھا۔ جس طرح حالی کے بعض انشا پردازوں کو ہے۔

نہ ہونے دی ۔ اور اس کے نصف صدی بعد حضور نظام سابق کو سر سید احمد خاںؒ کی ملاقات سے محروم رکھا لیکن ہزار آفریں ہے نواب یوسف علی خاں کی عالی حوصلگی اور ادب نوازی پر کہ باوجودیکہ غالب ان کا تنخواہ دار ملازم تھا انہوں نے ہمیشہ اس سے برابری کا سلوک کیا اور اسے کسی ایسی بات پر مجبور نہ کیا جس سے اس کی غیرت اور خودداری مجروح ہو۔ مرزا جس بے تکلفی سے نواب صاحب کو مخاطب کیا کرتے تھے اس کا اندازہ مندرجہ بالا خط سے ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد جب مرزا نواب کی بار بار کی دعوتوں کے بعد رام پور گئے ہیں۔ تو وہاں بھی انہیں مدیا اس طرح کی دوسری الجھنوں سے پریشان نہیں کیا گیا نواب صاحب ان سے بالکل دوستوں کی طرح ملے ہیں مرزا اپنی تنخواہ کا ذکر کر کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ملاقات بھی دوستانہ رہی معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی والسلام"

نواب صاحب مرزا سے جو دوستانہ برتاؤ کرتے تھے اس کا اندازہ اس خط سے بھی ہو سکتا ہے جو نواب فردوس مکاں نے مرزا کو تعین تنخواہ کے وقت لکھا۔

شفیق مکرم ملک آگیں صحیفہ دسویں اس مہینے جولائی سنہ حال کا بیچ میں اصلاح کے عارہ آپ کے جیرہ وصول بساطت سمعیل کا ہوا اور اوپر مراتب مرقومہ کے مطلع کیا اور اس غزل کی اصلاح سے مخلص کو کمال مسرت ہوئی۔ اور بہ نظر آپ کی دیرینہ ملاقی کے اس مہینہ جولائی سے سو روپیہ مہینہ مقرر کیا گیا اور دفتر میں نام آپ کا مندرج کیا گیا مرجیسے معمورہ سوا سیکھی یقین ہے کہ آپ بھی محمول کمال محبت میں فرمائیں گے۔

"آداب نیاز بجا کر عرض کرتا ہوں۔ کہ سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا۔ اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں۔ تو کس سے کہوں۔ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجیئیگا تو جلا بیٹھیگا۔ لیکن اس شرط سے کہ اس عطیہ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حد ادب۔"

نواب صاحب نے فوراً جواب لکھا:۔

"مشفقا! بپاس ارقام سامی کے، کہ مخلص کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے محبت اور موانست قلبی ہے، ہنڈوی مبلغ دوسو روپیہ کی سوائے مشاہرۂ معینہ معطوف رقیمۃ الوداد ہذا کے مرسل ہے۔ اور چشمداشت آپ کی لطف فرمائی سے یہ ہے۔ کہ رسید ہنڈوی مذکور سے مطلع اور مطمئن فرمائیں۔"

نواب فردوس مکاں نے جس خسروانہ پیمانے پر غالب پروری کی۔ اس کی تعریف نہ کرنا گناہ ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ قابل ستائش امر یہ ہے۔ کہ اس فراوانئ عنایات کے باوجود انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی۔ جس سے شاعر کے عزِ نفس کو صدمہ پہنچے۔ اور اسے اپنی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہو۔ آج اقلیم شعر و سخن میں جو بلند مرتبہ غالب کا ہے یقیناً ناظم کا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ دیسی ریاستوں میں رؤسا کے حاشیہ نشین آئین و روایات اور حفظِ مراتب کی آڑ میں ایک ایسا نظامِ عمل قائم کر لیتے ہیں۔ جس کی پابندی خوددار ہستیوں کو ناگوار ہوتی ہے۔ اور جس کے تحت رؤسا کی فیاضیوں سے وہی لوگ حصہ وافر پاتے ہیں۔ جو اہلِ کمال ہوں یا نہ، لیکن "فنِ گداگری" میں دسترس رکھتے ہوں۔ آئین و اسلوب کی یہی الجھنیں تھیں۔ جنہوں نے ۱۸۶۷ء میں مرزا غالب اور نائب والیٔ اودھ کی ملاقات

اور جیسا کہ ہم باب ہشتم میں بیان کر چکے ہیں نواب صاحب شعر گوئی میں مرزا صاحب کے شاگرد ہوئے +

نواب صاحب کے مرزا پر جو جلیل القدر احسانات ہیں، انہیں ہر شخص جسے مرزا کے حالات سے ذرا بھی دلچسپی ہے، جانتا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ غالب کو تمام عمر نواب فردوس مکاں سے زیادہ فیاض محسن اور عالی حوصلہ مربی میسر نہیں آیا۔ انہوں نے غالب کی اس زمانے میں دستگیری کی جب اُس کے خلاف بادشاہ دہلی کی مدح گوئی اور امامت مایل کے شبہے ابھی باقی تھے۔ اور جب اُس کی علانیہ طرفداری ایک والیٔ ریاست کے لئے خلاف مصلحت تھی۔ اخیر ۱۸۵۵ء میں جب مرزا سخت مایوسی کی حالت میں تھے۔ نواب صاحب انہیں لکھتے ہیں۔

مشفقا ہنگام ملاقات کے اکثر صاحبان ذیشان سے قدر کار عمادہ اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالٰے کے فضل اور عدد والی سرکار دولتمدار سے تفس واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں، ہمیشہ گورنمنٹ سے بھی انہی مطابق ظہور میں آوے گا +

نواب صاحب کی مدد محض اخلاقی نہ تھی عملی تھی۔ اس زمانے میں مرزا کی پنشن بند تھی اور آمدنی کے تمام ذرائع سراسر مفقود تھے لیکن نواب صاحب نے کئی مرتبہ دو سو ڈھائی سو روپے نقد ارسال کئے۔ جب ان سے بھی مرزا کی ضروریات پوری نہ ہوئیں اور انہوں نے مستقل تنخواہ کے لئے لکھا تو نواب صاحب نے فوراً ایک معقول رقم بطور ماہوار مشاہرہ کے مقرر کردی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی خاص ضرورت ہوتی تو مرزا بے تکلفی سے مانگ لیا کرتے تھے۔ اور شاذ و نادر ہی ان درخواستوں کی تعمیل میں کوتاہی ہوتی۔ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں۔

صاحبزادے ۔ مرزا کی خوش قسمتی تھی ۔ کہ نہ صرف ان برگزیدہ حضرات سے ان کی دوستی ہو گئی بلکہ اس بکھرے ہوئے قافلے کا وہ فردِ عزیز، جو آگے چل کر رام پور میں مسند نشین ہونے والا تھا۔ ان کے حلقۂ شاگردی میں آیا ۔ نواب یوسف علی خاں ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوئے ۔ اور چونکہ اس وقت ان کے والد نواب محمد سعید خاں ابن نواب غلام محمد خاں، دہلی میں اقامت گزیں تھے ۔ ان کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی ۔ عربی انہوں نے مفتی صدر الدین آزردہ اور مولٰینا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی ۔ اور فارسی، مرزا غالب اور خلیفہ غیاث الدین مصنف غیاث اللغات سے ✦

نواب غلام محمد خاں اور ان کی اولاد کو رام پور چھوڑے پچاس سال نہ ہوئے ہوں گے۔ کہ سنہ ۱۸۴۰ء میں نواب سید احمد علی خاں والئے رام پور، نے وفات پائی ۔ اور حکومت انگلشیہ نے ان کا جانشین نواب غلام محمد خاں کے صاحبزادے نواب محمد سعید خاں کو منتخب کیا ۔ اس موقع پر نواب صاحب کے بھائی اور مرزا کے قدیمی دوست نواب عبداللہ خاں نے مرزا سے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی ۔ لیکن یا تو مرزا ابھی تک شاہانِ دہلی و اودھ اور حکامِ انگریزی کے علاوہ کسی دوسرے کی تعریف میں مدحیہ قصیدہ لکھنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ یا ان دنوں کسی خاص پریشانی میں مبتلا تھے ۔ انہوں نے یہ لکھ کر کہ میں زندہ نہیں ہوں مُردہ ہوں ۔ اپنی پریشان خیالی کا عُذر کیا ۔ اور مدح گوئی سے معذرت چاہی ✦

نواب یُوسف علیخاں فردوس مکاں

نواب سید محمد سعید خاں نے ۱۸۵۵ء میں وفات پائی اور ان کی جگہ نواب سید محمد یُوسف علی خاں تخت نشیں ہُوئے ۔ مرزا نے اس موقع پر ایک مختصر سا قطعہ تاریخِ جلوس اپنے قدیمی شاگرد کی خدمت میں ارسال کیا ۔ لیکن اس کا رام پور سے کوئی جواب نہ گیا ۔ اور پرانے تعلقات کی تجدید نہ ہُوئی ۔ اس کے دو سال بعد مولٰینا فضل حق نے جو ان دنوں رام پور میں مقیم تھے ۔ سلسلہ جنبانی کی ۔

چنانچہ رابرٹ منٹگمری لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے، جن کی تعریف میں مرزا نے فارسی قصیدہ لکھا تھا ۲۴ مارچ ۱۸۶۳ء کو مرزا کو بلا کر انہیں خلعت عطا کیا۔

دربار رام پور سے مرزا کے تعلقات | ہم نواب یوسف علی خاں صاحب اور مرزا کے تعلقات کا ضمناً ذکر کر چکے ہیں لیکن چونکہ مرزا کے آخری ایام میں ان تعلقات کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور انہوں نے مرزا کو فاقہ کشی کی مصیبت سے بچایا اس لئے مناسب ہے کہ انہیں ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔

۱۷۹۴ء میں نواب سید غلام محمد خاں رام پور میں مسند نشین ہوئے لیکن حکومت اودھ نے، جو ریاست رام پور کے معاملات میں کئی بار دخل انداز ہوئی تھی، اس کی مخالفت کی اور نواب صاحب اور ان کی اولاد کو رام پور چھوڑنا پڑا۔ رام پور چھوڑنے کے بعد یہ حضرات دہلی مقیم ہوئے جہاں مرزا غالب کے اس خاندان کے کئی افراد سے تعلقات پیدا ہو گئے مرزا غالب ۱۸۵۸ء کے ایک فارسی خط میں والئے رام پور کو ان تعلقات کی یاد دلاتے ہیں۔ اور نواب صاحب کے ایک قرابت دار کی جو دہلی آ کر مرزا سے بہت ملے دلے تعلقوں میں حکایت کرتے ہیں۔

"ہمدریں کچہ، کہ مسکن من است سعدہ ام کہ والاشان زین العابدین خاں بہادر تشریف آوردہ اند بیار مہدی من مادر جوئی نواب عبداللہ خاں بہادر، و مہر درسئے من با صغر علی خاں مرحوم و محبت و خلت من با نواب عبدالرحمان خاں بہادر معمور کہاد نہ اند و آں مدائح کے در نظر دارند کہ الیشاں بدان ضمیر میگرنست کہ گدائے گوشہ نشیں را ماندہ اند۔"

مرزا نے اس خط میں جن حضرات کا ذکر کیا ہے ان میں سے نواب عبداللہ خاں اور نواب عبدالرحمان خاں، نواب یوسف علی خاں کے چچا تھے اور سید اصغر علی خاں نواب عبداللہ خاں کے

اور مرزا جب دہلی واپس پہنچے۔ تو انہیں پنشن کی جو پائی پائی باقی تھی سب ملی۔ چنانچہ ۱۷ مئی ۱۸۶۰ء کو جو خط انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے۔ اس میں تین برس کا زرِ مجموعہ دو ہزار دو سو پچاس روپیہ پانے اور اس کے ادائیگی قرضہ میں صرف ہو جانے کی تفصیل درج ہے۔ مرزا کی پنشن موروثی تھی۔ اس لئے وہ اب باقاعدہ ملنی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ ان کی وفاداری کی نسبت حکام کے دل میں شبہات تھے۔ ان کا درباری اعزاز اور خلعت جو گورنر جنرل کا عطیہ تھے۔ بحال نہ ہوئے۔ مرزا کو اس کا بہت رنج تھا لیکن خوش قسمتی سے مارچ ۱۸۶۳ء میں حکام نے یہ شکایت خود بخود رفع کر دی۔ چنانچہ مرزا خان بہادر منشی غلام غوث بےخبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے مشفق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا۔ کہ "تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار" رہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا۔ کہ "حضرت کیونکر"۔ حضرت نے کہا کہ "حاکم حال نے ولایت سے واپس آ کر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے ہیں اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا۔ کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔"

(بقیہ نوٹ صہ ۱۲۳)
سرسید انہیں سرائے سے اپنے مکان پہلے گئے۔ قرین قیاس ہے۔ کہ مرزا نے اس قیام کے دوران میں اپنے مصائب کا بیان کیا ہو۔ اور سرسید نے انہیں دور کرنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہو۔ چونکہ مرزا نے بالوضاحت لکھا ہے۔ کہ پنشن کی بازیابی میں نواب رام پور کو دخل نہ تھا۔ اور ان کی کوشش کے دوسرے سب ذریعے ناکام ہو چکے تھے۔ اس لئے سرسید کی مدد اور بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے +

حسن بہن دریغ کے قائل ؟

اس زمانے میں انہوں نے دربار احکام اور وٹیالکی تعریف میں قصائد لکھے اور مدد چاہی لیکن جب ادھر سے کچھ نہ حاصل ہوا۔ تو انہوں نے رامپور کا رُخ کیا۔ نواب یوسف علی خاں صاحب جو میں رام پور ۱۸۵۷ء سے اُن کے شاگرد تھے اور گاہے گاہے کچھ بھیجا کرتے تھے غدر کے بعد مرزا کی حالت بہت خراب ہوئی تو اُنہوں نے نواب سے مدد کی درخواست کی چنانچہ نواب کی طرف سے ایک سو روپیہ ماہانہ اُن کی مدد کے لئے جولائی ۱۸۵۹ء کے وسط سے مقرر ہو گیا تھا اسی دوران ۱۸۶۰ء میں مرزا کو حکام انگریزی کی طرف سے مدد مالا حواب ملا تو وہ رام پور گئے۔ وہاں نواب نے ان کی بہت توقیر کی اور مدد معاش کے متعلق وعدہ کیا کہ اگر مرزا رام پور رہیں تو دو سو روپے ماہوار پائیں اور اگر دہلی رہیں تو سو لیکن مرزا عارف کے دو بچوں کو ساتھ لے گئے تھے وہاں وہ گھبرا گئے اس لئے مرزا ڈیڑھ دو مہینے رام پور رہنے کے بعد اخیر مارچ میں دہلی واپس لوٹے۔

مرزا کو خیال تھا۔ کہ نواب کی وساطت سے حکام سے معافی ہو جائے گی ابھی نہیں کامیابی نہ ہوئی لیکن نواب کا مرزا سے جو نیم مربیانہ تعلق تھا وہ سمر رام پور سے اور مستحکم ہو گیا اس کے علاوہ اگرچہ مرزا کا دربار و خلعت موقوف ہو گیا تھا اور پنشن کے بارے میں بھی حاکم دہلی نے ان کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ حکام بالا کی طرف سے اُن کی پنشن کے اجرا کا حکم ہو گیا

لہ معلوم نہیں مولینا ابوالکلام آزاد نے کس شہادت کی بنا پر لکھا ہے کہ سر سید نے پنشن کی بحالی کیلئے بہت کوشش کی (الہلال جولائی ۱۹۱۲ء) لیکن یہ بیان غیر اغلب ہیں حیاتِ جاوید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۰ء میں نواب رام پور سے ملنے کے بعد جب مرزا واپسی پر مراد آباد ٹھہرے تو

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ لارڈ کیننگ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا تھا ؎

زسالِ نود گر آبے بروئے کار آید
ہزار و ہشتصد و شست در شمار آید

وہ بھی مع اس حکم کے واپس آیا۔ کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔[1]

مرزا کی پنشن کے متعلق شروع ۱۸۵۹ء میں حوصلہ افزا تحقیقات ہوئی تھی۔ اور انہیں ایک سو روپیہ بطریق امداد بھی ملا تھا۔ لیکن اب جو انہیں دربار کے متعلق یہ جواب ملا۔ وہ پنشن سے بھی مایوس ہو گئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"۵۲ برس کا پنشن۔ نفر اس کا بہ تحویہ لارڈ لیک و بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے۔ نہ ملے گا، خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے۔ نہ کوئی

(بقیہ نوٹ صہ ۱۲۱)
یہ خیال غالباً غلط تھا۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ غدر کے دوران میں غالب کے تعلقات بہادر شاہ سے منقطع نہیں ہوئے تھے۔ اور آگرہ کے اخبار آفتاب عالمتاب میں بھی لکھا ہے۔ کہ مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ر جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے +

[1] یہ تمام واقعات مرزا کے اپنے خطوں سے ماخوذ ہیں۔ لطف یہ ہے۔ کہ ان کے باوجود مولینا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔ "ان (مرزا) کی غیرت وحمیت نے گوارا نہ کیا۔ کہ فتح دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے عاجزی و خوشامد کریں۔" اور ان کی طبیعت کچھ اس طرح بیزار ہوئی کہ فتح کے بعد قلعہ میں وفاداران سرکاری جمع ہوئے۔ انعامات اور اسناد ملیں مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے اور کسی حاکم کے آگے جا کر اس کا منتقم اور قاہر چہرہ نہ دیکھا۔" (الہلال ۱۷ر جون ۱۹۱۴ء)

پنشن کی بازیابی

غدر کے بعد جب مرزا کو جان کی سلامتی کا یقین ہوا تو انہیں پنشن کی فکر ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے ملکہ وکٹوریہ اور حکام عالیشان کی تعریف میں قصائد لکھ کر حکام دہلی کی معرفت ارسال کئے لیکن ۷؍ مارچ ۱۸۵۸ء کو کمشنر دہلی نے یہ لکھ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ ان میں سوائے ستائش و مدح کے کچھ نہیں۔ جب اس سے کچھ مہینے بعد اکتوبر میں دستنبو چھپی تو مرزا نے چند جلدیں نہایت محنت سے مجلد کروا کے دو ولایت اور چار ہندوستان میں حکام اعلےٰ کی نذر کیں معلوم ہوتا ہے یہ کتاب حکام کی نظر میں مقبول ہوئی۔ چنانچہ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم یو۔ پی نے بہت تعریف لکھی اور مسٹر میکلوڈ فنانشل کمشنر نے خود لکھ کر کمشنر دہلی کی معرفت یہ کتاب مرزا سے منگائی لیکن اس قدردانی کے باوجود حکام کا دل ان سے صاف نہ ہوا۔ اور جب جنوری ۱۸۶۰ء میں میرٹھ میں دربار ہوا اور سب درباری وہاں بلائے گئے تو مرزا کو وہاں مدعو نہ کیا گیا۔ جب گورنر جنرل کا کیمپ میرٹھ سے دہلی آیا اور مرزا نے چیف سیکرٹری کے خیمہ میں ملاقات کے لئے اپائنٹمنٹ لکھوایا تو وہاں سے جواب ملا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے[1]۔ اس

[1] معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے متعلق خیال تھا کہ غدر میں انہوں نے بہادر شاہ کی تخت نشینی پر سکہ لکھا تھا
(باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

شراب جو ان کے لئے نانِ خوردنی سے بھی زیادہ ضروری تھی۔ مہیش داس مہیا کرتے تھے اور ان کی تنہائی میں ہیرا سنگھ، شوجی رام اور بالمکند غمگساری اور خدمت گاری کے لئے حاضر رہتے تھے۔ لیکن مرزا کا ہاتھ خرچ کے معاملے میں ہمیشہ آزاد رہا تھا۔ مالی حالت اُن کی تسلی بخش نہ تھی اور چونکہ مُستقبل کی نسبت ابھی کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اس لئے دستنبو کا آخری حصّہ جسے اُنہوں نے یکم اگست ۱۸۵۸ء کو ختم کیا نہایت مایوسانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سابق پنشن اگر مل گئی تب بھی کچھ نہیں بنے گا۔ اور نہ ملی تو قصہ ہی پاک ہے:۔

"کہن پنشن اگر بدست آید۔ نیز زنگ از آئینہ غمے نزداید و اگر فراچنگ نیا مد برآبگینہ جز سنگ نیامد۔"

مولینا بھی مرزا کے سچے دوست بلکہ محسن تھے آب حیات اور یادگار غالب سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا کا ابتدائی طرز شاعری ترک کروانے میں سب سے زیادہ دخل مولینا فضل حق کا ہے اس نسخہ سماجی کے علاوہ مولینا، مرزا کی اقتصادی مشکلات حل کرنے میں بھی کوشاں رہتے عذر کے بعد مرزا کی مدد گی کا سب سے بڑا سہارا رامپور کا دربار تھا اور اس دربار کے ساتھ مرزا کے تعلقات وابستہ کرنے میں جو دخل مولینا فضل حق کی کوششوں کو تھا اس پر مرزا کی یہی تصانیف گواہ ہیں +

ظاہر ہے کہ جب ایسے دلی دوست اور حقیقی بہی خواہ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے تو مرزا کی کیا حالت ہوگی؟

مرزا کی اپنی مصیبتیں

مرزا خود تو ان مصائب سے محفوظ رہے لیکن اُن کیلئے بھی یہ وقت قیامت کی گھڑی سے کم نہ تھا ایک تو ایسا مستقل تیرہ و تاریک پھر اتنے دوستوں کا غم۔ بھائی کی موت کا صدمہ اس کے علاوہ اگرچہ وہ لکھتے ہیں کہاں کے گھر کی کوئی چیز چھوٹی نہ گئی لیکن ان کی تمام قیمتی چیزیں جو ان کی بیوی نے حفاظت کے لئے کالے ساہ صاحب کے تہ خانے میں بھجوادی تھیں وہاں سے نکال لی گئیں مرزا لکھتے ہیں کہ قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ پہنے اور بچھونے کے علاوہ اور کوئی چیز گھر میں نہ رہی چنانچہ وہ یہی اوڑھنے پہننے کے کپڑے بیچ بیچ کر پیٹ بھرتے رہے "لعروحتش آں گستر دلی و پوستیدلی جاں وتن ہمی سرور دم گوئی کہ دیگراں نان میخورند و من جامہ مے خورم" لیکن بحکم حضوری ۱۸۵۸ء سے شہر میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو چکا تھا۔ اور مرزا کے ہندو شاگردوں اور دوستوں نے ان کی اس مصیبت کے وقت میں بڑی مدد کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ آگرے سے روپے اور کپڑے بھیجتے رہے

اُنھوں نے ۱۲۶۴ھ میں مولینا کو دیکھا۔ تو وہ اس وقت شطرنج میں مشغول تھے۔ اور ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو اُفق المبین کا سبق دے رہے تھے۔ اور کتاب کے مطالب بڑے حسن بیان کے ساتھ اس کے ذہن نشین کر رہے تھے۔

مولینا کی قابلیت اور قوتِ تحریر و تقریر میں کلام نہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ اس کے زور پر ایسے خیالات و عقائد کو آب و تاب دینے کی کوشش کرتے۔ جو حقیقت میں ضعیف اور بے بُنیاد ہوتے۔ اس کی ایک مثال ان کی وہ بحث تھی۔ جو انہوں نے امتناعِ خاتم النبیین کے متعلق مولینا اسمٰعیل شہید سے شروع کر دی تھی۔ مولینا نے تقویت الایمان کی تیسری فصل میں عقیدۂ توحید کی توضیح کرتے ہُوئے کہا تھا۔ کہ خدائے تعالےٰ کی تو وہ شان ہے کہ " اگر وہ چاہے۔ تو ایک آن میں ایک حکمِ کن سے کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتے، جبرئیل اور محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے "۔ مولینا فضل حق کو یہ اظہار رائے بے ادبی پر مشتمل معلوم ہُوا۔ اور انھوں نے اس کے جواب میں ایک رسالہ لکھا۔ جس میں مختلف عقلی اور نقلی دلائل دے کر ثابت کرنا چاہا کہ چونکہ رسول اکرمؐ خاتم النبیین تھے۔ خدا اُن جیسا پیدا نہیں کر سکتا۔ مولینا نے اپنے خیالات کی تائید میں مرزا غالب سے بھی مدد لی۔ اور ان سے ایک فارسی مثنوی لکھوائی۔ جس میں مولینا اسمٰعیل کے خیالات کی تردید کی گئی تھی۔ شروع شروع میں تو اس مثنوی میں مرزا نے امتناع النظیر خاتم النبیین کے مسئلہ پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ مولینا فضل حق سے زیادہ مولینا شہیدؒ کی ترجمانی کرتے تھے۔ لیکن جب مولینا نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ تو مرزا نے چند اشعار کا اضافہ کر کے مولینا کے نقطۂ نظر کو نظم کر دیا۔

مولینا فضل حق اور مرزا کے درمیان جو قریبی دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ لیکن مرزا کے کئی خطوط سے بھی ان کے دِلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

"ہاں حالی صاحب آپ جو کلکتے پہنچے اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کس طرح پائی اور کہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے کس طرح گذارا ہوتا ہے۔"

داستان تاریخ اردو میں لکھا ہے کہ مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق غوث تحریر کی کوشش سے رہائی کا حکم صادر ہوا تھا لیکن جس وقت پروانہ آزادی رنگون پہنچا اس وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا ۱۸۶۱ء / ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔ اور رنگون ہی میں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا فضل حق خیرآبادی، جو ایک مشہور فاضل، مولوی فضل امام خیرآبادی کے صاحبزادے اور ایک نامور عالم، مولانا عبدالحق خیرآبادی کے والد تھے قدیم طرز کے علما میں خاص مرتبہ رکھتے تھے وہ مرزا غالب کے بالکل ہم عمر تھے لیکن ملاکے ذہین اور قابل تھے اس لئے چھوٹی عمر میں ہی بڑی شہرت حاصل کر لی تھی تذکرہ غوثیہ میں ان کی نسبت ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کے علمی تبحر کا اشارہ ہوتا ہے۔

"ایک روز کا ذکر ہے کہ مولوی فضل حق نے ایک قصیدہ عربی زبان میں امراء القیس کے قصیدہ پر کہا اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں لائے شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا اس کے جواب میں انہوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیئے جناب مولوی فضل امام صاحب نے فرمایا کہ بس حد ادب انہوں نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں یہ شاعری ہے اس میں نے ادبی کی کیا بات ہے شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردار تو سچ کہتا ہے مجھ کو سہو ہوا تھا"

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف نے بھی ان کی ذہنی قوتوں اور بہ یک وقت ایک سے زیادہ چیزوں کو دھیان میں رکھنے کی قابلیت کی ایک دلچسپ مثال دی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب

"بجز استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر" میرٹھ گئے۔ اُن سے ملے۔ اور چار دن قیام کے بعد واپس آئے +

مفتی صدر دین | مولینا مفتی صدر الدین آزردہ جو فارسی کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ غدر سے پہلے دہلی میں صدر الصدور تھے۔ لیکن اس کے باوجود محفوظ نہیں رہے۔ مرزا ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دیر حوالات میں رہے کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لیفٹننٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں"+

مولوی فضل حق خیر آبادی | سب سے زیادہ حسرت ناک انجام مولوی فضل حق خیر آبادی کا ہوا جو علاوہ اپنی علمی اور دینی قابلیت کے اس لئے بھی یاد کے مستحق ہیں۔ کہ اُنہوں نے غالب کو بیدل کی تقلید سے روکا۔ اور اس کی شاعری کے لئے ایک "اُستادِ کامل" ثابت ہوئے۔ جو بقول میر تقی میر مرزا کی شاعری کی نشو و نما کے لئے ضروری تھا۔ غالباً انہیں کی نسبت یوسف مرزا کے نام ایک اُردو خط میں لکھا ہے:۔

"مولینا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس رہا بلکہ تاکید ہوئی۔ کہ جلد دریائے سور کی طرف روانہ کرو ...... ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہونا ہے۔ جو ہونا تھا۔ سو ہو لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون"

مولینا دہلی سے جلاوطن ہو گئے۔ لیکن مرزا کے دل سے فراموش نہیں ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں منشی داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:۔

مندرجہ بالا واقعات تو دستنبو سے ماخوذ ہیں لیکن مرزا نے اُردو رقعات میں اپنے باقی دوستوں پر اس پُر آشوب زمانے میں جو کچھ گزری اس کی داستان قدرے تفصیل سے لکھی ہے اور چونکہ مرزا کے بیدوست الیانِ ادب کے تساماعلہ ستون بھی تھے ہم ان کے حالات مرزا کے خطوط سے انتخاب کرکے درج کرتے ہیں ۔

نواب مُصطفیٰ خان شیفتہ | نواب مُصطفیٰ خاں شیفتہ کو غدر کے بعد سات سال قید کا حکم ہُوا تھا ۔ و معزز جاگیردار اور اُردو فارسی کے باکمال شاعر تھے اور اُردو شعرا کا تذکرہ فارسی زبان میں اُنھوں نے گلشنِ بے خار کے نام سے لکھا تھا اس کے صفحے صفحے سے اُن کا پاکیزہ ادبی مذاق ظاہر ہوتا ہے ۔ انھوں نے آزاد کی طرح واقعات کو نمک مرچ لگا کے پیش نہیں کیا ۔ اس لئے ان کا تذکرہ خواص کی آنکھ کی عینک ہے ۔ آبِ حیات کی شہرت عامہ سے حاصل نہیں ہُوئی لیکن اُن کے مختصر فقرے بلاغت کی جان ہیں اور جب اس تذکرہ میں اُن کی میانہ روی اور انصاف پسندی حسن کا کارس قالبی بہت مدلح تھا ۔ دیکھتے ہیں تو بیبات بھی کچھ میں آتی ہے کہ حالی کیوں کہتا تھا کہ میں نے غالب سے بہت کم سیکھا ہے اور میری تحریر کی سادگی اور سچائی اور صحیح ادبی مذاق کچھ تو طبعی تھا اور بیشتر شیفتہ کے فیض صُحبت کا نتیجہ ۔ مرزا نواب کی نثر اور شاعری اور مذاق سخن کے مداح تھے اس کے علاوہ جو مہربانیاں ان پر قید کے دوران میں نواب نے کیں انہیں وہ بھی بھُولی نہ ہوگئیں چنانچہ اس کی معیت دل پر گہرا رحم تھا ایک خط میں لکھتے ہیں

مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہوگا خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے وہ حسن بہت سا کی تاب اس تار پر شدہ میں کہاں "

جب نواب کی اپیل کامیاب ہُوئی اور وہ رہا ہوگئے تو مرزا نے دست دہائی کیلئے جو

بچاکر بھاگ نکلے تھے۔ جس طرح شہر میں اور گھر لوٹے گئے۔ ان کے گھر میں بھی جھاڑو دی گئی۔ لیکن اَوروں کے ہاں مکان تو سلامت رہے۔ یہاں کسی نے مکان کے پردوں اور سائبانوں میں آگ لگادی۔ چنانچہ لکڑی اور پتھر اور درو دیوار سب جل کر راکھ ہوگئے۔ نواب ضیاءالدین اور حسین مرزا کو جو مصیبتیں پیش آئیں۔ بہت دردناک تھیں۔ لیکن ایک خاص طور پر قابلِ افسوس بات یہ ہے۔ کہ ان کی تباہی سے مرزا کا وہ کلام ضائع ہوگیا۔ جو ان کے ہاں جمع ہوتا تھا۔ مرزا غدر کے بعد ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں:-

"بھائی ضیاءالدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی فارسی نظم و نثر کے مسوّدات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کرلیا کرتے تھے۔ سو ان دنوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔"

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ ۱۸۵۷ء میں مرزا نے اپنے اُردو کلام کا ایک نسخہ رام پور بھیجا تھا۔ وہ تو سلامت رہا۔ اور اس کی نقلوں سے ۱۸۶۱ء میں موجودہ اُردو دیوان تیار ہُوا۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اگر مرزا نے اس کی نقل بھیجنے کے بعد کوئی اُردو اشعار لکھے[1] تو وہ اس میں موجود نہ ہوں گے۔ اسی طرح کئی فارسی خطوط اور شائد اشعار بھی ضائع ہوئے ہوں گے۔ مرزا ایک اُردو خط میں لکھتے ہیں۔ "پنج آہنگ نامکمل ہے۔ اور اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔"

[1] دیوان کے آخر میں نواب ضیاءالدین کی جو تقریظ ہے۔ اس میں دیوان کا سالِ ترتیب ۱۸۵۵ء دیا ہے۔ اور اشعار کی تعداد ۱۶۹۰۔ لیکن فی الواقع قلمی نسخہ رام پور میں اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور غالباً اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ ترتیب دیوان کے بعد مرزا نے جو اشعار لکھے۔ وہ قلمی نسخہ میں شامل کر لئے گئے۔ لیکن تقریظ کی عبارت نہ بدلی گئی۔

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل جائیں اسکے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

مجرم دلے ئرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ | عدل کا مجرم کا دشمن اور سری کا عدو خواہ
مجرموں کے جرم سر دیا اور در یتے سب گواہ | پر نہ تھا کوئی تمیع تم کا کہ جو تھے بے گناہ

ایسے نازک وقت میں مردانگی اس نے جو کی
اہل انصاف اس کو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی

مالیقیں جن ملزموں کو اس نے سمجھا بے خطا | مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اُن کا بریا | جو کہ تھے نادار کی اُن کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا لے گھروں کو گھر دیا

مرزا کے احباب

مرزا نے دستنبو میں اپنے دوسرے دوستوں کی سرگزشت لکھی ہے نواب ضیاء الدین اور نواب امین الدین جس ہفتے شہر فتح ہوا تھا اُسی ہفتے اہل و عیال اور چند آدمیوں کے ساتھ اپنی جاگیر لوہارو جانے کے لئے روانہ ہوئے لیکن ابھی مہرولی ہی تھے ۔ کہ لٹیرے سپاہیوں نے آگھیرا اور بدن پر جو کپڑے تھے اُن کے سوا سب کچھ لے گئے ۔ دہلی میں جواں کے گھر پر گذری وہ اس سے بڑھ کر تھی ۔

اسباب خانہ وکاشانہ وکلاہ وکلیم ہر چہ بود بتاراج رفت سرا ہمیشہ و دریہ نام
وانسان ماندہ نہ اگسترد نی د پوستیدنی ما بدانہ ُ ما سوے درمیاں ماند ۔

مظفر الدین حیدر خاں اور ذوالفقار الدین حیدر خاں (حسین مرزا) پر جو گذری وہ اس سے بھی بدتر تھی وہ شہر کے باقی معزز لوگوں کی طرح اپنے شاندار بیش قیمت مکان چھوڑ کر چل

رہنا اور رات کو اطمینان سے نہ سونا باقی ہے۔ اور اطمینان بھی کیسے ہوتا جبکہ مخبریوں اور گرفتاریں کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ چنانچہ دوم فروری کو حاکم شہر چند سپاہیوں کے ساتھ غالب کے محلہ میں آیا اور حکیم محمود خاں کو جن کی موجودگی سے غالب اور دوسرے لوگوں کو بڑا سہارا تھا۔ ساٹھ آدمیوں سمیت اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ غالباً زیرِ حراست رہے۔ لیکن بقول غالب آبرو والوں کی آبرو کا بھی خیال رکھا گیا۔ حکیم محمود خاں اور چند دوسرے معززین کو تو تین روز کے بعد واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ اور چند آدمی ایک ہفتہ کے بعد رہا ہوئے۔ لیکن نصف سے زیادہ لوگ وہیں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس زمانے میں غالب کی جائے پناہ حکیم محمود خاں کا دروازہ تھا۔ شہر کے اور کئی معززین نے بھی حکیم صاحب کے ہاں پناہ لی تھی۔ اور حاکم شہر کے پاس کسی نے ان لوگوں کے خلاف مخبری کی تھی۔ لیکن حکیم صاحب ان لوگوں کی بے گناہی کے قائل تھے اور مہاراجہ پٹیالہ سے تعلقات کی وجہ سے جو کچھ ان کا اثر تھا۔ وہ انہوں نے بے گناہوں کو بچانے کے لئے صرف کیا۔ چنانچہ اپریل ۱۸۵۸ء میں باقی لوگ بھی رہا ہوگئے حکیم محمود خاں کی یہی عالی ہمتی تھی۔ جس کے متعلق مولینا حالی نے مرثیۂ محمود خاں میں لکھا ہے ؎

وہ زمانہ جبکہ تھا دلی میں اک محشر بپا — نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا — باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موجزن تھا جبکہ دریائے عتابِ ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار — ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار — شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار

س کر یہ دیکھنے کہ کیا ہو رہا ہے گھر سے باہر آیا اور مارا گیا۔ لیکن مرزا کا بیان اس سے مختلف ہے وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹ر اکتوبر کو صبح کے وقت مرزا یوسف کا نوکر حاضر ہاں آیا اور خبر لایا کہ مرزا یوسف پانچ دن کے مسلسل بخار کے بعد رات کو گزر گیا مرزا کی حالت اس وقت قابل رحم تھی ایک تو بھائی کی موت کا صدمہ پھر میت کا انتظام بہت مشکل تھا نہ کفن کے لئے کپڑا نہ مردہ نہلانے کے لئے مردہ شو۔ اور نہ قبر کھودنے کے لئے گورکن اس کے علاوہ اگرچہ فتح دہلی کو ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ شہر میں دو تین آدمیوں کا دوش بدوش چلنا بھی ناممکن تھا شہر سے باہر میت لے جانے کی ہمت کسے پڑتی لیکن مرزا کے ہمسایوں نے مرزا کی بے کسی پر رحم کیا اور تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک آدمی آگے آگے چلا۔ مرزا کے دو نوکروں کو ساتھ لے کر میت کو نہلایا اور گھر سے جو دو تین چادریں لے گئے تھے ان میں لپیٹ کر قریب کی ایک مسجد میں مرزا یوسف کو دفن کیا دستنبو سے یہ امر واضح نہیں ہوتا۔ کہ بھائی کی تدفین کے وقت مرزا موجود تھے لیکن اگر وہ تھے بھی اور بمار جنازہ کا کسی طرح انتظام ہو گیا تب بھی مرزا یوسف کا انجام انکی زندگی سے کم حسرت ناک نہیں معلوم ہوتا ہے

دریغ آنکہ اندر درنگ سنہ میت ‫ ‫ سنہ دو تا دو سی سال ماساد زیست
نہ خاک مالیں زحسنش سود ‫ ‫ بحر خاک در سر دوستش سود
حدایا بریں مردہ بختا کشنے ‫ ‫ کہ نادیدہ در زیست آسائشے

حکیم محمود خاں معلوم ہوتا ہے فتح دہلی کے بعد جو افراتفری تھی وہ ایک دو مہینے میں ختم نہیں ہو گئی جنوری ۱۸۵۸ء میں ہندوؤں کی آبادی کا حکم ہو گیا تھا لیکن مرزا فروری ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں کہ ابھی تک وہی حالت ہے دل کو بے قرار

مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی۔ اُن کے ایک دوست اتفاق سے اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلوائی۔

مرزا یوسف کی وفات

مرزا تو سخت جاں تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں یہ مصیبتیں دیکھیں اور بچ نکلے۔ لیکن ان کے بھائی مرزا یوسف اس قدر خوش قسمت نہ تھے۔ ان کا تیس برس کی عمر سے دماغ خراب تھا۔ اور غالب کے مکان سے دور ایک علیحدہ مکان میں رہتے تھے۔ جس قدر موروثی پنشن مرزا کو سرکاری خزانے سے ملتی تھی۔ اسی قدر مرزا یوسف کو ملتی تھی۔ ان کی بیوی اور بچے بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ لیکن جب دہلی فتح ہوئی۔ تو قیامت کی طرح نفسی نفسی کا عالم تھا۔ ان کی بیوی اور بچے انہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ گھر پر ان کے پاس ایک بوڑھی نوکرانی اور ایک بوڑھا دربان رہ گئے۔ مرزا کو بھی اطلاع ملی۔ لیکن بے بس تھے۔ ایسی حالت میں کچھ نہ کر سکتے تھے:۔

"فرستادن و آں سہ تن و کالا را بدینجا آوردن اگر چہ دو دانستے نتوانستے"۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ بھائی کا فکر ان کے دل پر بھاری بوجھ تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"من ہمہ در بند آنم کہ برادر لتبب جوں خفت و برو ذرچہ خورد۔ و ناآگہی بداں پایہ کہ نمے توانم گفت کہ زندہ است یا بسختی مُرد"۔

۳۰ ستمبر کو جب انہیں اپنا دروازہ بند کئے ہوئے پندرہ سولہ دن ہو رہے تھے۔ انہیں اطلاع ملی۔ کہ فوجی مرزا یوسف کے گھر آئے۔ اور سب کچھ لے گئے۔ لیکن انہیں اور بوڑھے نوکروں کو زندہ چھوڑ گئے۔

نواب معین الدین جو مرزا کے قریبی رشتہ دار تھے۔ غدر کے حالات میں لکھتے ہیں کہ مرزا اسد اللہ خاں کا بھائی مرزا یوسف خاں جو عرصے سے مخبوط الحواس تھا۔ گولی کی آواز

گھڑا رکھ کر پانی جمع کیا اور اپنی پیاس بجھائی۔ مرزا لکھتے ہیں :-

"گو سدار یک قدح دریا بر دارند و بر دوش دہی فروبارند و ایں مارا مرگل مایہ بملا

آب از چشمۂ زندگی آورد ہمراہ پوسکندر دریا دستاہی جست ایں تلخ کام تسوار آشام

در تباہی یافت"

مرزا غالب سے مار پُرس معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں کی وجہ سے مرزا کا گھر توٹ سے محفوظ رہا لیکن جو زیورات اور قیمتی چیزیں مرزا کے گھر سے کالے شاہ صاحب کے تہ خانے میں گڑوادی گئی تھیں وہ فتح مند لوگ کھود نکالیں علاوہ ازیں دستنبو سے پتہ چلتا ہے کہ سپاہیوں کی روک ٹوک کے باوجود چند گورے ۵ / اکتوبر کو دیوار پھاند کر ان کے محلے میں آداخل ہوئے اور انھوں نے دوسرے چھوٹے چھوٹے گھروں کو چھوڑ کر مرزا کے گھر کا رخ کیا مرزا کا بیان ہے کہ انھوں نے مال اسباب کو نہیں اٹھایا البتہ مرزا، عارف کے دو بچوں اور چند ہمسایوں کو قطب الدین سوداگر کی حویلی میں کرنل براؤن کے سامنے لے گئے۔ جہاں چند سوال و جواب ہوئے اور مرزا کو اسی وقت گھر جانے کی اجازت مل گئی اس واقعہ کی نسبت مرزا نے تو بہت کچھ صراحتاً نہیں لکھا لیکن نواب غلام حسین خاں[1] نے غدر کے متعلق جو حالات لکھے ہیں اس میں مرزا کے متعلق ذیل کا اندراج ہے :-

"مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کر کے لے گئے اور کرنل براؤن صاحب کے سامنے لے جا کر ان کو پیش کیا"

[1] نواب غلام حسین خاں عارف کے والد اور مرزا کے ہم رکاب تھے۔

گریز نداشتیم دراز در دل بسنند و پیرامن آں سنگ بسنگ ہم پیوستند تا کوچہ چنانکہ سربستہ بود در بستہ نیز شد۔"

اس قید خانے سے باہر شہر کی جو حالت تھی اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"در ہمہ شہر از پانزدہم ستمبر ہر خانہ و ہر کلبہ را در فرازست۔ و فروشندگان و خرندگاں ناپیدا گندم فروش کجا۔ کہ دانہ خریدگار کو کہ جامہ بہر شستن بوے سپارند۔ گرا را کجا جویند کہ موئے سر سترد۔ پاکار را کجا یابند کہ پلیدی برد۔"

غالب اور اُن کے ساتھیوں کا باہر سے تعلق منقطع ہوا تو پانی وغیرہ کا سلسلہ بھی بالکل بند ہو گیا۔

"خوش و ناخوش از خورش ہر چہ لختے بود۔ خوردہ شد۔ و آب بداں کوشش کہ پنداری چاہ بناخن کندہ اند آشامیدہ آمد۔ دیگر در کوزہ و سبو آب و در مرد و زن تاب نماند۔۔ و دو شبانہ روز در تشنگی و گرسنگی گزشت؛"

جب دو دن اس طرح بے آب و ناں گزر گئے۔ تو تیسرے روز خوش قسمتی سے مہاراجہ پٹیالہ نے حکیم محمود خاں اور ان کے عزیزوں کے مکانوں کی حفاظت کے لئے جو سپاہی بھیجے تھے۔ وہ آ پہنچے لوگوں کو جان کا ڈر تھا۔ وہ کچھ کم ہوا۔ تو انہوں نے سپاہیوں سے پانی کے لئے استمداد کیا۔ چنانچہ انہیں بازار کے سرے تک جانے کی اجازت ملی۔ اور ہر گھر سے ایک ایک دو دو آدمی خُم و سبُو اُٹھائے پانی کی تلاش میں نکلے۔ لیکن میٹھے پانی کے کنُوئیں دُور تھے۔ اور وہاں تک جانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ناچار ایک نمکین کوئیں سے ہی پانی بھر لائے۔ اور اس سے پیاس کی آگ بُجھائی۔ لیکن نمکین پانی سے کہاں تسکین ہوتی ہے۔ لوگ نڈھال ہو رہے تھے۔ اور مرزا تسکین دیتے تھے۔ کہ جو ہمارا روزی رساں ہے۔ وہ ہمیں بھلائے گا نہیں۔ چنانچہ مرزا لکھتے ہیں کہ ان کی دُعائیں قبول ہوئیں۔ ایک روز بادل آئے اور خوب مینہ برسا۔ لوگوں نے چادر باندھی۔ اور اس کے نیچے

ویرانۂ لولیان شہر ہمہ آمایہ کہ در گردن و گوش زن و دختر سنگدست ہمہ درکیسۂ نسرواں
سیہ کار ماحوا مرد ست "

اس قتل و غارت کے بعد باغیوں نے قلعہ کا رُخ کیا اور مرزا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بہادر شاہ
کے اُس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ وہ غدر کے دوران میں مجبور تھا۔ اور سیاہ کا حاکم نہیں
ملکہ محکوم تھا مرزا لکھتے ہیں " چوں شاہ سیاہ را سواالست داند، سیاہ دود آمد شاہ فرو ماند "

شاہ را در میاں گرفت سیاہ وین گرفتن بود گرفتن ماہ
سیاہ ماہ گرفتہ را ماند ہر کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

دہلی سے انگریزوں کا انتظام اُٹھنے اور دوبارہ دہلی فتح ہونے تک جو حالات رُدیدیر
ہُوئے ان کی تفصیل نہایت مختصر ہے اور فقط پانچ چھ صفحوں میں اس چار مہینے چار دن کی
سرگذشت ختم کر دی ہے کتاب کا زیادہ حصہ ان تکالیف کا بیان ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا
اور ان کے عزیزوں کو پیش آئیں۔ اور جنہیں اُنھوں نے نہایت دردناک طریقے سے قلمبند کیا ہے[1]

فتح دہلی

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مرزا اس دن کی سرگذشت
لکھتے ہیں :-

کشورگیراں شہر را کہ سراسر گرفتند جو ملائے رو وگشت وگیرو دار تا مدین کوچہ پیر
رسید وہمہ را از بیم دل دو نیم شد باید دانست کہ این کوچہ تحریک راہ وبیش ازدہ دوازدہ
خانہ ندارد اندرجاہ درین کوے نیست۔ بیشتر ازین دو مرد مدین لودند کہ زن را بچہ در آغوش
است و مرد را لیستوارہ بردوش سلسلہ دعد ستے چیدکہ نہ ماندہ ہمہ ساے من کہ از شہر پدری

[1] ممکن ہے کہ مرزا نے ان ایام کے حالات بھی تفصیل سے لکھے ہوں لیکن فتح دہلی کے بعد انکی اشاعت
نامناسب خیال کی ہو۔

جابجا غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے پڑے ہیں۔ تاہم شاعرانہ رنگ آرائیوں سے مطلب خبط نہیں ہوتا +

واقعاتِ غدر | دستنبو میں بیشتر توان حادثات کی تفصیل ہے۔ جو مرزا پر گذرے لیکن اس کے علاوہ عام حالات کا تذکرہ بھی ہے۔ شروع میں ابتدائی عبارت اور اپنے تذکرہ کے بعد ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کے واقعات لکھے ہیں۔ جب میرٹھ سے باغی فوج دہلی آئی اور یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس میں موثر ترین حصہ انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل کے متعلق ہے۔ جس کا مرزا کو بے حد قلق تھا۔

"ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خونِ گُل اندامان ارغوان زار نشد و ہیچ کنج باغے نبود کہ از بے سرگی مانا بزجمۂ نوبہار نہ شد۔ ہائے آں جہانداران داد آموز دانش اندوز نکوخوے نکونام وآہ ازاں خانونانِ پری چہرۂ نازک اندام با رُخے چوں ماہ و تنے چوں سیم خام و دریغ آں کودکانِ جہاں نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل مے خندیدند۔ و در خوشخرامی بہ کبک و تذرو و آہو میگرفتند کہ ہمہ یکبار بہ گرداب خوں فرو رفتند۔"

مرزا کو انگریز بے گناہوں کے قتل کا ہمیشہ افسوس رہا۔ چنانچہ غدر سے کئی سال بعد ایک اُردو خط میں لکھا ہے :-

"انگریز قوم میں سے جو ان رُوسیاہ کالوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ ان میں کوئی میرا اُمیدگاہ تھا۔ اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔"

اس قتل عام کے بعد جو لوٹ مار روا ہوئی۔ اس کی تفصیل دی ہے :-

"خسانیکہ بہ وراز بہر فروختن خاک زمین می کافتند درخاک خردہ زریافتند و کسانیکہ بشب در بزم مے از آتش گل چراغ می افروختند در کلبۂ تاربداغ ناکامی سوختند۔ زیور

غدر

دستنبو غدر کے دوران میں غالب کے حالات زندگی تلاش کرنے کے لیے ہمیں ان کے خطوط اور قصائد میں بہت کرید کی ضرورت نہیں اس زمانے کے مفصل حالات اُن کی کتاب دستنبو میں درج ہیں سوانحی دلچسپی کے علاوہ اس کتاب کی تاریخی اہمیت بھی بہت ہے کیونکہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو شروع سے اخیر تک اس ہنگامے میں شریک رہا اور جس کی راست گوئی کے دوست دشمن سب معترف ہیں لیکن یہ خیال کہ اس کتاب میں تمام حالات صاف صاف اور آزادی سے لکھ دیے ہونگے صحیح نہیں مرزا خود ایک اُردو خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو جو کتاب کی اشاعت کے متعلق متامل تھے۔ لکھتے ہیں :-

> میں ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا۔ اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہو گی اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامقبول ہو گا۔

اس کتاب کی زبان مہر نیمروز سے نسبتاً صاف ہے۔ اور اگرچہ عربی الفاظ ترک کرنے سے

چنانچہ اس زمانے میں منشی ہیرا سنگھ کو لکھا تھا۔

"از شب عید خاقان رنجور است۔ حالا دیگر چہ رو نماید و من کہ در سایۂ دیوارش غنودہ ام چہ رود"

اب جو بہادر شاہ کی جانشینی کے متعلق آخری فیصلہ ہوا۔ تو انہوں نے سوچا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ تو ختم ہو جائیگا۔ اپنا مستقبل انگریزی حکام سے وابستہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے فرمانروائے انگلستان ملکہ وکٹوریا کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا۔ اس کے ساتھ ایک عرضداشت تھی۔ کہ روم و ایران کے بادشاہ شعرا پر بڑی بڑی عنائتیں کرتے ہیں اگر شہنشاہ انگلستان مجھے خطاب اور خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ تفصیلات مرزا کی اپنی زبان سے سنئے:۔

"درآں بوزش نامہ از آز و آرزو بدیں انداز نشاں دادہ آمد کہ خسروان روم و ایران و دیگر کشور گیراں را با سخن گستراں و ستائش گراں در بخشائش و بخشش رنگا رنگ شمار رفتہ و دہن بہ گہر انباشتن و پیکر (بہ) زر سختن و دہ دادن و گنج فشاندن بکار رفتہ ایں سخن گستر ستائش گر دیر خوانی از زبان شہنشاہ و سراپائے بعرمان شہنشاہ و مان ریزہ از خوان شہنشاہ میخواہد ہمانا پایگاں دہر خواں و سرا پا در تازی گفتار خطاب و خلعت و چم نان ریزہ در انگریزی زباں پنشن تواند بود"

غالب کو لندن سے اس خط کا جواب اخیر جنوری ۱۸۵۷ء میں مسٹر رسل سرک کی طرف سے ملا۔ کہ درخواست پر تحقیق کے بعد خطاب اور خلعت وغیرہ کے متعلق حکم صادر ہو گا۔ مرزا کے لئے یہ جواب بہت حوصلہ افزا تھا۔ اور وہ معلوم نہیں امیدوں کے کیسے کیسے قلعے باندھ رہے تھے۔ کہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو غدر ہو گیا +

ہو گئے۔ اور یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب ۱۸۴۳ء میں بہادر شاہ کے ایما پر مفتی میر لال نے صوفیانہ اشعال و اذکار کا مجموعہ تیار کیا تو اس کے شروع میں مرزا نے ایک دیباچہ لکھا جس کی نسبت حالی کہتا ہے "اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلےٰ خیالات ظاہر کئے ہیں اس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان میں تصوف کے اعلےٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے ۔"

مرزا بادشاہ کے اُستاد تو ہو گئے تھے۔ لیکن اب سلطنت کا ستارہ ہی گہنا رہا تھا۔ جب بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہُوا تو اس سے کہا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی یہ بادشاہ کے جو حقوق ہیں ان سے دستبردار ہو جاؤ۔ لیکن بہادر شاہ اپنی نے دست و پائی اور ضعیف العمری کے باوجود اپنے حقوق پر اصرار رہنے کا عادی تھا۔ وہ نہ مانا لیکن اب اس کا انجام قریب نظر آرہا تھا چنانچہ ۱۸۵۱ء میں فیصلہ ہُوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی خاندان کو قطب جانا ہوگا اس فیصلہ پر ریذیڈنٹ سے نواب زینت محل کی بڑی کھٹ پٹ ہُوئی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ برقرار رہا اور اس کے دو سال بعد جب مرزا قویش کا ولی عہدی پر تقرر ہُوا۔ تو طے پایا۔ کہ ایک تو بہادر شاہ کے جانشیں کو بہادر شاہ سے پنشن کم ملے گی۔ دوسرے اس کا خطاب بادشاہ نہیں بلکہ شاہزادہ ہوگا یعنی شاہی سلسلہ بہادر شاہ کی ذات کے ساتھ ختم ہو جائے گا +

فرمانروائے انگلستان کی مدح | مرزا حکم رس تھے اور ان باتوں سے بے خبر یا غافل نہ تھے ۱۸۵۳ء ہی میں جب بادشاہ بیمار ہُوا تو وہ اپنے مستقبل کی نسبت متردد تھے۔

ملہ غالباً اسی موقع پر ظفر نے لکھا تھا

اے ظفر اب ہے تجھی تک استظام سلطنت   بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

بھیج دیئے۔ تو (چونکہ ان کا اپنا مجموعہ نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی کی وجہ سے تلف ہو گیا تھا) ممکن تھا کہ جس طرح ذوقؔ اور آزادؔ اور میر درخشاں کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں جاتا رہا۔ دیوان غالب بھی اُسی آگ کی نذر ہو جاتا +

بہادر شاہ اور مرزا غالب

بادشاہ کے اشعار کی اصلاح مرزا نے دو تین سال کی ہوگی اس سلسلہ میں انہیں بادشاہ کی طرف سے ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی اور خطاب نہیں ملا۔ اور ممکن ہے کہ بادشاہ ان کے طرز شاعری کا بہت مداح نہ ہو۔ حالی نے بھی ناظر حسین مرزا کی شہادت سے آزادؔ کے اس نظریے کی تائید کی ہے کہ بادشاہ کے اُستاد کو ایک پھول اور ایک کلی سے پورا گلدستہ بنا کر دینا ہوتا تھا۔ ظفرؔ کی نسبت یہ بات بہت مشہور ہے۔ لیکن ظفر اور غالب کا کلام آج بھی موجود ہے۔ کلیاتِ ظفر میں غالب کے صحیح رنگ کی ایک غزل نہیں۔ اور جب ہم کلیاتِ ظفر کا عام معیار دیکھتے ہیں۔ تو یہ خیال کہ اس میں غالب کے نتائجِ فکر بھی شامل ہیں۔ غالب کی شاعرانہ شہرت کے لئے بہت مفید معلوم نہیں ہوتا +

مرزا، ملک الشعرا تو نہ ہوئے لیکن دبیر الملک وہ ایک عرصے سے تھے۔ اور اپنے زمانے کے بہترین انشا پرداز سمجھے جاتے تھے۔ انہیں کئی موقعوں پر فرمانروائے دہلی کی ترجمانی کرنی پڑی بہت ۱۸۵۳ء میں جب بہادر شاہ کے تبدیلِ مذہب کی شہرت ہوئی۔ تو اس نے مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی دمغ الباطل لکھوا کر، عام افواہوں کی تردید کی۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک کتاب "حقیقت مذہب اہلِ سنت والجماعت" پر تصنیف کی۔ جس پر مرزا نے زور شور سے تقریظ لکھی۔ اور "خاص و عام کو اعلیٰ حضرت کا ثباتِ قدم مسلکِ تسنن پر باور کرایا۔"

مرزا کو تصوف سے تھوڑی بہت دلچسپی تو فارسی شعر کے لگاؤ سے ہی پیدا ہو گئی تھی۔ اب

گزر رہی تھی۔ مالی حالت غدر سے بہتر تھی۔ قلعہ سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ شاہزادے دہلی میں کوئی نہ کوئی ہر ہفتے مشاعرہ منعقد کراتا۔ مرزا ان میں اردو غزلیں پڑھتے۔ اور چونکہ اس کا موجودہ رنگ مقبول عام تھا تعریفیں ہوتیں۔ ذوق سے بھی اب ان کے تعلقات نسبتاً خوشگوار تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ مجلس برہم ہونی شروع ہوئی۔ مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا اور اس کے دو سال بعد ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو ذوق بھی چل بسے[۱]۔ مشہور شعرا میں اس وقت غالب کے سوا کوئی نہ تھا چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح ان کے سپرد ہوئی۔ لیکن اس اعزاز سے اور بھی اہم واقعہ دربار رام پور سے تعلق تھا جس کا آغاز اس سے دو سال بعد ۱۸۵۷ء کے شروع میں ہوا۔ یہ تعلق مولوی فضل حق صاحب کی وساطت سے پیدا ہوا۔ جنہیں نواب یوسف علی خاں کی علم پروری رامپور کھینچ لے گئی تھی۔ ان کے ایما پر مرزا نے ایک فارسی خط نواب صاحب کی خدمت میں لکھا اور اس کے بعد اپنا دیوان اور ایک فارسی قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

ہمانا اگر گوہر حال فرستم   بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

نواب کی خدمت میں بھیجے۔ نواب صاحب اس سے پہلے دلی میں مرزا سے فارسی پڑھ چکے تھے۔ اب فن شعر میں بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ اور تاحیات ان کی مالی امداد کرتے رہے۔ اس ہنگامی مدد کے علاوہ اردوئے معلیٰ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اگر غدر کے بعد نواب مرزا کی دستگیری نہ کرتے تو جہاں استاد اور حالی لوگوں کی دریوزہ گری اور فاقہ کشی تک نوبت آئی تھی۔ وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا۔ اور اگر وہ غدر سے پہلے اپنا مسودہ دیوان رام پور نہ

[۱] مرزا نے تاریخ لکھی ؎

تاریخ وفات ذوق غالب   با خاطر مستمند و مایوس

حل شد دل زار ما و گفتم   خاقانیٔ ہند مرد افسوس

۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۴ء

مرحوم کے دو بیٹے تھے۔ حسین علی خاں اور باقر علی خاں۔ مرزا بیوی اور حسین علی خاں دونوں کو اپنے پاس لے آئے۔ اور انہیں اپنے بچوں کی طرح بڑے لاڈ پیار سے پالا۔

واجد علی شاہ کی مدح معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مرزا نے اودھ کے تین بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ انہیں مدح کا صلہ پہلی مرتبہ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کی طرف سے ملا۔ چنانچہ وہ مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

سہ شنبہ یازدہم ماہ صفر توقیع تمنا رنگانی و پنجشنبہ سیزدہم ماہ عطیۂ سلطانی تشریف ورود ارزانی داشت . . . چنیں ناخوش ہنگام کہ دیدہ بماتم مردم دیدہ سیاہ پوش و تحرارِ آشوب ستیز کفر و اسلام بر گردش باشد۔ صلہ بہ مردن و بدیں خوبی کہ در توسل امکان نگنجد۔ کار را سرہ کردن اگر معجزۂ امامت و نبرد سے ولایت نیست دگر چیست۔

اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں لیکن اس میں مہوہان گردشی کے واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ۱۸۵۲ء میں رونما ہوا۔ مجتہد العصر ہی کے ایما پر غالب نے اردو مرثیہ کے تین بند بھی لکھے تھے۔ غالب کے بڑے قدر دان اور مربی تھے۔ وہ غالب کے قصائد دربار میں پیش کرتے۔ اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ مرزا سے دمع الباطل کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا۔ تو انہوں نے مرزا کی وکالت کی۔ اور عتاب شاہی سے بچا لیا۔ غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اودھ سے پانسو سالیانہ بھی مقرر ہوا تھا۔ لیکن یہ بہت دیر تک ملنے نہیں پایا کہ اودھ کی سلطنت جاتی رہی۔ اور ۱۸۵۶ء میں اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کلکتے بطور اسیر سلطانی بھیج دیے گئے۔

بادشاہ اور فرمانروائے رامپور کی استادی ویسے مرزا کی زندگی اب نسبتاً آرام سے

اس پر اس کی پیارکی مثال صادق آتی ہے کہ چھلکے ہی چھلکے میں معرکا نام ہمیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ مہر نیمروز جو مغلیہ بادشاہوں کی تاریخ ہے اور جس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے کہ آخری مغلیہ بادشاہ کے زیر فرمان درباری مصنف نے لکھی بہت ہونی چاہیے کچھ بھی نہیں +

مومن کی وفات ۱۸۵۱ء میں یعنی جس سال مہر نیمروز مکمل ہوئی مومن کا انتقال ہوگیا مومن خود ایک بلند مرتبہ شاعر تھا اور مرزا کی طرح فارسی کا شائق مرزا کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا جس کا اظہار انھوں نے ایک فارسی رباعی میں بھی کیا ہے ؎

ستر طلعت کردنے دل خراشم ہمہ عمر — چوں ماہ سرخ ردیدہ یاسم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن — چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

عارف کی وفات لیکن اس سال کے جس سانحہ کا انہیں مرگِ مومن سے بھی زیادہ رنج ہوا وہ نواب زین العابدین عارف کی وفات تھی۔ جو اپریل ۱۸۵۲ء میں واقع ہوئی عارف غالب کی بیوی کے بھانجے تھے اور چھوٹی عمر ہی میں خوب شعر کہتے تھے مرزا کو وہ بہت عزیز تھے اور ان کی نسبت انھوں نے ایک فارسی قطعہ بھی لکھا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام — کہ زخش شمع دودماں مست
ہر نشاط نگارشش نامش — خامہ رقاص در بساں مست
آنکہ در بزم قرب و خلوت اُنس — غمگسار مراح داں مست
رود ماز کعبہ کامرانی من — راحت روح ناتواں مست

ان کے مرنے کا مرزا کو بہت افسوس ہوا جس کا اظہار انھوں نے ایک نہایت دردناک مرثیے میں کیا ہے ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تواں بخت کی ولیعہدی کے لئے کوشاں تھیں لیکن اس میں کامیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ اسکے علاوہ بادشاہ کی اپنی صحت بھی خراب تھی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۵۵ء ریذیڈنٹ دہلی نے رپورٹ بھیجی کہ بادشاہ بیمار اور زندگی سے بیزار ہے۔ امور کے لئے تقرر منظور ہونے کی ارادہ رکھتا ہے۔ غالبؔ غالب نے اسی موقع پر کہا تھا:

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

مہرِ نیمروز مہر نیمروز یعنی شاہانِ تیموریہ کی تاریخ کا پہلا حصہ مارچ ۱۸۵۲ء سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا اور ۱۸۵۵ء میں بادشاہ کے ایما سے مطبع فخر المطابع میں چھپ کر شائع ہُوا۔ لیکن دُوسرا حصہ لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی وجہ معلوم نہیں۔ کیونکہ بادشاہی سلسلہ پہلے حصے کی تکمیل کے پانچ چھ سال بعد تک قائم رہا۔ ممکن ہے کہ بادشاہ جو سادہ اور مؤثر طرزِ تحریر پسند کرتا تھا۔ اُسے مرزا کی پُر پیچ ترکیبیں اور استعاروں اور تشبیہوں کے انبار میں اصل مطلب خبط کر دینا ناپسند ہُوا ہو۔ اور اس نے اس کتاب کی تکمیل غیر ضروری سمجھی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کی فارسی نثر غلط ہندوستانی محاوروں سے پاک ہے۔ لیکن جہاں تک معنی کا تعلق ہے

(نوٹ متعلقہ صفحہ ۹)
بادشاہ نے (اوائل ۱۸۵۸ء) ایک فارسی مثنوی غالب سے لکھوا کر اپنے نام سے لکھنؤ اور دُوسری جگہوں میں شائع کروائی۔ اسکے دو دردناک اشعار یہ ہیں:

کار فرمائے بندہ دار نہ ایم   دبدبہ ما سند کہ شہریار نہ ایم
بہر من پایۂ سیاست نیست   شاہیٔ من بجز ریاست نیست

لہ پنج آہنگ ص ۲۳۷ خط بنام مولوی رجب علی خاں۔

کہ گفتار مرا پاسخ ساز دمن بسے مستی اس تہ جرعہ کہ فرو ریختہ خامہ من است ؎

ہر چند گفتار مجر نیست ہیچ سنگ میں لیت

سر بس مودیا مدم و قطع نظر از دلیل قطعی امتیاز شمر دم"

اس کے بعد بہادر شاہ سلامت سے اپنی ناکامیوں پر آنسو بہاتے ہیں۔

"آوازمن کہ مرا زیاں رند و سوختہ حریں آمریدہ مدہ تا آئین سیاگین خوش سلطان گرولائے کلاہ و کمرے و ساہرسنگ و ریا انگں ہیں لو مل آسا علم و نہرے گفتم درویش ناسم دار آزاد رہ سیرم دوق سمن کہ ابر اہل آمدہ بودم رسی کہ دمرادان فرصت کہ آئینہ ردو دل و صورت معنی نمودن سر کار نمایاں ناسب سرلشکری دوالشوری حدیثیت صوفی گری گفتار و سمن گستری نمودئے آر مگر یہ سمجھاں کردم سعیہ در محرشوکہ سراسامت رواں کردم قلم علم سدو بیر ہائے شکستہ آماللم یاحو بہ در گار دیدہ و سے سودیا لو دہ امن پیراحت ہماما تیر گئے رو رگار من ابدا ہ شکر مے کار من کس شناعت در جام کار اکنوں کند علاج و رحمت وگوش گمان گشت موی سپید است و نعوے پرار شرمگ دست طردہ امدا است و پائے مدرکاب اول ہمہ سودا کہ در سر بود حال کہ دی بوال خودری ہمی ماند و بس تا آنجام کاشتہ ام فرداچہ دروم ؟"

مرزا کا سہرا ذوق کے سہرے سے بہتر تھا لیکن ذوق اُستاد شاہ تھا اُسے ناراض کرنے سے بادشاہ ناراض ہوتا تھا جیسا کہ مرزا کو معذرت لکھنی پڑی ؎

اُستاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

بہادر شاہ کے آخری سال بھی بہت اطمینان کے نہ تھے[1] لواب دست محل ست شہزادہ

(1 اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

شہر یاری با جوانی خوشتر است — شہریار نوجواں آید ہمی

تیسرے قصیدے کے کئی شعر تغزل کے نقطۂ نظر سے بہت پُر لطف ہیں ۔

فریب پرسش پنہاں نگر کہ من ہمہ عمر — بدوق وصل ابد ساختم بہ ہجرانش

کسم بہ خود نہ پذیرفت و دہر بازم برد — چو نامہ کہ بود نا نوشتہ عنوانش

ازاں بہ گلشن گیتی نشاط مے ورزی — کہ بوئے زہر ہمی شنوی ز ریحانش

جواں بخت کی شادی

ویسے مرزا کی یہ خوش قسمتی عارضی تھی ۔ کیونکہ ولیعہد دو سال چل بسے ۔ اور اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے درباری تعلقات نے پھل لائے ۔ کیونکہ ایک تو مرزا کے اردو خطوط کا آغاز اسی زمانے سے ہوا[1] ۔ دوسرے ان تعلقات کی وجہ سے مرزا کو فارسی چھوڑ کر اُردو غزلیں لکھنی پڑیں ۔ لیکن ذوق سے معاصرانہ کشمکش بھی تھی ۔ اور دسمبر ۱۸۵۱ء ہی میں سہرے کا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ۔ آب حیات میں اس قصے کی تمام تفصیلات درج ہیں ۔ اور غالب نے انورالدولہ نواب سعدالدین خاں شفق کے نام ایک خط میں بھی اس کے متعلق ذکر کیا ہے ۔

"از دیر باز سرِ دستا سرائی اُردو ندارم ۔ ہمانا از رضا جوئی شہریار سلیمان پیشگاہ راست گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ ریختن و بیزہ بفرمان بانوی بلقیس پرستار است در ریختہ بدیں ردیف مار وادل آویختن مگر در مقطع غزل سر مستانہ ہوئے زدہ باشم آں یکے کہ گماں کمالے کہ نداشت داشت بینداشت کہ روئے سخن سوئے اوست ۔ در مقطع غزلیکہ سرود بہنجار ستیزہ گام زد و دانست

[1] مولانا حالی نے 'یادگار غالب' میں لکھا ہے ۔ کہ مرزا کو اُردو خط و کتابت ۱۸۵۰ء میں شروع کرنی پڑی ۔ جب وہ ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے ۔ غالب کے اپنے خطوط سے اس کی تائید ہوتی ہے +

باب ششم

لال قلعہ

ولی عہد کی اُستادی

۱۸۵۰ء میں مرزا بادشاہ کے درباری مورخ مقرر ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک نے ان کی شاگردی اختیار کی اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ ولی عہد نے غالب کے قدیم دشمن نواب شمس الدین کی بیوہ سے شادی کی تھی[1] اور ظاہر ہے کہ مرزا کی ادبی شہرت بہت مستحکم ہو گئی ہو گی۔ چونکہ ولیعہد نے تمام پچھلے واقعات سے چشم پوشی کر کے مرزا کو اپنا اُستاد چنا۔ ولیعہد کی تعریف میں مرزا نے چند قطعات اور تین بلند پایہ فارسی قصائد لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک کی تشبیب میں روز ازل کی دلچسپ روداد لکھی ہے۔ دوسرا قصیدہ رودکی کے قصیدے کی بحر میں ہے ؎

داور سلطاں نشاں آید ہمی — سرورِ گیتی ستاں آید ہمی
شہریاراں نکتہ داناں بودہ اند — شہریار نکتہ داں آید ہمی

[1] ملاحظہ ہو کمال داغ ص ۴۶

مرزا کو بلا کر یہ کام اُن کے سپرد کر دیا۔ مرزا مہر نیمروز میں لکھتے ہیں :-

"اگر در سرِ ع رو الودے گفتے۔ کہ شاہ سکندر است و حکیم ارسطو ہما نا بلند نامی سلطان بر در آفاق چشم داشت۔ کہ چوں مے راکہ بہ جادو بیانی شہرۂ آفاق قم بکر دار گذاری گماشت مس حوداراں رو کہ دل در ماں ایں بیدار مغز آئینہ دار دل و زبانِ شاہ است دانم کہ آنچہ عُمدۃ الحکما دریں باب بمن فرمودہ فرمانِ شاہ است"۔

چنانچہ بادشاہ نے حکیم صاحب کی تجویز پر صاد کیا۔ اور ۴ر جولائی سنہ ۱۸۵۰ء کو مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے سرفراز ہوئے اور چھ سو روپیہ سالیانہ پر شاہانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے +

آگرہ کا ایک اخبار (اسعد الاخبار) ۱۵ر جولائی سنہ ۱۸۵۰ء کی اشاعت میں یہ خبر اس طرح لکھتا ہے

"اِن دِنوں شاہِ دین پناہ نے جناب معلے القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ شرطِ عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتابِ تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنتِ حال تک ہو مامور کیا۔ اور اسکے کا بیوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپے مشاہرہ مقرر کر کے آمدۂ الوارع بر و رش کا مندرج کیا۔ اور "نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ" خطاب دیکر چھ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقیں ہے۔ کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متین عبارت میں لکھی جائے گی۔ کہ ہر ایک اسکے لطفِ عبارت سے فیض یاب ہوگا"۔

اُردو دیوان مطبوعہ ۱۲۶۱ھ؁ء میں دو رباعیاں اور ایک غزل ہے ان میں بھی ملنا بہادر شاہ کی طرف اشارہ ہے۔

دربار میں مرزا کے بار یاب ہونے کی صحیح تاریخ لکھنا تو مشکل ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ باریابی بہادر شاہ کے مُرشد شاہ نصیر الدین عرف کالے شاہ صاحب کی وساطت سے ہُوئی۔ چنانچہ مرزا مہر نیمروز کے آغاز میں لکھتے ہیں:۔

"پس از پنجاہ سالہ آوارگی کہ تیزی رفتار من از مسجد و بتخانہ گرد انگیخت ۔ و ماہتاب و مکش را سنگ گرد، نوروع اراں سرۂ اندری کہ فریدوں را العرباب داوگری دل بادوجہت ہمراد و سنگ سمی گستری بموجب بداں در فرودم آورد کہ تو بیر چوں حلقہ پیشے بداں در درداری و تو انی کہ دیدہ بر دری دیوار کارج والا پایۂ ہماسایۂ سدا مردل دیدہ وز قدسی سرشت گوہر جادہ شناسی راہ سیر و سلوک در راہ نما ئے جادۂ فقر و فنا متاہد تسہود و شاہد قصص مولیا محمد نصیر الدین نام کہ ہرکہ بسایۂ آں دلو اہماں اتادگام زند نشگفت کہ سایۂ خویش در فردوس انگند۔ بحسب آیۂ رحمت کہ بر من از ملا فرود آمد رودادں گستگی رہیں نوس گیہاں خدیو مداداں بود دولت روسے آورد بخت از خواب جست"۔

شاہی مُلازمت حضرت کالے شاہ کی کوشش سے اتنا ہوا کہ مرزا دربار میں باریاب اور بہادر شاہ کے مُرید ہو گئے وہ دربار میں حاضر ہوتے قصاید اور نظمیں پڑھتے اور انعام اور خلعت پاتے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہیں بادشاہی سے کوئی مستقل تعلق نہ تھا۔ اور پیٹ کا دھندا ابھی باقی تھا۔ یہ تعلق بادشاہ کے مدار المہام احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی مہربانی سے ہُوا احترام الدولہ مرزا کی فارسی نثر کے بڑے مداح تھے چنانچہ جب بہادر شاہ کو شاہانِ تیموری کی تاریخ لکھوانے کا خیال ہُوا تو انہوں نے

نے ہر کہ باغ ساخت برضواں برابر است   نے ہر کہ گنج یافت ز پرویز گوئے بُرد

اخیر میں اپنی محرومیٔ قسمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور بادشاہ سے عفو تقصیر کی درخواست کی ہے ؎

باآنکہ بر سر بہر شہ افشاندہ ام ز کلک   این نکتہ ہا کہ با دُر و مرجاں برابر است

اینک مرا ز خجلتِ گفتارِ نارسا   جوشِ عرق بموجۂ طوفاں برابر است

پوزش پذیر و مکرمت انگار کز توام   خود یک نگہ بہ لُطفِ نمایاں برابر است

آرے قبول عذرِ گُنہ از گُناہ گار   باصد ہزار بخشش و احساں برابر است

کلامِ غالب کے مختلف معاصرانہ نسخوں سے اور ان سطور سے جو مرزا نے مہرِ نیمروز کے شروع میں لکھی ہیں خیال ہوتا کہ مرزا دربار میں پہلی دفعہ قید کے بعد باریاب ہوئے۔ لیکن یادگارِ غالب اور کلامِ غالب کے معاصرانہ قلمی نسخوں سے اس امر کا بھی بدیہی ثبوت ملتا ہے۔ کہ باریابی سے پہلے ہی مرزا اور بادشاہ کے تعلقات سُدھر چکے تھے۔ مرزا غالب کا جو اردو دیوان مئی ۱۸۴۷ء میں یعنی قید کے واقعہ سے پہلے مطبع دارالسلام سے شائع ہُوا ہے اُس میں غالب کا وہ قطعہ موجود ہے۔ جس میں بادشاہ کی طرف سے بیسنی روٹی پانے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اسی طرح ۱۸۴۵ء میں مرزا کا جو فارسی دیوان شائع ہُوا۔ اس میں غالب کی فارسی مثنوی "سرمۂ بینش" جس میں بہادر شاہ کی بیان کی ہُوئی ایک تمثیل کی شرح کی ہے۔ اور وہ مرثیہ جو انہوں نے شہزادہ فرخندہ شاہ کی وفات پر لکھا۔ دونوں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بانکی پور لائبریری میں ۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) کا نقل کیا ہُوا جو دیوانِ غالب محفوظ ہے۔ اس میں مرزا کی پانچ فارسی رباعیاں ہیں جو بادشاہ کے خواب کے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ رباعیاں ۱۸۴۱ء سے پہلے لکھی گئیں۔ کلیاتِ نثر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مرزا نے ان میں سے چار رباعیاں نواب مبارز الدولہ مرزا حسام الدین حیدر خاں کو بھیجیں۔ تاکہ وہ انہیں ظفر الدولہ کی وساطت سے حضور شاہ میں (اپنے نام سے ؟) پیش کریں۔ ان کے علاوہ

ساہ میداند کہ من مدّاح تسا ہم پاک نیست
گر تواند لیتی کہ اس دستاں وہیرنگ من باسے

لیکن مرزا ان کوششوں کے باوجود بار یاب نہ ہوسکے ۔ اور ۱۸۴۵ء کے بعد بھی انہیں ایک قصیدے میں عفو تقصیر کی درخواست کرنی پڑی ۔ اس پُر درد قصیدے کا مطلع ہے ؎

گفتم حدیث دوست بہ قرآں برابر است
مادم بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر است

اس کے کئی شعر مرزا کی اپنی حالت کا بیان معلوم ہوتے ہیں ؎

گو چرخ دشمنی مکن و بخت سرکشی — خود خواہش محال بہ حرماں برابر است
ما چارہ گر بگوئے کہ تیمار ریش کش — درد نیست در دلم کہ بہ درماں برابر است
در موج خوں کہ می گذرد و مسام پر سر — دستار من بہ لالہ نعماں برابر است
کلبہائے آتشکدہ کہ سر جوش مادرست — در ذوق مال وارث بیہاں برابر است
بے وعدۂ بہ پرسش را رسے بہ تسکوۂ — دائم بر نامہ کہ بہ عنواں برابر است
بے کف گرفتہ ساعد وسلِیلے بودہ ام — در ما حتی وصال بہ ہجراں برابر است

پیوستہ پر فساں و بہ حسرت بہ آشیاں
پرواز من بہ جنبش مژگاں برابر است

اس قصیدے میں غالباً ذوق کی طرف اشارہ ہے ؎

مالد کوش خواجہ جو گوئی سخنورس — غافل کہ ایں ترانہ بہ بہتاں برابر است
بے ہر ترانہ سنج نکیسا نوا بود — بے ہر کس سرائے بہ سحباں برابر است
بے ہر شتر سوار بہ صارم بود ہمال — بے ہر شبل موسی عمراں برابر است

اس قصیدے میں دربار سے دُور رہنے کی نسبت اشارہ ہے ؂

شہنشہا زغمِ دُوریٔ درت کارم — بداں رسیدہ کہ بے مرگ جاں دہم ناگاہ

بہارگہ نہ رسم، خانہ، بسپہر خراب — ندیم شاہ نشوم رُوسے روزگار سیاہ

چہ سرکنم روشِ مدح گستری چو مرا — ببزمِ خسروِ گیتی ستاں نباشد راہ

یہ قصیدہ ۱۸۴۱ء سے پہلے لکھا گیا۔ لیکن اس سے عتابِ شاہی دُور نہ ہُوا۔ اور مرزا نے معذرت کے انداز میں ایک اور قصیدہ لکھا۔ جو ۱۸۴۱ء کے بعد اور ۱۸۴۵ء سے پہلے تصنیف ہُوا ؂

ردیفِ شعرازاں کردم اختیار گرہ

کہ از منتِ سرابروئے شہریار گرہ

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ذوق اور اس کے معاونین مرزا کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے اور اس کے قلیل الحجم اُردو دیوان کا بادشاہ کے سامنے تمسخر اڑاتے تھے۔ چنانچہ مرزا نے اسی زمانے میں (۱۸۴۵ء سے پہلے) ایک قطعہ میں ذوق سے خطاب کیا تھا ؂

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتہ — کے بہ بُرگوئی فلاں درشعر ہمسنگِ من است

نیست نقصاں یک دو جزو است از سوادِ ریختہ — کاں وزرم برگے زنخلستانِ فرہنگِ من است

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے زنگار رنگ — بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال — مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارژنگِ من است

کے درخشد جوہرِ آئینہ تا باقی است زنگ — صیقلی آئینہ ام ایں جوہرآں زنگ من است

شاید مرزا کے مخالفین بادشاہ کے دل میں مرزا کی وفاداری اور دلی عقیدت کی نسبت بھی شبہے ڈالتے تھے۔ چنانچہ مرزا اسی قطعہ میں کہتے ہیں ؂

حصۂ اصحاب میں نقل کیا ہے اس ترکیب سد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مصیبت کے وقت نواب مصطفےٰ خاں نے ان کی بڑی مدد کی۔ اور مرزا نے نواب صاحب کی تعریف میں جو ربست فارسی قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے ؎

ستودہ اے آنکہ یاد آں را رسد ناله گر دہ کج رمداں مے رمم
سگر دے آنکہ کلک آں دکشد نقش گر بر صفحۂ جاں مے رمم

دربار میں باریابی

مولینا حالی کا بیان ہے کہ مرزا کو قید کی پوری میعاد بھگتنی نہیں پڑی۔ اور دو تین مہینے کے بعد ہی رہا ہو گئے دہلی کے بعدہ بہادر شاہ کے مرشد کالے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے اور انہی کی سفارش سے دربار میں باریاب ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ باریابی سے پہلے وہ بہت سے قصیدے کسی کی معرفت دربار میں پیش کر چکے تھے اور وہاں سے انہیں تحفے تحائف بھی ملتے تھے لیکن ابھی باریابی کی نوبت نہ آئی تھی۔ چنانچہ وہ ایک فارسی قصیدے میں لکھتے ہیں ؎

خواہیم قرب شاہ ولیکن دریں مراد
عرب رسا مرادے تسخر گرفتہ ام

بہادر شاہ کی تعریف میں مرزا کا سب سے پہلا قصیدہ یہی ہے اور بادشاہ کی تخت نشینی کے سال میں لکھا گیا یہ قصیدہ غالب کے دیوان فارسی مطبوعہ ۱۸۳۸ء ۱۲۵۴ھ میں موجود ہے۔ اس تعیذ سے بادشاہ کی تنگی دور نہ ہوئی اور مرزا کو کئی معذرت آمیز قصیدے لکھنے پڑے مثلاً قصیدہ پاسدہم جس کا مطلع ہے ؎

ہے رخویش نشاں کمال صبح اله
سراج دیں سی ٔ ابو ظفر بہادر شاہ

حکم صادر کر دیا۔ مسٹن بہ باوجود یکہ مرا دوست تھا۔ اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا۔ مگر کسی نے نہ سنا۔ اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا بات ہوا۔ کہ جب آدھی میعاد گذر گئی۔ تو مجسٹریٹ کو رحم آیا۔ اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی۔ اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا۔ اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی تعریف کی سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی۔ اور میری خاکساری اور آزردہ روی سے اس کو مطلع کیا ؎

غالب ایک تو اس زمانے میں بیمار اور کمزور تھے۔ دوسرے ایک معزز اور خاندانی آدمی کے لئے اس طرح جیل میں جانا انتہائی توہین اور بے آبروئی تھی۔ ان پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ مولوی کریم الدین تذکرۃ الشعرا میں لکھتے ہیں ” ان دنوں سرکار کی طرف سے ان پر ایک بڑا حادثہ گذرا ہے۔ جس کے سبب سے انہیں رنج لاحق ہے “

اس واقعہ نے مرزا کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ابھی تک انہوں نے جاگیرداری اور نوابی کے رکھ رکھاؤ کو قائم رکھا تھا۔ شاید یہ امید تھی۔ کہ انگریز اور ہندوستانی دوستوں کی مدد سے کسی ریاست میں کوئی معزز جگہ مل جائے۔ لیکن قید کی ذلت و رسوائی نے یہ سارا طلسم درہم برہم کر دیا۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

” سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں۔ اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا۔ مگر ہاں، اُستاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کر دوں “

قید کے زمانے میں انہوں نے ایک ترکیب بند لکھا تھا۔ جسے ہم نے تمام کا تمام

کہتے ہیں :-

"مرزا نوشہ، شاعر دہلی، رند مشرب المطلق بہ اسد و غالب سے بعض الحس خان کوتوال دہلی کو باہم عداوت پیدا ہوگئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرادیا۔ سودت گرفتاری کوتوال صاحب بالائے مکان بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سوار ملن رسالی آئی ہیں اس دھوکے سے اندر داخل ہوگئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم المتعدد ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی مگر سپاہیوں کے اندر بہت جمعیت تھی اور کچھ امدادی برقندار پہنچ گئے مگر سب کو گرفتار کرکے قید کر دیا بہت سے رئیس و شرفا اس حرکت سے ناراض تھے اور عدالت میں برأت کے مساعی ہوئے مگر قید ہوگئی"

ایک روز مسٹر لماس صاحب سول سرجن دہلی قیدیاں جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا آپ نے فی البدیہہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اُسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرادیا۔ (کلام عاصی ص ۲۶۳)

سید ناصر مدیر فراق اور عاصی نے مرزا غالب کی قید اور وقت رہائی کی جو وجوہات بتائی ہیں ان میں تطابق نہیں لیکن مرزا غالب نے جو وجہ بیان کی ہے وہ ان دونوں سے مختلف ہے حالی نے مرزا کے ایک فارسی خط کا ترجمہ کیا ہے :

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا

۱؎ ہم مولوی امتیاز علی عرشی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمیں عاصی کے اندراج سے مطلع کیا۔ اور پھر ہماری درخواست پر اسے نقل کرکے ہمیں ارسال کیا

کے علاوہ انگریزی میں۔ ویسے زیادہ اداس تھے نہیں۔ تو حقیقت میں یہ ہو سکتی ہے جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب [illegible] سے ملنے جلتے تھے [illegible] تیزی سے اور کوئی [illegible] نہیں ہوتے۔ تو کہا جاتا ہے کہ [illegible] عیب [illegible] برداشت کا [illegible] ہے۔ [illegible] امید کی جاتی ہے کہ [illegible] صاحب [illegible] کی عدالت میں [illegible] اور [illegible] ہو۔ [illegible] صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت [illegible] سے مقدمہ اٹھا لیا جائے یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے [illegible] جن کی عزت و حرمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی سے جرم میں ایسی سخت سزا دی جائے جس سے ان کی جان جانے کا قوی احتمال ہے۔"

حال ہی میں سید ناصر نذیر فراق نے لال قلعہ کی ایک شاہزادی کی زبانی "قلعہ اور شہر دہلی کے بعض واقعات جمع کئے ہیں۔ ان میں غالب کے مقدمہ کا بھی ذکر ہے۔ ان کے مطابق مرزا کا مقدمہ کنور وزیر علی خان کی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ اور قتل از وقت رہائی لاٹ صاحب (مسٹر جیمس ٹامسن ؟؟) یا کسی اور بڑے افسر کے اختیارات خاص کی وجہ سے ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی گرفتاری اور قید سے اچھی خاصی سنسنی پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ احسن الاخبار کے علاوہ معاصرانہ تصانیف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ نصیر کے ایک شاگرد منشی گنیش داس عاصی دہلوی کا دیوان کا نسخہ اردو سبھا دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں تاریخ گرفتاری مرزا غالب کے عنوان کے ماتحت کچھ نثر اور ایک قطعۂ تاریخ درج ہے۔ شاید عاصی غالب کا دل سے قدردان اور بہی خواہ نہ تھا۔ چنانچہ جو قطعہ تاریخ اس نے لکھا ہے۔ اس سے غالب کی صریح توہین ہوتی ہے۔ لیکن نثر کے اندراج سے گرفتاری کے واقعہ پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے ہم اسے نقل

سرمے کہ دروے بود احتساب　　ردود و سرود و شراب و کباب

سحور چہ گفتار پیش آمدد　　گراں رنگ ہر رئے خویش آمدد

دریں بزم او ماش را بار نیست　　مے و ساغر و زمزمہ و تار مست

قید | بہت ممکن ہے کہ مثنوی کے نامکمل رہنے کی ایک وجہ مضموں کی مشکلات ہوں ویسے اس زمانے میں چوسر کے ساتھ کچھ بدکر کھیلنے کی بدولت اُن پر ایک حادثہ بھی ایسا گذرا تھا جس کی وجہ سے ان کے کئی ارادے نامکمل رہ گئے ہوں گے ۱۸۴۷ء میں چوسر کی وجہ سے مجسٹریٹ دہلی کی عدالت میں ان پر فوجداری مقدمہ چلایا گیا اس کی تفصیلات عملی کے حسن اللہ ساے مورخہ ۲۵ جون ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھیں ۔ اور چونکہ اس سے زیادہ مکمل اس واقعہ کی تفصیلات اور کہیں نہیں ملتیں ہم متعلقہ اندراج تمام کا تمام درج ذیل کرتے ہیں ۔

دہلی ۵ ار جمادی الثانی مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا معلم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی ۔ کل کو رہا کر دیا جاوے یہ معززین شہر میں سے ہیں ۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر کے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا ۔

بادشاہ کی سفارش کارگر نہ ہوئی اور مرزا کو جرمانے اور قید کی سزا ہو گئی چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت مورخہ دوم جولائی ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے ۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ جاری تھا اس کا فیصلہ سُنا دیا گیا ۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی ۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ نہ ادا کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانے

لیکن انہیں یہ ارادہ پورا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور وہ حمد و نعت و منقبت اور ابتدائی ساقی نامے سے زیادہ نہیں لکھ سکے۔ نعت کا حصہ صاف اور موثر زبان میں ہے۔ اور اس میں چند نئے مضامین بھی پیدا کئے ہیں مثلاً

نہ دیگر در کہ باشد سبیل
ادا کرد وام زمان جمیل

یا معراج کے متعلق لکھا ہے ؎

بدور تو شد لن ترانی کہن | فصاحت مکرر نگنجد سخن
ترا خواستگار است یزدان پاک | ہر آئینہ ازلن ترانی چہ باک

ساقی نامہ میں انہوں نے بچارے نظامی کا مذاق اڑایا ہے۔ اور ساقی سے خطاب کیا ہے ؎

بیا ساقی آئین جم تازہ کن | طراز بساط کرم تازہ کن
مبادا نظامی زراہت برد | بدستاں سوئے خانقاہت برد
فریبش مخور چوں مے آشنام نیست | ستمدیدۂ گردش جام نیست
ورع پیشہ مسکین چہ داند ترا | بہ آرائش نامہ خواند ترا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ساقی نامہ بہت پھیکا ہے۔ اور مناجات اور معراج کے آخری حصے میں جو شاعری کا بلند معیار انہوں نے قائم کیا ہے۔ اسے وہ بالعموم نباہ نہیں سکے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نفس مضمون میں چند ایسی اصولی مشکلات تھیں۔ جن کی وجہ سے انہیں شاعرانہ شوخی اور مبالغے کی گنجائش نہ تھی۔ یہ تمام نظم مرزا نے رک رک کر لکھی ہے۔ اور خود اس مثنوی کے آخری حصے میں اپنی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔

دریں رہ بسیچ سفر ہا بسیت | بود راست لیکن خطر ہا بسیت

خلاف لڑائی میں تحریک ہوتا ہے ؎

گر ہجا شیوۂ من نیست راست میگویم | دریں رسالہ مرا بعدے اور مال تساب
پئے شکستن گفتار سستی نہ سرد | کمر بہ سرحوتی نیست تعقول تواب

لیکن پنجاب کا اس دانا اہیں جس چیز کے لئے عزیز ہے وہ کشمیر کی ترلپ ہے

کنوں کہ ملک معلیت شد ابے حس وخار | رسن بگو بعر وتسد گاہ مادۂ ناب
ترلپ قیدی ہندوستاں ماتم سوختا | رتیرہ حالہ کشمیر م آور سد تراب

ابرِ گہربار

ادبی نقطۂ نظر سے اس رسالے کی اہم ترین تصنیف ان کی فارسی مثنوی ابرِ گہربار ہے حالی کے خیال میں یہ ان کی آخری عمر کی تصنیف ہے لیکن جب ۱۸۴۷ء میں سرسید احمد خان نے آثار الصنادید لکھی۔ تو اس وقت یہ مثنوی ۱۵-۱۶ جزو کے قریب ہو چکی تھی۔ اور اس سے زیادہ اب بھی نہیں ملتی اس کے علاوہ اس مثنوی کے کئی اشعار مہر نیمروز میں درج ہیں جو مارچ ۱۸۵۲ء سے پہلے کی تصنیف ہے۔

حقیقت میں مرزا کا ارادہ حفیظ جالندھری کی طرح شاہنامہ کا جواب لکھنے کا تھا۔ انکی خواہش تھی کہ جس طرح فردوسی نے رستم کی لڑائیوں کی داستان لکھی ہے اسی طرح وہ ائمۂ اسلام کے جنگوں کو مثنوی کی صورت میں بیان کریں۔ چنانچہ وہ شروع میں لکھتے ہیں ؎

ز فردوسیم نکتہ انگیز تر | دم از سحر تواں سحر خیز تر
خرد پرور دل شمع ساسانیاں | بود صبح اقبال ایمانیاں
رقم سنج منشور یزدانیم | ز ایمانیاں گو کم ایمانیم!
کسے را کہ باد در نسبت نگاں | خرد در شمارد ز دیوانگاں
باقبال ایمان پیروئے دیں | سخن راکم از سید المرسلیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

اس کے علاوہ مرزا نے مختلف موقعوں پر فارسی قصائد اور قطعات بھی بکثرت لکھے ہیں جب مسٹر جیمز طامسن جنہوں نے مرزا کی جاگیر کا سوال نئے سرے سے اُٹھانا چاہا تھا۔ آگرہ کے گورنر ہوئے۔ تو مرزا نے اس موقعے پر دس شعر کا ایک نفیس قطعہ لکھا تھا۔ جس کا پہلا شعر ہے ؎

ہوا عبیر فشان است و ابر گوہر بار
جلوسِ گل بسریر چمن مُبارک باد

عموماً یہ قطعات مدحیہ ہوتے تھے۔ اور اکثر کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے جاتے۔ لیکن ۱۸۴۶ء میں جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب فتح کیا۔ تو مرزا نے اکیس شعر کا ایک فارسی قطعہ لکھا۔ جو نہ کسی کی تعریف میں ہے اور نہ غالباً کسی کو بھیجا ہی گیا۔ اس میں سکھ فوج کے خلاف بُری طرح زہر اُگلا ہے۔ اس زمانے کی تاریخی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چند احکام کے خلاف مولینا سید احمدؒ بریلوی نے جہاد کا اعلان کیا۔ تو دہلی میں بہت سے لوگ ان کے ہم خیال تھے۔ مہاراجہ کے فرانسیسی جرنیلوں کے خلاف تو مولینا اپنے ساتھیوں کے نفاق کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن جب ۱۸۴۶ء میں خالصہ افواج کو انگریزوں نے شکست دی۔ تو دہلی کے مسلمان بہت خوش تھے۔ چنانچہ مرزا نے بھی یہ قطعہ لکھ کر دل کا غبار نکالا۔ انہوں نے اس موقعہ پر جو ترکیب قصیدہ لارڈ ہارڈنگ کی تعریف میں لکھا ہے۔ وہ بھی بہت پُر لطف ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر میں جوان ہوتا تو "حصولِ ثواب" کی "نیت" سے حکومتِ پنجاب کے

کہ پڑھوں یا نہ۔ کہ اتنے میں مولانا صدر الدین آزردہ جو کہ وہیں آئے تھے آ پہنچے چنانچہ
مرزا ایک خط میں نواب مصطفیٰ خاں کو جنہیں وہ مشاعروں کے حالات میرٹھ لکھا کرتے تھے
لکھتے ہیں ۔

"سرہ راہ در میں گزیستم نگارش قصیدہ تعلق افتادہ بود آں می سنجیدم کہ ایں ورق را
چگونہ تا مقبول یاران رم و دریچہ گویاں را دردسر بدہم کہ ناگاہ حضرت آزردہ دل بجود
مالید و در مرمرہ دستوری یافت"

چنانچہ وہ قصیدہ مشاعرے میں پڑھا گیا اور جیسا کہ یادگارِ غالب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے
بہت پسند ہوا +

مرزا نے عرصے سے اُردو شاعری قریب قریب ترک کر رکھی تھی اور ۱۸۴۳ء کے ان
مشاعروں میں جن میں اور شعرا نے اُردو غزلیں پڑھیں مرزا نے فارسی اشعار ہی پڑھے
لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں گاہے گاہے انہوں نے اُردو غزلیں لکھنا شروع کر دی
تھیں چنانچہ جب نواب اصغر علی خاں نسیم نے اس سال مشاعرہ منعقد کیا اور ذوق
مومن اور غالب کو دعوت دی تو مرزا نے اُردو غزل ہی پڑھی ؎

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے   رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

اس زمانے میں انہیں نواب تجمل حسین خاں رئیس فرخ آباد کی دعوت آئی ہوئی تھی مرزا نے
گلے ہاتھوں غزل میں ان کی بھی تعریف کر دی ؎

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

اسی طرح اس زمانے میں ایک اور عظیم الشان اُردو مشاعرہ ہوا جس میں ذوق اور مومن نے
طرحی غزلیں پڑھیں۔ مرزا نے بھی دو غزلہ کہا ؎

تھے لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین کرتے ان میں نواب ضیاء الدین مرزا کو اکثر کھینچ لے جاتے۔ مرزا نے ان مشاعروں میں کئی غزلیں پڑھیں۔ جن میں سے چند اشعار ہم انتخاب کرتے ہیں ؎

هر چه فلک نخواست همچکس از فلک نخواست | طرف نغمه می نجست بادهٔ ما گزک نخواست
غرقه بموجه تاب خورد تشنه ز دجله آب خورد | رهروی هیچ یک نداد راحت هیچ یک نخواست
جاه ز علم بی خبر علم ز جاه بی نیاز | هم محک تو زر ندید هم زر من محک نخواست
شحنهٔ دهر برملا هر چه گرفت بس نداد | کاتب بخت در خفا هر چه نوشت حک نخواست
بحث و جدل بجای مان میکده جوی کاندران | کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست
گشته در انتظار پور دیدهٔ پیر ره سفید | در روش همرهی دیده زمردمک نخواست

سهل شمرده سرسری تا نوز عجز نشمری
غالب اگر بداوری داد خود از فلک نخواست

اس مشاعرے میں جو طرحی غزل انہوں نے پڑھی اس کے دو شعر بہت پرلطف ہیں ؎

چه عیش از وعده چون باور ز عنوانم نمی آید | به نوعی گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوه ها دارم
گرفتم رحم بر فریاد و افغانم نمے آید

انہوں نے عرفی کی طرز پر جو قصیدہ "گہ گیستن" کی ردیف میں لکھا ہے وہ بھی نواب ضیاء الدین کے تجویز کئے ہوئے مصرع طرح پر تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس مشاعرے میں یہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اس میں میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی علالت کی وجہ سے نہ آئے تھے۔ اور چونکہ فارسی کے قدر دان تھوڑے سے تھے۔ مرزا شش و پنج میں تھے۔

عماس سے حاصل ہو جاتا۔ مرزا اس سے مطمئن تھے اور ایسے دائم آمدنی بڑھانے کے لئے بہت لے قرار رہتے۔ چنانچہ جب ۱۸۴۲ء میں طامس کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لئے انہیں بلایا گیا تو چونکہ وہ اپنے آپ کو جاگیردار سمجھتے تھے انہوں نے ملازمانہ طریقے سے حکام سے ملنا قبول نہ کیا اور یہ ملازمت نہ کی لعض لوگ حیراں ہیں کہ مرزا جو عام مجسٹریٹوں اور معمولی معتمدیوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے اور جو سلسلہ و تملق کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے وہ چیف سکتر کے استقبال نہ کرنے سے کیوں اس قدر حارج پا ہو گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا مدحیہ قصائد میں جو ایک طرح کا مبالغہ روا رکھتے اسے وہ ایک شاعرانہ رسم سمجھتے تھے جس کے شروع سے سب شاعر پا سدر چلے آئے ہیں اور انگریز افسروں کی تعریف میں ان کے قصیدے فی الحقیقت منظوم عرضیاں ہیں جنہیں زیادہ موثر بنانے کے لئے مرزا نے شاعرانہ کمالات کے نظم میں لکھا۔ وہ طبعاً خوددار اور حساس تھے اور وضعداری کے تمام اصولوں کا دھیان رکھتے تھے۔

اردو اور فارسی کلام کی اشاعت ان دنوں ان کے تعلقات سر سید احمد خاں اور ان کے بھائی سید محمد خاں سے بڑھے اور اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ان کا منتخب دیوان ریختہ ان بھائیوں کے پریس سید المطابع سے چھپ کر شائع ہوا فارسی کلیات بھی اس سے چار سال بعد شائع ہوا چنانچہ پہلا حصہ سارس کے کتب خانے میں دیوان غالب کا جو ایڈیشن ہے اس کی تاریخ طباعت ۱۸۴۵ء ہے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے مرزا کی شہرت جہاں پہلے نہ پہنچی تھی پہنچ گئی ہوگی اور ان کا ملند مرتبہ مسلم تسلیم کرنے لگے ہونگے

مشاعروں کی غزلیں علاوہ ازیں ان دنوں دہلی میں جا بجا مشاعرے ہو رہے تھے جس میں فارسی اور اردو غزلیں پڑھی جاتیں مرزا اس میں تو نہ جاتے

غالب کو مقدمے کا فیصلہ اگست ۱۸۳۱ء میں معلوم ہُوا۔ اس کے بعد زمانے نے اب تک کئی رنگ بدلے تھے۔ جائداد کا قضیہ غالب کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا لیکن اب جن سے تنازعہ تھا۔ وہ ہی نہ رہے تھے۔ اور اُن کی لاکھوں کی جائدادیں نذرِ فنا ہو گئی تھیں۔ مرزا بھی اپنی قسمت پر قانع ہو چلے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب ان کے تعلقات کسی انگریز افسر سے بڑھتے۔ اور منزلِ گم گشتہ کی ایک جھلک نظر آتی۔ تو وہ ایک نئی عرضداشت گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیج دیتے۔ اور پنجاب گورنمنٹ کے ریکارڈز میں ایسی کئی عرضیاں محفوظ ہیں لیکن ان کوششوں اور جسم و جان کی اگلی بازیوں میں بہت فرق تھا۔ اور اب اگر یہ عرضیاں داخل دفتر ہو جاتیں تو مرزا بہت مایوس نہ ہوتے۔ مرزا اب اپنے ماہوار مشاہرے سے مطمئن ہو چلے تھے۔ اور غالباً چند احباب و امرا کی اولاد کو درس دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کی تصانیف ملک میں عام ہو چلی تھیں۔ اور ان کی قبولیت سے ان زخموں کا اندمال ہوتا تھا۔ جو تلاشِ روزگار میں کھائے تھے۔

○ ان کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ لیکن سرکاری طور پر جو رقم ملتی۔ اور جو کچھ احباب کی

ہے فارسی خطوط میں سراسر مفقود ہے بالعموم یہ کہنا صحیح ہے کہ مرزا کی دلچسپ شخصیت جو اُردو خطوط
میں عُریاں اور بے نقاب جلوہ نما ہے اس پر فارسی خطوط میں تکلفات اور رسمی انشا پردازی کے
پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس کے دلچسپ اور ہر دلعزیز پہلو مشکل سے ہی نظر کے سامنے
آتے ہیں۔ لیکن اگرچہ فارسی اور اُردو خطوط دونوں ایک ہی ذہن رسا کے نتائج ہیں اور
جس طرح ایک ہی مضمون کو مرزا نے فارسی اور اُردو اشعار میں ادنیٰ اختلاف کے ساتھ نظم
کیا ہے اسی طرح فارسی خطوط میں کئی خیالات اور جذبات ایسے ہیں جنہیں ترقی دیکر
انہوں نے اُردو میں نہایت موثر طریقے سے ادا کیا مثلاً انہوں نے عارف کی موت پر جو
غزل لکھی ہے وہ اُردو کی موثر ترین نظموں میں سے ہے۔ لیکن اس کا جزو اس سے چند
سال پہلے کے ایک فارسی خط میں موجود ہے جو انہوں نے مولوی سراج الدین کو مرزا
احمد بیگ کی وفات پر لکھا۔ میگفت کہ بدہلی می آیم وعدہ فراموش ہمیرفت راہ گرد اندو ماتم
سرسرا دیگر را بدر گرفتم کہ عاطل و دستان عزیز مولفت جو الحال چند سال نہ پرداخت شہی آمدی
خیال ہے جس کو انہوں نے اُردو غزل میں نظم میں کیا ہے ؎

تجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ہوئے۔ اہالیانِ دہلی کی بُری حالت تھی۔ ولی عہد شاہ دہلی مرزا ابوظفر نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ اور ایک دوشالہ ملبوس خاص نذر کر کے آنکھوں میں آنسو لا کے نہایت رنج و درد سے الوداع کیا۔ ایک اور خط میں لارڈ النبرا کے اس فیصلے کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی رو سے تاج محل اور قلعہ آگرہ کی عمارتوں کا سنگ مرمر اتار کر بیچ ڈالنے کا ارادہ تھا۔ اور جو بقول لارڈ کرزن آرٹ کی خوش قسمتی سے عمل میں نہ لایا جا سکا۔

حالی نے 'یادگارِ غالب' میں مرزا کی فارسی نثر کا انتخاب کر کے فارسی کے دوسرے مشہور نثر نویسوں کی تحریروں سے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ اور اس کی خوبیاں اور خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مرزا خود چاہے کچھ کہیں۔ انہوں نے نثر میں اکثر اُن فارسی نثر نویسوں کا اتباع کیا جن کی تصنیفات ہندوستان میں لکھی گئیں۔ اور اس امر پر قریب قریب سب فارسی اہلِ زبان متفق ہیں۔ کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ترک یا مغل بادشاہوں کی سرپرستی میں جو فارسی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کا طرزِ تحریر کسی طرح بھی قابلِ تقلید نہیں۔ ان کتابوں کے مصنف بالعموم موٹے موٹے عربی لفظوں۔ پیچیدہ ترکیبوں اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے طوفان میں اصل مطلب خبط کر دیتے ہیں۔ مرزا بھی اس اصول سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ اُن کی آخر عمر کی تصانیف دستنبو اور قاطع برہان کی زبان کسی قدر صاف ہے۔ اور اکثر فارسی خطوط میں بھی وہ اشکال نہیں۔ جو تقریظوں اور دوسری سنجیدہ اور رسمی تحریروں میں ہے۔ اکثر خطوط کی عبارت صاف اور موثر ہے۔ شاعرانہ نازک بیانی سے بھی لطف پیدا کیا ہے۔ لیکن ان کے فارسی خطوط ان کے اُردو خطوط کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔ ان میں وہ شگفتگی اور بے تکلفی نہیں۔ جو اُردو خطوط میں ہے۔ اور جو شوخی اور ظرافت بعد کے اُردو خطوط کا طرۂ امتیاز

تاریخ ہیں اور جو اس وقت لکھے گئے جب مرزا کو یہ حالات درپیش تھے اس تخصی اہمیت کے علاوہ مرزا کے فارسی خطوط اس لئے بھی دلچسپ ہیں کہ ان کے مطالعہ سے اس زمانے کی کئی ممتاز ہستیوں سے شناسائی ہو جاتی ہے جن لوگوں کے نام مرزا نے خطوط یادگار چھوڑے ہیں ان کی فہرست بہت پُرشکوہ ہے اور اس میں اس زمانے کے اکثر برگزیدہ آدمیوں کے نام آجاتے ہیں چنانچہ شعرا میں سے ناسخ مومن شیفتہ سرورحسان اور علما میں سے مولینا فضل حق مولانا صدرالدین صدرالصدور قاضی القضاۃ ولیا ولایت حسن اور اکابر میں سے شہزادہ نصیرالدین حیدری شہزادہ سلیمان شکوہ معاہدالدولہ ممتازالملک حسام الدین حیدر خاں ۔ سرہنری طامس ۔ مہاراجا الور ۔ نواب سعدالدین خاں تعلق مجتہد العصر مولوی سید محمد و حکیم احسن اللہ خاں ۔ ان سب کے نام مرزا کے دوستانہ خطوط موجود ہیں جن سے نہ صرف مرزا کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں شمالی ہندوستان میں جو بڑی بڑی ہستیاں تھیں ان سے بھی تعارف ہو جاتا ہے ان خطوط میں بیشتر ذاتی حالات کا تذکرہ ہے لیکن ان سے اس زمانے کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً مرزا نے اپنے سفر بنگالہ کی جو مشکلیں میاں کی ہیں ان سے اس زمانے کے وسائل آمدورفت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے یا جو خط انہوں نے لکھنؤ سے روانگی کے وقت لکھا ہے اس میں لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی ان مصیبتوں کی تفصیل ہے جو انہیں معتمدالدولہ کی وزارت میں برداشت کرنی پڑیں اس کے علاوہ کئی خطوط میں مولوی سراج الدین کو دہلی کی دلچسپ خبریں لکھی ہیں مثلاً ۱۳ر جنوری ۱۸۲۵ء کے ایک خط میں مولوی فضل حق کے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے اور دہلی سے روانہ ہونے کی تفصیلات درج کی ہیں اور لکھا ہے ۔ کہ جونہی انہوں نے استعفیٰ دیا نواب فیض محمد خاں نے فوراً ایک سو روپیہ ماہوار ان کے اخراجات کے لئے مقرر کر دیا اور جس روز وہ دہلی سے روانہ

اور اس کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

فارسی خطوط آہنگِ اوّل کا تذکرہ ہم ابتدائی حالات میں کر چکے ہیں۔ آہنگِ دوم میں فارسی صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں۔ آہنگِ سوم کے اشعار اس لئے بھی کار آمد ہیں کہ ان سے کئی فارسی غزلوں کی تاریخ تصنیف تعین کی جا سکتی ہے۔ اور اس کے علاوہ مرزا کے اپنے قلم سے ان کے اشعار کا مفہوم اور محلِ استعمال پڑھنا بے حد دلچسپ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کا سب سے قیمتی جزو مرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں۔ جن کا بیشتر حصہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۵۳ء تک لکھا گیا۔ یہ خطوط غالب کے سوانح نگار کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔ ہم نے اس کتاب میں دوسرے تذکروں سے زیادہ مفصّل اور صحیح حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں تو یہ بیشتر اسی محنت کا صلہ ہے۔ جو ہم نے ان خطوط کے مطالعہ میں صرف کی ہے۔

مرزا کے اُردو خطوط کی سوانحی اہمیت کو سب مانتے ہیں۔ لیکن سوائے ان خطوط کے جن میں مرزا نے اپنے واقعاتِ زندگی مختصراً دُہرائے ہیں۔ ان میں نو دس سال سے زیادہ کے واقعات نہیں۔ اور چونکہ اس زمانے میں نواب مصطفٰے خاں کے تعلقات کی وجہ سے حالی کو بھی جو نواب کے لڑکوں کے اتالیق تھا۔ مرزا سے ملنے کے موقع ملتے رہتے تھے اس لئے اس زمانے کے حالات اور قصّے یادگارِ غالب میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ لیکن مرزا کے ابتدائی حالات میں ابھی کرید اور تلاش کی گنجائش ہے۔ اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اس کے لئے مرزا کے فارسی خطوط بہت مفید ہیں۔ جو ان کی عمر کے بڑے حصّے کی کم و بیش ایک مکمل

نظم دستر کا مجموعہ میخانۂ آرزو مرتب ہو چکا تھا اس کا خاتمہ ۱۲۴۹ھ میں لکھا گیا اور اس کا ایک قلمی نسخہ رائے چھجمل کے ہاتھ کا لکھا ہوا علاء الحق لائبریری میں موجود ہے جس کا مرزا کی حاشی فوری کی مدوین میں بھی مرتبہ ہے جامعہ بھوپال کا اردو شاعری میں اور جس سے ان کا ابتدائی پچاس سال کا فارسی کلام وثوق سے ترتیب دیا جا سکتا ہے +

پنج آہنگ ابتدا میں جب غالب نے یہ مجموعہ مرتب کیا تو اس میں اشعار کے ساتھ فارسی نثر شامل بھی مرزا علی بخش کو نثر علاحدہ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے میخانہ آرزو میں جو نثر موجود تھی اس کے علاوہ دوسرے خطوط فراہم کر کے پنج آہنگ مرتب کی اس کتاب کے شروع میں مرزا علی بخش کا ایسا دیباچہ ہے جس میں یہ تفصیلات درج ہیں آہنگ اول میں فارسی خطوط نویسی کے متعلق وہ سطور ہیں۔ جو غالب نے سفر بھرت پور کے دوران میں لکھی تھیں۔ آہنگ دوم میں فارسی مصادر اور مصطلحات ہیں ۔ آہنگ سوم میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے کئی شعر انتخاب کیے ہیں اور خطوط نویسی میں ان کا محل استعمال بتایا ہے آہنگ چہارم میں تقاریظ کتب اور متفرق مضامین اور آہنگ پنجم میں مرزا کے فارسی خطوط ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خطوط کے فراہم کرنے میں کچھ دیر لگی اور ۱۸۴۲ء کے قریب یہ کتاب مرتب ہوئی انڈیا آفس لائبریری میں اس کا جو نسخہ ہے اس کی تاریخ طباعت ۱۸۵۳ء ہے اس کے بعد آہنگ چہارم اور آہنگ پنجم میں اضافہ ہوتا رہا لیکن مرزا کے کئی خطوط غدر میں نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی سے ضائع ہو گئے تھے۔ اس لئے بقول غالب پنج آہنگ نامکمل ہے

لہ مرزا کی تصنیفات کے ہم بہت شاعرانہ ہیں گل رعنا میخانۂ آرزو پنج آہنگ مہر نیمروز اور دستنبو عود ہندی سبد چیں +

ایک قطعہ بند بھی ہے جس کا مضمون اقبال کی مشہور نظم "اسیری" سے جو انہوں نے مولینا محمد علی کی رہائی پر لکھی تھی، ملتا جلتا ہے ؎

گفتم بہ عقل کل کہ ندانم برائے من — حکم دوام حبس چرا کرد روزگار
گفت اے ستارہ سوختہ زاغ و زغن نۂ — کانرا گرفت و باز رہا کرد روزگار
تو بلبلی ہمیں کہ بدام آمدی ترا — اندر قفس ز بہر نوا کرد روزگار

بیشک غالب کے لئے یہ حصۂ زندگی مصیبتوں اور ناکامیوں سے بھرا ہوا تھا لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بنجر نہ تھا۔ قرین قیاس ہے کہ جب مرزا کے نوابی اور جاگیرداری کے خواب پریشان ہو گئے۔ تو انہیں شعر و سخن سے جو ازلی دلچسپی تھی۔ وہ اور بھی بڑھ گئی۔ اور جو چیز پہلے فقط دل لگی کا اظہار تھی۔ اب سرمایۂ حیات ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیفات میں زیادہ دلچسپی لے کر منتخب اردو دیوان اور فارسی نظم و نثر کو مرتب کیا۔ اور فارسی غزلیات کا معتدبہ حصہ بھی اسی زمانے میں لکھا گیا۔ جب ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین کی پھانسی کے کچھ دیر بعد مرزا کے نسبتی بھائی مرزا علی بخش خاں[۱] ان کے ہاں آکر مقیم ہوئے۔ تو ان دنوں مرزا کی فارسی

[۱] مرزا علی بخش مرزا کے نسبتی بھائی تھے۔ اسکے علاوہ غالب کی بھتیجی یعنی مرزا یوسف کی صاحبزادی مرزا علی بخش کی بہو اور مرزا غلام فخر الدین کی بیوی تھی۔ مرزا غالب اور مرزا علی بخش کے تعلقات شروع میں اچھے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ بعد میں انمیں فرق آگیا۔ مرزا نے اپنے دو خطوں میں مرزا علی بخش کی "دروغ بافیوں" کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردوئے معلٰے سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا ان کی تدلیس میں بھی شامل نہیں ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے مرزا علی بخش نے غدر کے وقت مرزا کی مدد نہیں کی۔ وہ ایک اردو خط میں اپنے سکہ کے متعلق لکھتے ہیں "سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانا اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔ ہاں صاحب گولہ انداز (مرزا معین الدین؟) کا ہوئی (مرزا ضیاء الدین) مددگار ہے۔ اور شاعر (غالب) کا سالا (مرزا علی بخش) بھی جانبدار ہیں"۔
(بین القوسین الفاظ ہمارے ہیں)

شعلے کی کوشش کی تھی لیکن اس زمانے میں ان کی سب تدبیریں اُلٹی پڑ رہی تھیں یہ کوشش بھی چنداں کامیاب نہ ہوئی اس زمانے میں تخت شاہی پر اکبر شاہ ثانی متمکن تھے اور ظفر ولی عہد تھا لیکن ظفر کی دماغی حالت بہت اچھی نہ سمجھی جاتی تھی اس لئے بادشاہ نے ۱۸۳۴ء میں کوشش کی کہ کسی طرح بجائے ظفر کے شاہزادہ سلیم ولی عہد تسلیم ہو جائے مرزا غالب سمجھتے تھے کہ ظفر تو دو دن کا مہمان ہے اگر شہزادہ سلیم آگے چل کر بادشاہ ہوا تو میرے لئے بہتر رہے گا چنانچہ اسی سال عید الفطر کے موقعے پر انہوں نے "شہ و شاہزادہ" کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس میں بادشاہ اکبر کی تعریف کے ساتھ ساتھ ذیل کا مطلع ثانی لکھ کر شہزادہ سلیم کی تعریف کی تھی سے

رہے مناسبت طبع شاہزادہ سلیم
ربیعِ تربیت پادشاہ ہمت اقلیم

لیکن بادشاہ کی تحریر کو حکام انگریزی نے نہ مانا۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کی وفات پر ظفر بادشاہ ہوگیا ممکن ہے کہ اس کے دل میں اس قصیدے کا کچھ ملال رہا ہو۔ اور اس کی تعریف کے ابتدائی فارسی قصائد میں غالب کو بار بار معذرت کرنے کی جو ضرورت پیش آئی۔ اسکا اس قصیدے سے بھی کچھ تعلق ہو +

جس سال بہادر شاہ تخت نشین ہوا اُسی سال نصیر الدین شاہ اودھ کا انتقال ہوا اور امجد علی شاہ اس کا جانشین ہوا مرزا نے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا لیکن وہ ~~عالم ارتحال~~ اس قصیدے میں تشبیب اور مدح کے بعد اپنی قسمت کا رونا رویا ہے

ما من کہ تاب بار نکو یاں ندا شتیم
بدکرد بد کہ خورد و جفا کرد روزگار

- حکام کو اس کے خلاف بھڑکا رکھا ہے +

نواب شمس الدین سے جنہیں مسٹر کالون کی مزید تحقیقات کے بعد سوم اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری بازار کے باہر شارع عام میں پھانسی دی گئی۔ عوام کو بہت ہمدردی تھی۔ اور غالب کے متعلق اگرچہ عوام کا خیال بے بنیاد ہی ہوتا ہم یہ خیال عام ہونے کے بعد ان کا غالب سے جو برتاؤ ہو گا۔ وہ ظاہر ہے۔ اور مرزا نے ناسخ کے نام اس زمانے میں جو دو خط لکھے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لئے یہ وقت کس ابتلا اور آزمائش کا تھا۔ اور وہ غصے اور عداوت سے کس طرح بے قابو ہو رہے تھے +

نواب کی وفات کے بعد فیروز پور جھرکہ کی ریاست ضبط ہو گئی۔ اور مرزا کی پنشن جو انہیں اس ریاست سے ملتی تھی۔ دہلی کلکٹری سے ماہوار ملنی شروع ہوئی۔ مرزا نے اس موقعے پر پھر ایک مفصل عرضی گورنمنٹ آف انڈیا کی خدمت میں نواب کی جائداد سے پورا حق پانے کے لئے پیش کی۔ لیکن لارڈ ولیم بینٹنگ نے مرزا کے حقوق کا قطعی فیصلہ کر دیا تھا۔ اس لئے وہ داخل دفتر ہوئی۔ اس پر مرزا نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے حکومت ہند کے فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا۔ لیکن مرزا کو اس عرضداشت کا جواب بھی نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں ایک عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھی ارسال کی لیکن یہ سب سعی بے سود ثابت ہوئی۔ اور مرزا کو باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار سے زیادہ پنشن کبھی نہیں ملی +

ادبی سرگرمیاں | فریزر کے قتل سے چند مہینے پہلے مرزا نے دربار شاہی میں اپنا اثر

(صد ۶۹ سے آگے)
کی وجہ سے پیدا ہوا جسے مٹکاف صاحب نے ذاتی عداوت کا اظہار سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن رسل صاحب نے دھیان میں رکھا اور مجرم کا سراغ کھوج نکالا +

مردان اللہ ہمیم اما حور و وحشت میں مردانیاں ماند آنچہ درین چند روز از رنج و آشفتہ شدہ
ام کار از تشیم آنچہ کار بعد سالہ عقوبت جہنم یک دم اماں تواند دید"

فریزر کا قتل

مرزا اس فیصلہ سے ششدر ہی تھے کہ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی شام کو ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ فریزر سے مرزا کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور انہیں اُمید تھی کہ شاید اس کی اعانت سے جاگیر کا عقدہ حل ہو جائے۔ فریزر کی تعریف میں ان کا ایک پُر زور قصیدہ بھی ہے ؎

رحیب افق مہر چوں سر بر آرد — سے از سر پیمانہ ساغر بر آرد
مس و رسم ولیم فریزر بہادر — کہ از جیب ہر گوشہ گوہر بر آرد
چہ داد گستر کہ گرد حضورش — ستم داد از دست آذر بر آرد
کشد انتقام حسن از شعلہ چالاک — کہ دود از نہاد ستمگر بر آرد

مرزا کو اس کی موت کا سخت رنج ہوا چنانچہ وہ اسی خط میں لکھتے ہیں۔
"تیکے از ستمگری این جہان آن است کہ جناب اعلی گردون جناب ولیم فریزر صاحب بہادر را کہ
ریذیڈنٹ دہلی و غالب مغلوب را مربی بود در شب تاریک بضرب تفنگ کشتہ
مرا غم مرگ پدر تازہ کرد"

ان دنوں جو صاحب دہلی میں مجسٹریٹ تھے وہ غالب کو جانتے تھے اُنہوں نے غالب سے تفتیش جرم کے سلسلے میں مدد لی اور سرکاری تحقیقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب شمس الدین اور ان کا ایک سپاہی مجرم قرار دئے گئے۔ نواب اور غالب کے تعلقات تو عوام کو معلوم ہی تھے۔ دہلی کے لوگ یہ اُلٹے کہ نواب بے گناہ ہے اور غالب اور فتح اللہ بیگ خاں نے کسر دری سے

لہ سوانح عمری اللہ میں درج ہے کہ نواب کے متعلق ایک شخص فتح خاں (؟) کے ایک نوکر سے
(باقی اگلے صفحہ پر)

کلکتے جاکر کوشش کریں۔ مرزا بھی ان کوششوں میں شریک تھے۔ چنانچہ جب اکتوبر ۱۸۳۴ء میں نواب کلکتے گئے تو غالب نے انہیں اپنے کلکتے کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھرے تعارفی خطوط دئے۔ مولوی سراج الدین کو ایک خط میں اُنہوں نے لکھا تھا:۔

"بالجملہ بدیں نامہ نگاری مُدعائے اصلی بدیں رنگ است۔ کہ برادر صاحب مشفق نواب امین الدین خان بہادر ابن فخرالدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر را ہماں موجِ بلا کہ زورقِ شکستہ بود۔ خانہ بہ سیلاب فنا داد۔ کمر بہ غمخواری و راہرو نوازی استوار بندید و خود را دوست دیرینۂ امین الدین حال دانستہ آنجاں چارہ سازی و سگالش گیری بجا آرید۔ کہ این دردمند دُور از خانماں اسداللہ روسیاہ را فراموش کند و شمار ابجائے او دانند"۔

قید خانہ نشینی

مرزا کے عزیز دوست کئی تھے۔ لیکن اُن کے باوجود مرزا کے مصائب کم نہیں ہُوئے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی۔ کہ نواب شمس الدین کا دہلی میں بہت رسُوخ تھا۔ دوسرے مرزا کا قرضہ جو کلکتے جانے سے پہلے ہی انہیں پریشان کر رہا تھا۔ بہت بڑھ چکا تھا۔ اور چونکہ قرضخواہوں کو کوئی بڑی جائداد نظر نہ آتی تھی۔ وہ حصُولِ زر کیلئے بیتاب ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسی سال ان میں سے دو نے دیوانی عدالت میں مرزا کے خلاف دعوئے کر کے ڈگری حاصل کرلی۔ مرزا کے لئے یہ زمانہ سخت مصیبت کا تھا۔ ان میں زرِ ڈگری ادا کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اور قاعدے کے مُطابق انہیں جیل جانا تھا۔ لیکن چونکہ بقول ان کے مشہُور اشخاص کے ساتھ اتنی رعایت ہوتی تھی کہ عدالت کا چپڑاسی ان کے گھر نہ جاتا اور جب تک مدیون رستے میں نہ ملے اسے قید نہ کر سکتے تھے۔ مرزا بھی گھر بیٹھ رہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک اہم فارسی خط میں ناسخ کو اس زمانے کے تمام حالات لکھے ہیں:۔

"چار ماہ است۔ کہ نامہ نگار بہ کنجے نشستہ در آمد و شد بروئے خویش و بیگانہ بستہ۔ اگر

آخر میں لکھتے ہیں:

"اکنوں مطلب در آں منسم کہ ارس دادوی قطع نظر وباسد و وکالت نامہ مس کو سدستی

بعدالتدالت مارسامد دارسم بدرمدو ،ونکر دمدالدلس ماسوئی ہوس"

مرزا کو ایک تو اسی کوشش رائیگاں جانے کا افسوس تھا دوسرے اہالیان دہلی کے

طعنے جن سے بچنے کے لئے انہیں شروع شروع میں کچھ عرصے لت میں پناہ لینی پڑی ابتدا

میں لا ابالیسی اور رنج کی شدت سے طبیعت فکر شعر کے ناقابل تھی لیکن آہستہ آہستہ اس رنج کا

اندمال ہونا شروع ہوا اس کے عزیز دوستوں میں سے ان کے تعلقات مولوی فضل حق

سے ہمیشہ برقرار رہے تھے نواب مصطفٰے خاں سے رابطہ اسی زمانے میں بڑھا اور نواب

امین الدین اور نواب ضیاء الدین سے جو نواب شمس الدین سے بہت خوش نہ تھے دوستانہ

اور مضبوط ہو گیا ہم ذکر کر چکے ہیں کہ نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارا ہے دونوں بھائیوں کے

نام منتقل کر دیا تھا انتظام اس کا نواب امین الدین کے ہاتھ میں تھا اور ایک شرط یہ تھی

کہ اس کی آمدنی میں سے ۵۲۱ روپیہ سالانہ سرکاری خزانے میں نواب ضیاء الدین کے

اخراجات کے لئے جمع کر دیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ نواب امین الدین یہ رقم باقاعدہ خزانے

میں جمع نہ کر سکے اس پر نواب شمس الدین نے کوشش شروع کی کہ نواب امین الدین سالانہ

کی تمام شرطیں پوری نہیں کر سکے۔ اس لئے ایک سالانہ رقم کے عوض یہ پرگنہ ان سے لے لیا

جائے مسٹر مارٹن ریذیڈنٹ دہلی نے اس کی تائید کی اور گورنمنٹ آف انڈیا کے احکام کے

مطابق لوہارو نواب شمس الدین کو واپس مل گیا مسٹر ولیم فریزر جو نئے ریذیڈنٹ ہو کر آئے تھے

اس تبادلے کے حق میں نہ تھے شروع میں نواب شمس الدین سے ان کا گاڑھا یارانہ تھا لیکن

بعد میں کشیدگی ہو گئی انہوں نے نواب امین الدین کو مشورہ دیا کہ وہ اس فیصلے کے خلاف

مقدمے کے بگڑ جانے سے غالب کی جو حالت ہوئی اُس کا اظہار کئی خطوں میں ہے۔ چنانچہ مولوی سراج الدین کو جنہوں نے اِس سلسلے میں ان کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ لکھا ہے:۔

"کارِ من بداں گاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشند تباہی گزید۔ حالیا براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد بازبداں دررسم و دردِ دل بداں زمزمہ فروریزم کہ مرغانِ ہوا و ماہیانِ دریا را برخود بگریانم ہیہات اگر معاش من ہمیں پنج ہزار روپیہ سالانہ بدیں تفریق از روئے دفترِ سرکار کہ سادہ دلاں آں را معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود۔ بایستے کہ صاحبانِ صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش۔ آنچہ تو باز یافت وانمودہ یافتی ازاں فزوں ترنیست۔ و قرارداد نیز ہمانست۔ لاجرم دیوانہ بودمے۔ اگر بدیں کشور باز آمدمے و بایک قبیلہ کہ خویشاں و برادراں اند۔ بہ ستیزہ برخاستمے و بباطل سپری نام برآوردمے"!

ان سطور سے یہ خیال ہوسکتا ہے۔ کہ مرزا کو پھر کلکتے جانے اور صدر میں کوشش کرنے کا خیال تھا۔ لیکن غالباً یہ فقط انشا پردازی ہے۔ مرزا پھر کلکتے نہیں گئے۔ اور اِس خط کے

اسی طرح لکھنؤ میں بھی مرزا کو دیر تک قیام کرنے اور وہاں کے طرز شاعری اور ربان کی صفائی میں ناسخ جو کوششیں کرر ہے تھے اہیں مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا یقین ہے کہ مرزا کی اثر پذیر طبیعت نے ان تمام باتوں سے فائدہ اُٹھایا ہوگا اُنھوں نے سفر کلکتہ کے بعد عرصے تک اُردو اشعار بہت کم لکھے ہیں۔ لیکن اس کے پہلے اور بعد کے فارسی اشعار میں جو فرق ہے وہ طبیعت اور دماغ کی اُس پختگی کو نمایاں کرتا ہے جو اس بیں سال کے عرصے میں اہیں حاصل ہوئی ۔

خلاف کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے تقسیم جائداد کی تائید میں لارڈ لیک کا ایک فارسی حکم نامہ پیش کیا تھا۔ جسے مرزا جعلی بتاتے تھے۔ اس کے مطابق نصر اللہ خاں کے وارثوں کی غور و پرداخت کے لئے جو رقم مقرر ہوئی تھی۔ وہ لارڈ لیک کے احکام کے مطابق دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ رہ گئی تھی۔ جس میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کے۔ پندرہ سو مرزا نصر اللہ خاں کی ماں اور بہنوں کے اور پندرہ سو اس کے دو بھتیجوں یعنی مرزا غالب اور مرزا یوسف کے تھے۔ مرزا اس "نامۂ فارسی بے نام و نشاں" کی صحت اور اہمیت کے قائل نہ تھے۔ لیکن سرجان ملکم نے جن سے اس امر میں استصواب کیا گیا' اسے درست تسلیم کیا۔ اور ان کے مشورہ پر لارڈ ولیم بینٹنگ نے مرزا کا دعوےٰ خارج کر دیا۔

سفرِ کلکتہ کے اثرات | یہ صحیح ہے کہ بظاہر مرزا کا سفرِ کلکتہ بے کار ثابت ہوا۔ اور حصولِ جائداد کی تمام تگ و دو رائگاں گئی۔ لیکن مرزا کے مشاہدے کی وسعت اور ذہنی نشو و نما کے لئے کلکتے کا سفر بہت مفید رہا۔ ایک تو غربت میں طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر جو قسم قسم کے آدمیوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ہوا دوسرے کلکتہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا صدرِ حکومت تھا۔ مغرب کی تمام ترقیاں اور ایجادیں سب سے پہلے ہندوستان میں وہاں شروع ہوتی تھیں۔ مرزا کو انہیں بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ اور اس معاملے میں ان کی واقفیت اپنے ہموطنوں سے زیادہ تھی[1]۔

[1] اس کا کچھ اندازہ مرزا کے اس قطعہ سے ہو سکتا ہے۔ جو انہوں نے سرسید کی کتاب آئینِ اکبری کے متعلق لکھا۔ اور جس میں مغربی ترقیوں کی ایک دلچسپ تصویر کھینچی ہے۔

وہاں تک رسائی نہ ہوئی تو مرزا کی طبیعت پر مایوسی غالب آگئی۔ چنانچہ اس کے بعد کے خطوط
اس تلخی سے پُر ہیں۔ اور ایک فارسی قطعے میں بھی کلکتہ کے متعلق انہوں نے مکالمے کی صورت
میں تلخ جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

غالبؔ کلکتہ مار ہستم و گفت | باید اقلیم ہستش گفتش
گفتم ایں جا چہ شغل سود دہد؟ | گفت از ہر کہ ہست ببریدن
گفتم ایں جا چہ کار باید کرد؟ | گفت قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم از بہر داد آمدہ ام
گفت مگریز و سر بہ سنگ مزن

مُقدمہ کا فیصلہ

مرزا کے خطوط سے خیال ہوتا ہے کہ دہلی سے سر ایڈورڈ کولبروک نے مرزا کے حق میں رپورٹ کی تھی اور کلکتہ سے بھی حوصلہ افزا
جواب دیا گیا تھا لیکن ابھی وہ جواب نہ پہنچا تھا کہ کولبروک معزول ہو گیا اور معاملے پر
نئے سرے سے تفتیش شروع ہوئی۔ چونکہ کلکتے میں مرزا کا قیام کسی طرح مفید نہیں
ہو رہا تھا۔ اور گورنر جنرل جو۔ دہلی کی طرف جانے والا تھا اس لئے مرزا بھی کلکتے سے
دہلی واپس گئے اور ۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء کو وہاں پہنچ کر نئے ایجنٹ فرانسس ہاکنس سے
مدد چاہی۔ کرنل ہنری املاک نے مرزا کی سفارش نئے ایجنٹ سے کی تھی اور انہیں کچھ
اُمید بھی ہوئی لیکن ایجنٹ نے رپورٹ نواب شمس الدین رئیس فیروزپور کے حق میں کی
مرزا کو ان کے دوستوں نے اس کی اطلاع دی لیکن وہ مطمئن تھے۔ کہ اسٹرلنگ چیف
سیکرٹری معاملے کو سنبھال لے گا۔ لیکن ابھی یہ رپورٹ کلکتے نہیں پہنچی تھی کہ ۲۳ر مئی
۱۸۳۰ء کو سٹرلنگ مر گیا۔ اور ۲۷ر جنوری ۱۸۳۱ء کو لارڈ ولیم بینٹنگ نے فیصلہ مرزا کے

غربت اور احتیاج کی حالت میں کلکتے کے بااثر لوگوں سے بگاڑ مول لینا دانشمندی کے خلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے نواب اکبر علی اور مولوی محمد حسن کے ایما پر ایک فارسی مثنوی بادِ مخالف لکھی۔ جس میں معترضوں کے جواب اسناد و دلائل کے ساتھ دئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اراکین انجمن اور قتیل کی تعریف کر کے صلح و آشتی کی کوشش کی ہے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں مرزا نے زیادہ تر فارسی اشعار لکھے۔ لیکن وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی پر بخوبی قادر تھے۔ اور خاص خاص موقعوں پر اُردو شعر کہہ لیتے تھے۔ چنانچہ چکنی ڈلی کی تعریف میں ان کا مشہور اُردو قطعہ کلکتے ہی کی ایک صحبت کی یادگار ہے۔

گُلِ رعنا

کلکتے میں غالب کی ملاقات لکھنؤ کے مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی۔ جن کا اخبار آئینۂ اسکندر سے کچھ تعلق تھا۔ اور جن کا حکام میں بھی بہت رسُوخ تھا۔ انہیں مرزا کے عزیز ترین دوستوں میں سے سمجھنا چاہئے۔ اور غالب کے فارسی مکتوبات میں سب سے زیادہ خطوط انہی کے نام ہیں۔ ان کے ایما پر غالب نے قیام کلکتہ کے دوران میں اپنے اُردو دیوان کا انتخاب اور فارسی کلام گُل رعنا کے نام سے جمع کیا۔ اس انتخاب کا ایک نامکمل نسخہ، جس میں اخیر کے اُردو اشعار اور فارسی غزلیں نہیں، مولینا حسرت موہانی کے پاس ہے اس میں کئی ایسے اُردو اشعار درج ہیں، جو بعد میں منتخب اُردو دیوان سے خارج کر دئے گئے گُل رعنا کا 'مقدمہ' اور 'خاتمہ' مرزا کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔ اور مرزا کی شاعری کے طالب علم کے لئے بڑا دلچسپ ہے۔

کلکتے میں غالب کا قیام دو سال سے کچھ کم رہا ہوگا۔ شروع شروع میں تو نئی صورتیں اور نئے انتظامات نظر کو بہت بھائے۔ گورنر جنرل کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی اور باقاعدہ دربار کا اعزاز ملا۔ لیکن جب دو سال گذر گئے۔ اور جس منزل کو پیشِ نظر رکھ کر گھر سے نکلے تھے۔

اور اُردو فارسی غزلیں پڑھی جاتیں مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں ان میں ایک غزل
تھی جس کا مقطع مشہور ہے ؎

گر دہم شرحِ ستمہائے عزیزاں غالب
رسمِ اُمید ہمانا ز جہاں برخیزد

جب ذیل کا شعر پڑھا گیا، تو لوگ معترض ہوئے ؎

خردے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

اعتراض یہ تھا کہ عالم واحد ہے اور ہمہ بقولِ قتیل واحد سے پہلے نہیں آسکتا اسی طرح
معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے شعر پر بھی اعتراض ہوا کہ زدہ کا استعمال غلط ہے ؎

شورِ اشکے بہ رفتارِ رگِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفاں زدہ

غالب کے معترضین[1] میں مولوی عبدالقادر رام پوری مولوی کرم حسین بلگرامی مولوی
نعمت علی عظیم آبادی اور فارسی کے دوسرے مستند اُستاد تھے لیکن مرزا بھی تنہا نہ تھے۔ انہی
دنوں شاہزادہ کامراں کی طرف سے کفایت خاں ایک ایرانی سفیر کلکتے آیا ہوا تھا۔ اس نے غالب
کے اشعار کی تعریف کی اور اساتذہ کے پانچ سات شعر ایسے پڑھے جن میں ہمہ عالم، ہمہ رہ،
ہمہ جا، اس طرح کی ترکیبیں موجود تھیں اس کے علاوہ نواب اکبر علی متولی امام باڑہ اور دوسرے
بااثر آدمیوں نے مرزا کی حمایت کی لیکن مرزا طبعاً صلح پسند تھے اور اب بالخصوص اس

[1] یہ مثنوی بادِ مخالف ہو بہلی لکھی گئی۔ اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری
اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور اشباہ کے پاس بھیجی گئی۔ اگرچہ لوگ ٹھک پٹ کے پر میری کھال اُدھیڑ ڈالی۔"
(عودِ ہندی صفحہ ۱)

مرزا ابھی کلکتہ نہیں پہنچے تھے کہ انہیں اطلاع ملی۔ کہ نواب احمد بخش جن کی تقسیم کے خلاف وہ کوشش کرنے یہاں آئے تھے۔ وفات پا گئے۔ لیکن اُنہوں نے جائداد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا۔ اب مرزا کا تنازعہ ان سے تھا۔ شروع میں جب وہ کلکتہ میں حکام سے ملے۔ تو انہیں کامیابی کی بہت اُمید بندھ گئی تھی۔ اس وقت کلکتہ میں چیف سیکرٹری اینڈریو سٹرلنگ تھے۔ اور اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر سائمن فریزر میکنزی کی ملاقات ان سے دوستانہ طریقے سے ہُوئی۔ اور "معانقہ وعطائے عطر و پان" تک کی نوبت آئی۔ مسٹر اینڈریو سٹرلنگ نے بھی جن کی تعریف میں مرزا کا فارسی قصیدہ موجود ہے۔ نواب گورنر جنرل کے نام غالبؔ کی عرضداشت لے کر اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ اور کونسل میں پیش کیا۔ لیکن جب یہ عرضداشت گورنر جنرل کی کونسل میں پیش ہُوئی۔ تو وہاں سے حُکم ہُوا۔ کہ پہلے یہ درخواست ایجنٹ دہلی کے پاس ہونی چاہیئے۔ چنانچہ مرزا خود تو کلکتہ رُکے۔ اور اپنے وکیل ہیرالال کو دہلی لکھا۔ کہ مناسب عرضداشت پر مسٹر ایڈورڈ کولبروک ایجنٹ دہلی کی سفارش کرا کے کلکتہ بھجوائے۔

جب کہیں مہینوں کے بعد مرزا کا خط دہلی پہنچا۔ اور وکیل کو وکالت نامہ ملا۔ تو سر ایڈورڈ کولبروک دورہ پر چلے گئے تھے۔ اور عرضی پیش نہ ہو سکی۔ ادھر لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل شکار پر مالدہ گئے ہُوئے تھے۔ اور ان کی کونسل کے مختلف ارکان جا بجا پریشان تھے۔ مرزا سے اپنے مقدمے کے متعلق تو کچھ نہ ہو سکا۔ ہاں فارسی شعر گوئی کا جو شوق طبیعت میں راسخ ہو گیا تھا۔ اسے پُورا کرنے کے موقعے ملتے رہے۔

مُشاعرہ | کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ جاری کیا تھا۔ اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قائم ہُوئی تھی۔ جہاں ہر مہینے پہلے اتوار کو مُشاعرہ ہوتا۔

آتا ہے تو طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے ؎

وو مادل لکا تی مارسائی مت　　حدارا ایں جیہ کہ وماجرائی امت
لکاتی لحتے از کاشانہ یاد آر　　دریں جنت اراں ویرانہ یاد آر
دریغا دوطں وا مادۂ چمد　　کہ دیدہ رورق را ندہ چند
ہوس را پائے در دامن شکستہ　　ناامید تو چشم از خویش بستہ
بستہار بیکسی صحرا بتیاں　　سرودئے آتش دل جاگریاں

ار آمات تغافل خو تسما بیست
مدارع تساں ہولئے گل روا بیست

کلکتہ بنارس سے غالب کا ارادہ تھا کہ باقی سفر کشتی سے طے کریں لیکن چونکہ دریائی سفر کے اخراجات بہت زیادہ تھے بنارس سے دو گھوڑے پیدا نہ ہوئے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تا ہدایاں باہدا تساں بنارس صاحب کستی معدائقہ کردند چہ ہر کہ رہ روم تا کلکتہ کم ار صد روپیہ نہ طلبید و تا پٹنہ اہرول ار لست روپیہ حواست ناچار ہماں امیب سوار نا مداں تقہ صحرا حواہم پیمود"

غرض اس طرح وہ بیٹھ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے سہ شنبہ چار شعبان ۱۲۴۳ھ یعنی ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے یہاں اُنھوں نے شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک طرح مکان دس روپیہ کرائے پر لیا۔ اور حصولِ مدعا کے لئے کوشش شروع کی ؎

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ ورمے
ار سینہ داغ دوریٔ احباب شستہ ایم

بنارس پہنچتے وقت وہ علیل تھے۔ لیکن بنارس جس کے پُر فضا مناظر نے حزیں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ غالب کے لئے بھی جنت نگاہ تھا۔ چنانچہ تھوڑے دنوں میں طبیعت بحال ہوگئی۔ اور اب سوائے اس کے کوئی افسوس نہ تھا۔ کہ ان کے عزیز دوستوں نے انہیں بھلا رکھا ہے۔ چنانچہ چراغِ دیر میں لکھتے ہیں ؎

کس از اہلِ وطن غمخوارِ من نیست

مرا در دہر پنداری وطن نیست

اور مولوی فضل حق۔ نواب امین الدین رئیس لوہارو اور نواب حسام الدین حیدر خان کو یاد کر کے افسوس کیا ہے ؎

گرفتم کز جہاں آباد رفتم | مرا ایناں را چرا از یاد رفتم
مگو داغ فراقِ بوستاں سوخت | غم بے مہریٔ ایں دوستاں سوخت

اس کے بعد بنارس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور شاہ جہاں آباد پر اسے ترجیح دی ہے ؎

جہاں آباد گر نبود الم نیست | جہاں آباد بادا جائے کم نیست
نباشد قحط بہرِ آشیانے | سرِ شاخ گلے، در گلستانے
بخاطر دارم اینک گل زمینے | بہار آئیں، سوادِ دل نشینے
کہ می آید بدعوے گاہ لافش | جہاں آباد از بہرِ طوافش

تعالی اللہ بنارس چشمِ بد دور
بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور!

معلوم ہوتا ہے۔ بنارس مرزا کو بہت پسند آیا۔ (چنانچہ چالیس برس بعد بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا) لیکن جب پسماندگان کا خیال

ذیل کی دو دیک قطعہ سہ غزل بھی اس قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

باندہ سے مرزا موداؔ گئے۔ اور مودا سے چلّہ تارا آخری حصۂ سفر کے لئے انہوں نے گھوڑا گاڑی لی لیکن جب انہیں اس سفر میں معلوم ہُوا کہ سواری آسانی سے نہیں ملتی اور جو جانور ملتے ہیں وہ عالب بیم جان سے بھی سست رفتار ہیں۔ تو انہوں نے چلّہ تارا سے کشتی لی۔ اور دریا کے راستے سے الہ آباد پہنچے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جاتے وقت یا واپسی پر کوئی ناخوشگوار ہنگامہ پیش آیا جس کی نسبت ایک فارسی قصیدے میں اشارہ ہے ؎

نفس طرب زارِ بہیب کلکتہ
نگاہ خیرہ رہ ہنگامۂ الہ آباد

بنارس

یہاں ان کا کچھ دیر توقف کا ارادہ تھا لیکن غالباً اس کا موقع نہ ملا اور وہ بنارس روانہ ہوئے۔ جس وقت بنارس پہنچے تو طبیعت ناساز تھی۔ چنانچہ رائے چھمل کو ایک خط میں لکھا ہے ؎

چہ نویسم کہ از صداع نوشتہ‌ہا بر تہیدست اندوہ ام اگر از داخلیات گفتہ آید ہمان پیچ معدہ و امعاست و ہمان شدت جگر و حرارت قلب و ضعف قویٰ و اگر از خارجیات سخن رانده شود مثل ایں بیت قطعہ

معلوم سطوت چھمل عالت حزیں — کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
گو سدرہ ما بہ بنارس رسیدہ است — ما را ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

مرزا ۲۷ جون ۱۸۲۷ء کو بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوگئے۔ اور تین روز میں کانپور پہنچے۔ وہاں سے باندہ گئے۔ یہاں مولوی محمد علی صدر امین نے، باوجودیکہ مرزا سے پہلے تعارف نہ تھا۔ ان سے بڑا نیک سلوک کیا۔ قیام باندہ میں انہیں آرام سے رکھا۔ اور کلکتہ کے بارسوخ آدمیوں کے نام تعارفی خطوط بھی دیئے۔ مرزا کا قیام باندہ اس لئے بھی دلچسپ ہے۔ کہ انہوں نے یہاں سے چند غزلیں اپنے کسی دوست کو بھیجیں۔ جو قلمی نسخہ دیوانِ غالب (نسخہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی) کے حاشیے پر درج ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

ایک اور غزل میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے ؎

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر

بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

قلمی نسخے کے حاشیے پر اور بھی کئی غزلیں ہیں۔ جن کے متعلق دیوان میں تو کوئی تصریح نہیں کہ وہ کب لکھی گئیں لیکن جو سفرِ کلکتہ کا کلام معلوم ہوتی ہیں۔ ایک غزل کا مقطع ہے ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

اور وہاں سے پانچ ہزار روپیہ بیے کا حکم ہوا لیکن لقول ناسخ اس میں سے تین ہزار نواب روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار متوسط یعنی مستی محمد محسن نے عالب سپاہے کو پانچ روپیہ بھی نہ ملے
حالی نے مرزا کے قیام لکھنؤ کی نسبت ایک آدھ لطیفہ لکھا ہے اس سے زیادہ اس قیام کی نسبت کچھ علیحدہ واقفیت نہیں۔ ناسخ سے مرزا کے تعلقات دوستانہ تھے۔ لیکن چونکہ اس نے بادشاہ کا خطاب حقارت سے ٹھکرا دیا تھا وہ ان دنوں بادشاہ کے زیر عتاب تھا اور اس زمانے میں لکھنؤ سے باہر تھا۔ ورنہ قرین قیاس ہے کہ (اگر عالب سے اسکے تعلقات بعد کے نہیں تو) وہ آغا میر کے پاس رسائی میں معید ہوتا +
مرزا نے قیام کلکتہ کے دوران میں فارسی اشعار اور دو اشعار سے کہیں زیادہ لکھے ہیں اس سے اور مرزا کی بعض تحریروں سے خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ اس زمانے میں اُردو تحر لستانم لکھتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں فارسی کا قدر داں کوئی نہ تھا اس لئے قرین قیاس ہے کہ کس جگہ انہوں نے اُردو اشعار زیادہ لکھے ہونگے یہ غزل تو یقیناً قیام لکھنؤ کی یادگار ہے ؎

وان پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

پہلے اس غزل کے آخر میں ذیل کے قطعہ بند اشعار تھے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی   ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
طاقت رنج سفر ہی نہیں پاتے اتنا   ہجر یاراں وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی اُمید   جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

جب معتمد الدولہ کی طرف سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انہوں نے قطعہ مسدرجہ بالا کو بدل کر ذیل کا قطعہ درج دیوان کیا ؎

نازپروردۂ خلوت گہِ آزادگیم کافرم گر بسراپردۂ سلطاں رفتم

من ہم از خیلِ کریمانم و خجلت نبود

گر بدر یوزہ بدرگاہِ کریماں رفتم

اس قصیدے میں جس کی زبان بہت صاف ہے۔ مرزا نے اپنی مصیبتوں اور دہلی سے لکھنؤ جانے کی دردناک داستان لکھی ہے ؎

چہرہ اندودہ بگردِ دمِ آغشتہ بخوں خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنواں رفتم

اضطرابم آئینہ پرواز جلائے وطن است نہ بدل رفتم ازاں بقعہ بل از جاں رفتم

ہم جگر تفتہ زکیں خواہیٔ اغیار شدم ہم دل آزردہ ز بے مہریٔ خویشاں رفتم

ایمن از فتنۂ عیاریٔ عیارانم با چنیں تجربہ کز باریٔ یاراں رفتم

منت از خویش بہ اندازۂ طاقت دارم

کہ بدیں بارِ الم ہائے فراواں رفتم

غالب لکھنؤ سے ۲۷ رجون ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے اور ۱۹ راکتوبر ۱۸۲۷ء کو غازی الدین حیدر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ نصیر الدین حیدر جو اُن کے بیٹے کہلاتے تھے تخت نشین ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت سے یہ قصیدہ بادشاہ کے دربار میں پڑھا گیا۔

(بقیہ صفحہ ۵۳)

نام تھا۔ اور چونکہ ۱۸۲۷ء میں پیش نہ ہو سکا۔ اس لئے بعد میں ناموں کی تبدیلی سے نصیر الدین کے دربار میں پیش کیا گیا۔ قصیدہ کے مضامین سے موخر الذکر نظریے کی تائید ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس قصیدہ کے بعض اشعار گلِ رعنا کے دیباچہ میں منتخب ہوئے ہیں۔ اسلئے غالباً یہ نظریہ صحیح ہے +

مدد کی ضرورت تھی۔ نائب السلطنت اس وقت معتمد الدولہ آغا میر تھے جنہوں نے ملازمت کا آغاز بطور ایک خدمت گار کے کیا تھا لیکن نواب بیگم اور ریذیڈنٹ کی مدد سے بادشاہ پر اس قدر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ کہ اب وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے جیسا کہ غالب کے خطوں سے پتہ چلتا ہے ان کی سیاست تاریخ اودھ کا ایک نہایت تاریک باب ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں بھی شعر گوئی سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی (اور شاید اپنے متوسل حکیم مہدی کی مدد سے جو آتش کے قدرداں تھے) وہ ناسخ کے مربی گنے جاتے تھے مرزا نے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں لکھی لیکن اس نثر کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ ملاقات کے لئے نائب نے جو شرطیں پیش کیں انہیں مرزا باعث شرم اور خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں

"آنچہ در باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوۂ خاکساری بود"

مرزا بقول اپنے اس وقت "نو آموز شیوۂ گدائی" تھے اور شاہان اودھ کی تعریف میں سب سے پہلے جو قصیدہ[۱] انہوں نے لکھا ہے اس میں بھی بار بار اس امر کی طرف اشارہ ہے ؎

---

[۱] مرزا نے یہ قصیدہ دہلی سے پہلے شاہ اودھ کے وکیل راجہ صاحب رام کے ذریعہ منشی محمد حسن کے پاس اس لئے بھیجا کہ وہ اسے دربار اودھ تک پہنچائیں اور دربار بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں۔ مرزا نے اسکے ساتھ منشی محمد حسن کو ایک خط لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں "بعد کہ مرا بہ حاشیۂ ناروائی وسیلۂ مدح گستری اسمایہ سامانی مرا آید۔ کہ خود را گرد آمدہ بنگرم توانم شد و کلسے توانم کرد" اس خط میں تاریخ کتابت یا بادشاہ یا وزیر کا نام درج نہیں۔ اسلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ کہ یہ قصیدہ لکھنؤ کب بھیجا گیا اور کیا شروع سے ہی اس میں نصیر الدین حیدر اور روشن الدولہ کا نام تھا یا پہلے غازی الدین حیدر اور معتمد الدولہ کا

(باقی اگلے صفحہ پر)

اُمید بھی دلائی۔ چنانچہ وہ تیس برس کے ہوں گے۔ جب اس دُور دراز سفر کے لئے گھر سے روانہ ہُوئے۔

لکھنؤ مرزا دہلی سے کب روانہ ہُوئے۔ اس کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں۔ لیکن دہلی سے وہ لکھنؤ گئے۔ اور وہاں سے ان کی تاریخ روانگی ۲۷ رجون ۱۸۲۷ء یا ۲۶ ذیقعد ۱۲۴۲ھ ہے۔ لکھنؤ میں غالب نے کافی عرصے تک قیام کیا۔ اور اگر اس فارسی نثر کی تاریخ تحریر کو جو انہوں نے وزیر اودھ کی تعریف میں لکھی تھی۔ صحیح سمجھا جائے۔ تو یہ ماننا پڑے گا کہ کم از کم[1] "دوم محرم الحرام سے "۲۶ ذیقعد" تک یعنی قریباً ۱۱ مہینے وہ لکھنؤ مقیم رہے۔

مرزا جب لکھنؤ پہنچے تو وہاں غازی الدین حیدر بادشاہ تھے۔ اپنے والد نواب سعادت علی خاں کی وفات کے پانچ سال بعد تک وہ نواب وزیر ہی کہلاتے رہے۔ لیکن جب ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے نظام حیدر آباد اور نواب وزیر اودھ کو بادشاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دیا (اور حضور نظام نے مغلیہ بادشاہ کے احترام کے خیال سے نہ مانا) تو غازی الدین حیدر نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۱۹ء میں بڑی دُھوم دھام سے ان کی تخت نشینی کی تقریب ہُوئی۔ جس کی ناسخ نے تاریخ کہی۔ ع "بگو ناسخ کہ ظل اللہ گر دید"۔ انہیں شعر سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرور تھی۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اُنہوں نے ناسخ کو ملک الشعرا کا خطاب دیکر اپنے دربار کے متعلق کرنا چاہا۔ لیکن ناسخ نے یہ کہہ کر خطاب واپس کر دیا کہ غازی الدین کو نہ تو شاہانِ دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکار انگریزی کا زور و اقتدار۔ مَیں اس کا درباری شاعر ہو کر کیا کروں گا!

جب مرزا لکھنؤ پہنچے۔ تو بادشاہ کی خدمت میں باریابی کے لئے نائب السلطنت کی

[1] اس صورت میں مرزا دوم محرم ۱۲۴۲ھ یعنی اگست ۱۸۲۶ء سے پہلے دہلی سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔

تقاضوں اور ایسی مصیبتوں کا حال کہہ سکتی ہے وہ مدد کرے چنانچہ مرزا دہلی سے فیروزپور جھرکہ
گئے۔ نواب شمس الدین خاں خود ایسی پریشانیوں میں گرفتار تھا اس لئے مرزا کو فیروزپور جھرکہ کیا پڑا
یہاں سے انہوں نے جو خطوط اپنے شاگرد منشی جواہر سنگھ کے والد رائے چھجمل کھتری کے
نام لکھے ہیں ان سے ان کی مصیبتوں کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"چہ نالہ ہا کہ از بیم رسوائی در دل تا بہ زبان نرسید حال مگر دو دیدہ چو بود کہ از دود سینہ
کسوت اشک پوشیدہ از چشم بیروں میدود چارہ رنج بیدلی معدوم و پایان کار نامعلوم
است بیدل است گرفتار قفس مدام افتادہ را چہ حال خواہد بود"

اس کے بعد نواب کے انتظار میں جو بے قراریاں ہوئی ہیں ان کا ذکر کر کے لکھا ہے۔

ہرچند دوری وطن ہم اما قرب وطن نیز قیامت است بہر حال اہل کاشانہ ما و ما شیفتہ ایم
است ہرچہ دیدہ مے شد آسیب چشم بود و ہرچہ شنیدہ مے شود زحمت گوش است
ہم جائے کہ ازاں در نظر بوداں آوردہ ام و دلیت خاک فیروزپور است۔ کہ مرا ایں قامت
ہمطرازی الحان افتاد"

آخر جب خدا خدا کر کے نواب الور کے قضیوں سے فارغ ہوا اور فیروزپور واپس آیا
تو معلوم ہوا کہ دوستوں کے مشورے سے امیدوں کے جو قلعے بنائے ہوئے تھے ان کی
بنیاد ریت پر ہے اور نواب سے کسی طرح کی توقع رکھنا عبث ہے چنانچہ بقول غالب
"نواب صاحب مرا بہ لطف زبانی فریفتند و بکرشمہ بستند کہ ما تلافی ما فات می نمائیم از داد سرند"
اور مرزا کو دہلی ناکام واپس آنا پڑا +

مرزا کو جب نواب صاحب کی طرف سے قطعی مایوسی ہوئی تو انہوں نے نواب کے
خلاف کلکتہ میں اپیل کرنے کا ارادہ کیا بقول حالی ریذیڈنٹ دہلی نے انہیں کامیابی کی

لارڈ لیک کی عملداری ہوئی۔ تو چار سو سواروں کے رسالدار مقرر ہوئے۔ انہیں اس صلے میں علاوہ ذاتی زرِ معاوضہ کے معقول جائداد جینِ حیات ملی تھی۔ لیکن ایک سال کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات پر ان کی جاگیر نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی۔ اور نواب نے اس کے عوض ان کے ورثا کی نگہداشت کا ذمہ لیا۔ مرزا نصر اللہ خاں کی اولاد کوئی نہ تھی۔ اور اُن کے وارث مرزا غالب، مرزا یوسف اور مرزا نصر اللہ کی ماں اور بہنیں تھیں۔ مرزا غالب کا دعوے تھا کہ ان کے اپنے شرکائے حقیقی کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر ہوئی تھی۔ لیکن نواب فقط تین ہزار دیتے تھے۔ جن میں خاص مرزا کا اپنا حصہ فقط ساڑھے سات سو روپیہ تھا۔ شروع شروع میں تو نواب سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ اور نواب ان کی مدد اور خبر گیری کرتے رہے لیکن ۱۸۲۶ء کے قریب اختلافات رونما ہوئے۔ مرزا کے خسر نواب الٰہی بخش معروف جو نواب کے بھائی تھے۔ اسی سال فوت ہوئے۔ اور ممکن ہے ان کی وفات کے بعد نواب سے مرزا کے تعلقات کمزور ہو گئے ہوں۔ مرزا کی عمر اس وقت نیس اُنتیس سال کی تھی۔ اور تمام عمر عیش و عشرت کا عادی رہنے کے بعد اب عیش و مسرت کا سرچشمہ خشک ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے ابتدائی توقعات کی بنا پر قرضے دئے تھے۔ وہ اب مختصر پنشن دیکھ کر تقاضے کر رہے تھے۔ اور سب سے بڑا صدمہ اس موقعہ پہ یہ ہوا۔ کہ ان کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہو گیا +

فیروز پور جھرکہ کا سفر غالب کی حساس طبیعت کے لئے ذریعۂ معاش کی تنگی۔ بھائی کی بیماری۔ قرضخواہوں کے تقاضے اور دوسری مصیبتیں ناقابلِ برداشت تھیں۔ دوستوں نے مشورہ دیا۔ کہ نواب کی خدمت میں جا کر سارا ہو کار[۱] کے

[۱] مرزا نے اس زمانے میں مولینا فضل حق کے نام صنعتِ تعطیل میں جو خط لکھا تھا۔ اُس سے اس سفر کے مقصد پہ روشنی پڑتی ہے۔ (کلیات نثر غالب صفحہ ۶۳-۶۴)

کہ کسے را کہ ہموارہ در سرکار ما مہربان بہائے کلاں نوشتہ باشند بہائے کوچک برنگاری
ہمانا بیمواہی کہ دوستان ما را اعدو گردانی قصہ مختصر او را برانند و منشی قدیم را مواحت
ما عشر وا اما اولی الابصار۔

پنشن کا قضیہ | بھرت پور کا محاصرہ اخیر ۱۸۲۵ء میں ہوا اگرچہ اس زمانے کی تصنیفات سے غالب کی جائداد کے جھگڑوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی لیکن غالباً ان کی ابتدا اسی زمانے میں ہو گئی تھی نواب احمد بخش کے تین صاحبزادے تھے امین الدین نواب ضیاء الدین نیر درخشاں جو غالب کے شاگرد اور عزیز دوست تھے اور ان دونوں کے سوتیلے بھائی اور مشہور شاعر داغ کے والد نواب شمس الدین۔ نواب احمد بخش نے ۱۸۲۲ء میں سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے نواب شمس الدین کو تمام جائداد کا وارث قرار دیا تھا۔ لیکن اس فیصلے سے سب بھائی خوش نہ تھے اس لئے اس میں کچھ ترمیم ہوئی۔ اور فروری ۱۸۲۶ء میں اپنے والد کے ایما پر نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو چند شرطوں کے ماتحت اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں باقی جائداد کا انتظام اپنے ہاتھ لیا۔

چونکہ مرزا کی جاگیر بھی نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ مرزا کو بھی اپنی حق تلفی کا خیال اسی زمانے میں ہوا ہوگا جب نواب احمد بخش نے جاگیر کے متعلق آخری فیصلہ کیا۔ مرزا کو جاگیر اپنے چچا نصراللہ خاں بہادر کے وارث ہونے کی وجہ سے ملی تھی۔ جو پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبیدار رہے اور جب

لہ ملاحظہ ہو کمالہ مطلع از مولینا حامد حسن قادری مرحوم
پتہ نہیں مولینا قبر کس سا پہ کہتے ہیں۔ شمس الدین احمد خاں کے سر پر اولاد کوئی نہ تھی (ص ۵۵)

برکرمفرمائے دوستاں تفوّق دارد۔"

اس سلسلے میں ہائے کوچک اور ہائے کلاں (مہربان اور مہربان) کا قصّہ لکھ کر اپنے زمانے کے امراء اور والیانِ ریاست کے مذاقِ ادب کو بے نقاب کیا ہے :-

"گویند در سرکارِ راجہ بھرت پور در زمانِ قدیم منشی بود۔ از عالمِ ہوش و تمیز بعد مرحلہ دور مراسلاتِ راجہ صاحب باطراف می نگاشت و دعوی ہائے بلند در فنِ انشا داشت۔ قضارا راجہ با او دل بد کرد و خدمتِ انشا بدیگرے تفویض نمود۔ منشی معزول خونہا میخورد و باخود را اہار(؟) میزد تا مگر انگشتے بر حرفش نہد۔ و بازارِ او را شکستے دہد۔ ناگاہ روزے اتفاق چناں افتاد کہ منشی حال خطے از طرف راجہ بیکے از دوستانِ راجہ کہ راجہ را با او نیازے بود نوشت چمل عنوان درست کرد و سرنامۂ بنگاشت منشی معزول خیرہ خیرہ در عنوانِ مکتوب نگریست و سرے جنبانید و تبسّمے کرد۔ راجہ ازیں ادا بدگمان شد۔ اما توضیحے بمیان نیاورد و بعد برہم زدنِ ہنگامۂ بزم منشی معزول را در خلوت خواند۔ و باعثِ آں ادا پرسید۔ منشی بعد ادائے مراسم مدح و ثنا گفت۔ کہ بندگانِ پروردۂ نعمت و ہوا خواہِ دولتیم۔ تازہ آیندگان را بقدر پاسِ نمک و حبِ رونقِ سرکار چہ خواہد بود۔ خاصۂ ایں مردم اہلِ قلم کہ از شاہجہاں آباد اند۔ حقِ نمک نگاہ ندارند۔ و خیرِ آقائے خود نجویند۔ ایں منشیِ تازہ بہ فلاں سرکار کہ حضور ہموار بدلجوئی و بتعظیم او بکوشند۔ و دوستی او را موجب سودِ کارہا و صلاحِ حال ہا میدانند۔ مہربان بہائے کوچک نوشتہ حالانکہ من ہموارہ تعظیماً مہربان بہائے کلاں می نگاشتم۔ اکنوں کہ تفاوت در تعظیم کہ عبارت از تبدیلِ ہائے کلاں بہائے کوچک است۔ پدید خواہد آمد۔ البتہ او در دلِ خود خواہد آزرد و رنجش او برائے سرکار نیکو خواہد بود۔" راجہ برآشفت و منشیِ حال را طلب داشت و عتاب کرد۔ و گفت تو کہ باتی

وقت بھی موجود تھی چنانچہ وہ فارسی لکھنے والے کو ہدایت کرتے ہیں۔ "اندازۂ خوبیٔ زباں نگاہدارند واں پارسی آمیختہ تازی و ادکتا کش تصرفات ہندی بامابی پارسی الٰہیس صالح بگماپارد"۔

یہ رسالہ جو مرزا نے فقط تین دن میں ختم کر دیا تھا بیشتر خطوط کے القاب و آداب اور دعائیہ فقروں کا مجموعہ ہے۔ لیکن ان کے شروع میں مرزا نے بعض بڑے کام کی باتیں لکھی ہیں۔

"نامہ نگار را باید کہ نگارش از گردش زود تر بر گردد و بیشتر باریک گفتن دہد۔ و مطلب را اسان روشن گرداند کہ دریافتن آں دشوار نبود و اگر مطلبے چند داشتہ باشد در تقدیم و تاخیر شرف نظمی بکار برد و اناں بہ ہیر و کہ در سخن گرہ در گرہ گردد و احترانہ معما ہمی گردد و رہنما استعارہ پائے لغات مشکلہ نامانوس درعبارت درج نکند و در سر نوروی عاشت رتبۂ مکتوب الیہ در نظر دارد تا توا در سخن را درازی ندہد وار تکرار الفاظ محترز باشد و بیشتر بمذاق اہل روزگار حرف زند و از احاطۂ قواعد و قوانینے کہ قرار دادۂ اہل مردم است بدر نرود ودیوستہ در آں کوشد کہ سادگی و لطری شعار او گردد۔

در اقسام مکاتیب خاصہ در خطوط اعتراضے کہ بحکام نویسد و مشتمل بر معاملات باشند از اغلاق و اغراق محترز اجتناب واجب داند و سخن باستعارہ و اشارہ نگرا رود و رم گوید و صحیح گوید و آسان گوید"

آگے چل کر اس امر پر بڑا زور دیا ہے کہ دوستانہ خطوط میں بھی حفظ مراتب کا خیال رکھا جائے لکھتے ہیں۔

"پوشیدہ مباد کہ در میان احباب مراسلات متعارف است عموماً القاب ہا گذاشتہ می آید ہر کہ در خطوط حفظ مرتبہ باشد رعایت آں ملحوظ باید داشت و آں اینست کہ در میان متعدداں قبیح بر مشفق و مشفق بر مہرباں مے چربد و کرم نامۂ علما

تھے۔ غالب کی نثر کی سب سے پہلی تصنیف اسی زمانے کی یادگار ہے ؂

فارسی رسالہ | مرزا علی بخش نے جو غالب کی بیوی کے بھائی بھی تھے۔ غالب سے استدعا کی۔ کہ فارسی خط و کتابت کے قواعد اور القاب خیریت وغیرہ کے موزوں فقرے ایک جگہ جمع کر دیں۔ چنانچہ مرزا نے ایک مختصر رسالے میں جو ان کی کلیاتِ نثر فارسی میں موجود ہے۔ فارسی مکتوب نویسی کے قواعد جمع کئے ہیں۔ یہ رسالہ صاف اور سلیس زبان میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خط و کتابت کا جو نفیس اسلوب مرزا نے تیس برس بعد اردو زبان میں اختیار کیا (اور جس سے ان کے اکثر فارسی خطوط عاری ہیں) اس وقت بھی انہیں پسند خاطر تھا۔ وہ اس رسالے میں لکھتے ہیں۔

"مکتوب الیہ را بلفظے کہ فراخور حال اوست آواز دہیم و زمزمہ سنج دعا گردم القاب و آداب گوئی و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است۔ و بحیگان حشو را دفع نہند نامہ نگار را باید۔ کہ نگارش را از گذارش دور تر برده بستن را رنگ گفتن دہد"۔

فارسی زبان میں انہوں نے ایک حد تک رواجِ عام کی پیروی کی ہے۔ لیکن اردو رقعات میں مندرجہ بالا اصولوں پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ اور بقول خود "مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ دور سے بیٹھے بزبان قلم باتیں کیا کیجئے"۔

اس رسالے سے بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ ہندوستانی فارسی نویسوں کی زبان دانی سے جو نفرت مرزا کو تمام عمر رہی۔ اور جس نے بعض اوقات تلخ بحث کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس

بقیہ صہ ۴۵

۶ فروری ۱۸۲۶ء کو انگریزی فوج نے الور کے نئے راجہ اور نواب بخش کا قضیہ چکانے کے لئے الور کا کوچ کیا۔ اور یہ وہی زمانہ تھا۔ جب مرزا نواب سے مدد لینے کے لئے فیروزپور جھرکہ گئے ہوئے تھے (کلیات نثر غالب صفحہ ۱۵۶)

دیوانِ غالب کا بھوپالی نسخہ ۱۸۲۱ء میں یعنی اس وقت مرتب ہوا جب غالب[1] دنیا
سے بالکل آزاد تھے۔ غالب اس وقت نواب احمد بخش کے ساتھ رہتے تھے۔ نواب احمد بخش
ریاست الور کے وکیل تھے۔ اور انہوں نے مرہٹوں کے خلاف لارڈ لیک کو ریاست کی طرف
سے مدد دی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں لارڈ موصوف نے ان خدمات کے عوض میں انہیں فیروزپور جھرکہ
کا علاقہ جو اب ضلع گڑگاؤں کا حصہ ہے تفویض کیا تھا۔ نواب نے مہاراجہ الور اور سرکار
انگریزی کے درمیان تعلقات قائم کرکے ریاست کی بھی بڑی خدمت کی تھی چنانچہ مہاراجہ
نے اس کے صلے میں انہیں پرگنہ لوہارو بخش دیا تھا۔ ان تعلقات اور دوسرے کاموں
کے سلسلہ میں نواب کو بسا اوقات انگریزی حکام سے ملنا اور ان کا ساتھ دینا پڑتا تھا چنانچہ
جب انگریزی فوج نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں مہاراجہ بھرت پور کے خلاف چڑھائی کی تو نواب بھی
انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ اور ان کا برادرزادہ مرزا علی بخش اور غالب بھی ان کے ہمرکاب

---

[1] کلیاتِ نثرِ غالب صفحہ ۴۷ لیکن مرزا کا غالباً اب دیر تک نواب کے ساتھ جہاں سے بھرت پور کی فتح کے بعد
باقی ص ۳۲۶ پر

پڑے گا۔ مرزا کی طبیعت میں یہ رجحان جیساکہ ان کے خاص طرزِ شاعری (یا ان کے بھائی کی علالت سے بھی) خیال کیا جاسکتا ہے۔ عوام سے بہت زیادہ تھا۔ اور نفسیات کے اصول کے مطابق ایسی انتہائی انفرادیت کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں کہ یا تو انسان قناعت اور خودداری کو حد سے بڑھاکر اور اپنے سوا باقی سب کو جاہل اور ہوش سے عاری سمجھ کر سوسائٹی سے اس طرح بیگانہ ہو جائے۔ کہ سوسائٹی کے نزدیک وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے اور یا دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو ان حدود میں رکھے۔ کہ اپنا امتیازی رنگ بھی قائم رہے اور دوسروں کے نزدیک سٹری پن بھی نہ ہو۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی تھی کہ مرزا کے طبعی رجحانات پر ان کی عقل سلیم غالب آئی۔ اور خوش قسمتی سے انہیں ایسے دوست میسّر آئے۔ جن کی صحبت نے ان کی بے قاعدگیاں ہموار کر دیں۔ شخصی انفرادیت مٹانے اور مناسب حسن تناسب سکھانے کے لئے سوسائٹی کا سب سے بڑا حربہ ظرافت ہے۔ جسے کنجِ تنہائی سے بزمِ احباب زیادہ راس آتی ہے۔ اور جب مرزا کا حلقۂ احباب وسیع ہوگیا۔ اور ساتھ ساتھ مشاہدے اور تجربے سے طبیعت کی زود حسی کم ہوئی۔ تو اُن کی انفرادیت بھی خوشگوار حدود میں آگئی۔ اور عجیب و غریب خیالات اور طبیعت کی یبوست کی جگہ خوشگوار خیالات اور ظرافت نے لے لی:۔

حاتی تھی۔ اور ان کے کلام میں مضامین کی وہ تنادانی اور تنوع نہیں جو مرزا کے کلام میں ہے جن کی روایات کا سلسلہ حزیں بیدل ظہوری عرفی اور نظیری کے واسطے سے امیر خسرو تک پہنچتا ہے۔ مرزا نے آغاز بیدل کے رنگ سے کیا۔ لیکن جب اُنہوں نے فارسی شاعری کا زیادہ مطالعہ کیا۔ اور شیخ علی حزیں نے مُسکرا کر ان کی بے راہ روی انہیں جتائی۔ اور طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ تھا۔ فنا کر دیا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا تو ان کے کلام میں ان شعرا کی خصوصیات زیادہ آگئیں اور وہ تشبیہوں کی غرابت اور پیچیدہ تراکیب کے اس سراب سے بچ نکلے۔ جس میں بیدل کی تعریف فنا ہوتی تھی۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں دکھائیں گے۔ مرزا کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت انسانی فطرت کی واقفیت ہے۔ جو اردو کے اور شعرا میں نہیں لیکن آخر مرزا کا نفسیاتی تعمق اکثر شعرا کی وہی معاملہ بندی ہے جو عرفی اور دوسرے شعرا میں تو محبت کے چند پہلوؤں تک محدود تھی۔ لیکن جسے مرزا نے وسعت دے کر تمام انسانی فطرت کا مطالعہ بنا دیا۔ مرزا کو دہلی آنے سے پہلے ہی فارسی شاعری سے لگاؤ تھا لیکن فارسی اشعار پڑھنے اور سمجھنے کا زیادہ موقع انہیں یہاں آنے کے بعد ہی ملا ہوگا۔ اور ہمارے خیال میں ان کی شاعری پر خارجی اثرات میں سب سے اہم فارسی شعرا کا مطالعہ اور ان کی پیروی ہے +

ذہنی ارتقا اس کے علاوہ مرزا کی شاعری میں جو انقلاب آیا وہ بڑی حد تک اس انقلاب کا عکس تھا جو مرزا کی ذہنی کیفیت میں وقوع پذیر ہوا۔ ہر اس زمانے میں مرزا کی طبعی انفرادیت بہت کم ہو گئی۔ عموماً شباب میں انسان اپنے تئیں دنیا کا مرکز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ میری رائے اور پسند کے آگے سب کو سر جھکانا

عام ایرانی ہندوستانیوں کی فارسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مرزا بھی شروع ہی سے "ہندی زبانانِ فارسی نویس" کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ہرمزد کی وجہ سے پارسیوں کے عقائد سے بھی مرزا کی واقفیت بڑھ گئی۔ اور مذہب کے متعلق عام طور پر ایک آزاد خیالی پیدا ہوگئی۔ ہرمزد کے عقائد کے متعلق ہمیں پوری خبر نہیں۔ لیکن عجب نہیں کہ وہ شیعہ ہو۔ اور اپنے خاندان کے طریقے کو چھوڑ کر مرزا کا شیعہ ہونا اسی کے زیرِ اثر ہو۔

فارسی شعرا

دہلی آنے کے بعد غالبؔ کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس کی ایک اہم وجہ ہندوستان کے فارسی شعرا کا غائر مطالعہ اور ان کی تقلید ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ مرزا کی شاعری کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب بجائے میرؔ اور سوداؔ کے انہیں بیدلؔ اور عرفیؔ کا جانشین سمجھا جائے۔ بیشک انہوں نے اُردو شعر لکھے۔ لیکن کسی اُردو شاعر کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اردو میں بھی پہلے بیدلؔ اور بعد میں عرفیؔ اور نظیریؔ کی طرز میں اشعار لکھے۔ وہ میرؔ کے مداح تھے لیکن میرؔ کی غزلوں پر بھی اُنھوں نے جو غزلیں کہی ہیں۔ وہ میرؔ نہیں بلکہ بیدلؔ کے رنگ میں ہیں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ ان کے اس زمانے کے اشعار کی زبان اُردو ہے۔ لیکن مضمون اور زبان کی تمام خصوصیات فارسی شاعری کی ہیں۔ مرزا اپنے اُردو اور فارسی کلام میں وہ حدِ فاصل نہیں رکھتے تھے۔ جو اس زمانے میں فارسی سے عوام کی ناواقفیت کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ وہ گلِ رعنا کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے اُردو اشعار لکھنے میں بھی وُہی طریقہ اختیار کیا۔ جو فارسی شاعری میں روا رکھا تھا۔ ان کی شاعری بقول ان کے ایک باغ کی طرح ہے۔ جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک اُردو اور ایک فارسی۔ اور مرزا کے مقابلے میں باقی اُردو شعرا کے کلام کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان شعرا کی نظر دِلّی سے آگے نہ

اسی طرح اپنی شاعری کا رُخ بدلا۔ منتخب دیوانِ ریختہ کے متعلق آزاد کا بیان ہے کہ یہ انتخاب
مولوی فضل حق اور مرزا خانی کوتوال دہلی نے کیا۔ مرزا کے اپنے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے خیال
ہوتا ہے کہ انتخاب خود مرزا غالب نے کیا۔ غالباً یہ خیال درست ہے لیکن مرزا کے ابتدائی
اور بعد کے طرزِ شاعری میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ یہ بیان بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ مرزا
کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی۔ اُس میں کسی خارجی رہنمائی کو بھی دخل تھا اور بقول مرزا
اُنہوں نے ایسا طرزِ خاص اس لئے ترک کیا کہ اسے یاروں نے چلنے نہ دیا۔ (ملوہ مصر)

مرزا کے اس زمانے کے احوال کے متعلق ہمیں پوری واقفیت نہیں لیکن ان کی
شادی نواب الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو شعر کے بڑے دلدادہ تھے
اور جن کے اکثر شعرا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لئے یقین ہے کہ مرزا بھی دہلی کے سب
بڑے بڑے شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے ہوں گے۔ معروف ذوق کے شاگرد تھے
اور زبان میں صفائی اور روزمرہ کے بڑے مداح تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں مرزا کی شاعری
بہت ناپسند ہوگی۔ لیکن یہ بھی قرینِ قیاس ہے کہ ان کی صحبت کے زیرِ اثر زبان کی صفائی
کی طرف مرزا زیادہ متوجہ ہوئے ہوں گے۔ معروف خود بھی شاعر تھے۔ نئی نئی زمینیں نکالتے
اور ان میں شعر کہتے اور کہلواتے۔ چنانچہ مرزا کی وہ غزل جس کا حسبِ ذیل شعر مشہور ہے ؎

بلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

انہی کی نکالی ہوئی زمین میں ہے اور اس میں غالب کے علاوہ دہلی کے اور مشہور شعرا
نے بھی طبع آزمائی کی۔

ہرمزد | ہرمزد کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں کہ مرزا دہلی آئے تو وہ ہمرکاب تھا۔ اس کی صحبت
سے مرزا کو فارسی زبان میں وہ ملکہ حاصل ہو گیا۔ جو عموماً اہلِ زبان کا حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح

اس کی طبع آزاد خیالی اور راسخ نہ ہوگئی ہو۔ شاہ صاحب اور مرزا کے خیالات کی راہیں مختلف تھیں لیکن جس طرح انہوں نے شاہ صاحب کو مذہب یا رسوم و معاشرت میں تقلید کی مخالفت کرتے دیکھا۔ اسی طرح خود فنِ لغت اور فنِ شعر گوئی میں اُستادوں پہ آزادانہ نکتہ چینی کی۔ اور جس طرح شاہ صاحب بڑے بڑے بزرگوں کے نام گنا کر کہتے تھے۔ کہ آخر وہ انسان تھے۔ اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی انداز سے غالب نے بھی کہا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے وہ سب سچ نہیں۔ اور ہر پُرانی لکیر صراطِ مستقیم نہیں ہوتی ؎

سخن سنج احباب ان دونوں تحریکوں کا جو اثر مرزا پر ہوا ہوگا۔ وہ تو غیر محسوس اور کسی حد تک قیاسی ہے۔ لیکن دہلی آنے سے جو اثر ان کی شاعری پر ہوا۔ وہ بہت واضح اور نمایاں ہے۔ آگرے میں شعرا اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی۔ جو دہلی میں تھی۔ اور غالب کے عجیب و غریب اشعار پر جب یہ لوگ معترض ہوتے۔ تو وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے آگرے میں ایک رُباعی لکھی تھی ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　ہوتے ہیں ملول اس کو سن کے جاہل[۱]
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن جب مرزا دہلی آئے۔ اور مولینا فضل حق اور دوسرے مُسلمہ اُستادوں نے انہیں ان اشعار کے حُسن و قبح سے آگاہ کیا۔ تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور جس طرح انہوں نے مندرجہ بالا رباعی کا دوسرا مصرع تبدیل کیا۔ اور اپنے معترضوں کو بجائے "جاہل" کے "سخنورانِ کامل" کہا۔ یا اس زمانہ کے ایک فارسی شعر میں لکھا ؎

اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت　　ہر زہ منشابِ پئے جادہ شناسان بدا

[۱] تذکرۃ الشعرا مؤلفہ نواب اعظم الدولہ سُرور

اہل الرائے یا اس تحریک کے طرف دار تھے یا مخالف۔ شاہ نصیر دہلوی نے جن کی مضحکہ خیز
خوش اعتقادی کی کئی مثالیں آزاد نے آب حیات میں دی ہیں۔ اس تحریک کے راہنماؤں
کے خلاف نظمیں لکھیں برخلاف اس کے مشہور شاعر مومن مولانا سید احمد بریلوی کے
مرید تھے اور کلیات مومن کے کئی اشعار مولانا کی تعریف میں ہیں۔ غیر مقلدین کے سب سے
نامور حامی شاہ اسمٰعیل شہید اور سرسید احمد خاں تھے مقلدین کے پُرجوش ترجمان مولوی
فضل حق تھے جو قدیم علم پرور خیرآبادی خاندان کے رکن اور غالب کے نہایت عزیز دوست تھے
مرزا نے بھی ان مباحثوں میں عملی دلچسپی لی اور ایک رسالے میں مولوی فضل حق کے ایما پر
عقائد وہابیہ کے خلاف ایک فارسی مثنوی لکھی۔ لیکن جیسا کہ حالی نے یادگارِ غالب میں
ثابت کیا ہے ان کا اپنا نقطۂ نظر شاہ اسمٰعیل سے بہت ملتا تھا اور شروع میں انہوں نے
اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ اس مثنوی کے مطالب کافی اہم ہیں لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ
اہم وہ ہم آہنگی ہے جو شاہ اسمٰعیل اور مرزا کے عام اسلوب خیال میں تھی۔ شاہ صاحب کے
مذہبی عقائد کیا ہی تھے لیکن آخر ان کی تصانیف کا اہم ترین پہلو تقلید کے خلاف جہاد تھا
بیشک وہ قرآن شریف اور مستند احادیث کے قائل تھے لیکن عوام جس کو اسلام سمجھتے
تھے وہ یا تو رسوم و عقائد کا وہ طومار تھا جو مقامی اثرات سے اسلام کا جزو بن گیا تھا یا
ائمۂ اربعہ کی کورانہ تقلید۔ شاہ اسمٰعیل ان میں کسی کے بھی قائل نہ تھے۔ اور جب ہم شاہ
صاحب کی تصانیف پڑھتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ جس آزادی اور جرأت سے وہ رائے عامہ
اور مسلمہ ہستیوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ ناممکن ہے کہ اس کا اثر غالب پر نہ ہوا ہو[۱]۔ اور

[۱] مولانا شبلی نے اس زمانے کی ایک تعلیم الرتبہ شخصیت پر اثر ڈالا حالی سرسید کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے
ہوئے لکھتے ہیں۔ مولانا اسمٰعیل شہید نے ان کے خیالات کی بہ زیادہ اصلاح کی اور انہیں کسی قدر تقلید
کی بندشوں سے آزاد کیا۔

جنرل سلیمن نے ایک اور جگہ لکھا ہے :۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان فلسفہ ادبیات اور دوسرے علوم و فنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانے میں ان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انہیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے"۔

ان سطور سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اُس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم سے آکسفورڈ یونیورسٹی کے موجودہ کلاسیکل کورس سے کسی طرح پست نہ تھا۔ اور اس کے علاوہ اگر درخت فقط اپنے پھل سے پہچانا جاسکتا ہے تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ جن معلموں کے حلقۂ درس سے سرسید۔ حالی۔ آزاد۔ داغ۔ شیفتہ (اور غالب) دستارِ فضیلت باندھ کر نکلیں۔ وہ اپنے درس و تدریس پر جتنا بھی فخر کریں۔ کم ہے۔

وہابی تحریکِ اصلاح

اس عام علمی اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ حضرت سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کی تحریک اصلاح تھی جسے سرسید احمد نے لوتھر کی تحریک ریفارمیشن کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور حضرت بریلوی کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ جس طرح لوتھر نے یورپ کے بڑے حصے کو پوپ کی غلامی سے نجات دلائی اسی طرح یہ تحریک بھی تقلید اور ذہنی غلامی کی مخالفت میں تھی۔ اور حضرت سید احمد بریلوی نے ان فضول اور مضر رسموں کے خلاف جو ابتدائے زمانہ سے ہندوستانی معاشرتی زندگی کا جزو ہو گئی تھیں۔ کوشش کر کے نہ صرف مذہبی بلکہ معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی شمالی ہندوستان پر بڑا احسان کیا۔ ہمیں اِس تحریک کے متعلق مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن غالب کا ماحول سمجھنے کے لیے اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب دہلی میں تمام

ایرازمس (Erasmus) سے بہت مشابہ ہیں اور جن کے درس کے لئے کشمیر،
افغانستان اور بلخ و بخارا سے طلبہ کھچے آتے تھے۔ ان کے علمی تبحر اور انصاف پسندی کے آگے
سب سر جھکاتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صرف وہ علم و فضل میں بے نظیر
تھے بلکہ زمانے کی نبض بھی خوب پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب سرکار انگریزی نے دہلی کالج قائم
کیا اور لوگ وہاں اولاد بھیجنے کے متعلق متامل تھے تو شاہ صاحب نے بڑے زور سے
وہاں تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی اور علیگڈھ کالج قائم ہونے سے کوئی پچاس سال پہلے
مغربی اور سرکاری درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے حق میں فتویٰ دیا[1]۔

جنرل سلیمن جو ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ
رکھتے ہیں اور جنہیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے
زیادہ ہوا تھا اس زمانے کی تعلیمی حالت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہونگی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے
مسلمانوں میں ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا مقدور ہو جاتا ہے وہ اپنے لڑکوں
کو اسی طرح تعلیم دیتا ہے۔ جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو اور جو علوم ہمارے
بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں وہی یہ لوگ
عربی اور فارسی زبانوں میں سیکھتے ہیں اور سات سال کے درس کے بعد ایک
طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے
بھرا ہوتا ہے دستار فضیلت باندھتا ہے اور اسی طرح روانی سے سقراط ارسطو
افلاطون بقراط جالینوس اور بو علی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے جس طرح آکسفورڈ
کا کامیاب طالب علم"

[1] اسباب غدر مصنفہ سرسید

وہاں نئی روح پھونک دی تھی۔ اور علمی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔
مرزا جس وقت دہلی آئے۔ یہاں بھی وہی حالات رونما تھے۔ جنہوں نے دو صدیاں پہلے
یورپ کی کایا پلٹ دی تھی۔ انگلستان میں چھاپہ خانہ کی ابتدا سولھویں صدی میں ہوئی۔ اور
اس کے قائم ہونے کے بعد ہی علم صحیح معنوں میں عام ہونا شروع ہوا۔ دہلی میں چھاپے
کے آغاز کا قریب قریب یہی زمانہ تھا۔ اور یہاں بھی اس سے اشاعتِ علم کو وہی فائدہ پہنچ
رہا تھا۔ جو انگلستان میں ہوا۔ "ریناسینس" کا ایک اہم واقعہ بائبل کا انگریزی ترجمہ ہے۔
جس کی ابتدا میں بے حد مخالفت ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے وکلف اور اس کے ساتھیوں کو سخت
ایذائیں پہنچائی گئیں۔ ہندوستان میں بھی قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کرنے پر حضرت شاہ ولی اللہؒ
کو ننگی تلواروں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ان کی جرأت اور قابلیت سے ۱۷۲۷ء ہی میں ہندوستان
میں وہ مرحلہ طے ہو گیا جس کے لئے ترکی کو دو صدیاں اور انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جس طرح مغربی
ریناسینس کی ایک اہم خصوصیت عام ملکی زبانوں کی ابتدا تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی
فارسی اور عربی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ اور چونکہ علما زمانے کی رفتار پہچانتے تھے۔ اس لئے
انہوں نے نئی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اردو نثر کی سب سے
پہلی کتابوں میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ تھا۔ جسے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے شاہ
رفیع الدین نے ۱۸۰۳ء میں دہلی سے شائع کیا۔

علاوہ ازیں جس طرح مغربی ریناسینس کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت درس و
تدریس کا بلند معیار تھا۔ دہلی بھی اس زمانے میں اپنے معلموں اور مدرسوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق
تھی۔ بالخصوص شاہ عبدالعزیزؒ کی ذاتِ والاصفات کی موجودگی سے جو اپنی سلامت روی۔
صحیح قوتِ فیصلہ اور علمی قابلیت کی وجہ سے مغربی ریناسینس کی ایک قابلِ احترام ہستی

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم   لیکن اس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جس کے تو آباد تھا دنیا میں اے ملکِ ارم   بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم

ہند میں جاری تجھی سے طبِ یونانی ہوئی
شہر شہر اس فن کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی

لے کے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم   جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم   کھیتیوں پر تیری اڑ آتے تھے اکثر جھوم جھوم

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری سرحد میں رہا ہے علم و دانش کا سماں

وقتِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا   بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں پھر تری اُگلے وہ لعلِ بے بہا   جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا

عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و حشمت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی   پر نہ کی عزت میں پھر بھی تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گزاری تیرھویں تو نے صدی   پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دورِ اکبری

علمِ دیں و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر تو نے اپنی چار سو شہروں میں دھوم!

جن لوگوں نے انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک کی ذہنی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے
وہ ریفارمیشن (Reformation یعنی اصلاحِ مذہب) اور رینیسانس (Renaissance
یعنی نشاۃِ ثانیہ) کی دو تحریکوں سے واقف ہوں گے جنہوں نے سولھویں صدی میں

ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر اس زمانے کے شعرا میں شاہ نصیر۔ ذوق۔ مومن۔ علما میں شاہ عبدالعزیزؒ۔ شاہ اسمٰعیلؒ۔ شاہ عبدالقادرؒ حضرت سید احمد بریلویؒ۔ مولینا فضل حق خیر آبادی۔ اطبا میں حکیم محمود خاں۔ حکیم حسن اللہ خاں حکیم رضا خاں اور نقادوں میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ موجود تھے۔ (اور یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کے زیر اثر سر سید۔ حالی۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ اور داغ کی تربیت ہوئی۔ جنہوں نے خود پرانے نظام کے پروردہ ہونے کے باوجود بیس سال کے عرصے میں شمالی ہندوستان کو ایک نیا نظام تعلیم، نیا لٹریچر اور مذہب کی مدافعت کے لئے نئے ہتھیار دے دئے)۔ تو ہمیں غالب کے اس ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا وہ خود ایک جزو تھا۔ اور جس کی ناواقفیت کی وجہ سے عوام کے نزدیک غالب کی شخصیت ایک معمہ بن کر رہ گئی ہے +

حالی اُس زمانے میں دہلی آئے۔ جب یہاں بہت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی باغ میں پھول اور پھولوں کے گرد بلبلیں موجود تھیں۔ چنانچہ اُنھوں نے حکیم محمود خاں کا جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں اس زمانے کی نہایت موثر تصویر کھینچی ہے ؎

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم ‏ ‏ اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اِک عالم میں دھوم

تھے ہنر ور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم ‏ ‏ تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم

زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا

نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علم و دیں ‏ ‏ جیسے اگلی تجھ میں تھے۔ عالم نہ تھے ایسے کہیں

ہند میں تھا جو محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں ‏ ‏ تھی محدث خیز اے پائتخت تیری سرزمیں

تھا الفقہ بھی مُسلّم تیری خاکِ پاک کا

بیہقیِ وقت تھا اِک اِک فقیہ اِس خاک کا

سٹر آرچیبالڈ سیٹن کی پالیسی قائم نہ رکھی گئی لیکن قلعہ میں پھر بھی کوئی مداخلت نہ ہوئی اور شہر میں شاہی جلوس اور سواری کا اہتمام اسی شان سے جاری رہا۔ جو اس سے پہلے تھا علاوہ ازیں اگرچہ بادشاہ کی ہستی شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی پھر بھی وہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہتے چنانچہ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو ان کی ملاقات بادشاہ سے اس وجہ سے نہ ہوسکی کہ بادشاہ نے ان کو اپنے برابر کرسی دینا قبول نہ کیا! +

علمی چہل پہل قلعہ سے قطع نظر اس وقت شہر دہلی کی حالت موجودہ زمانے سے بہت مختلف تھی شہر کے گرد فصیل تھی۔ اور سارا شہر اس کے اندر آباد تھا شہر کے دروازے شام کو بند ہوتے اور صبح کو کھول دئیے جاتے جہاں شہر دہلی کا موجودہ سٹیشن ہے وہاں اس زمانے میں ایک آباد محلہ تھا جہاں امراء اراکین سلطنت رہتے تھے چاندنی چوک کے درمیان اس زمانے میں نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف خوشنما سایہ دار درخت تھے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دہلی میں مرہٹوں کا اقتدار رہا شہر اور شہر کا گرد و نواح لٹیروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ نہ تھا جہاں جان و مال خطرے میں ہو وہاں علم و فن کا زوال ہوتی ہے چنانچہ دہلی میں جو کوئی مشہور شخص کسی علم و فن میں نام پیدا کرتا اُسے لکھنؤ کی کشش یہاں سے کھینچ لے جاتی لیکن جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا نظم و نسق قائم ہوا تو نہ صرف شہر کی آبادی و خوشحالی بہت بڑھ گئی بلکہ علم و فن کا جو شیرازہ بکھرا ہوا تھا وہ پھر ایک دفعہ بندھ گیا۔ اور بقول حالی "دار العلماء دہلی میں چند ایسے باکمال جمع ہو گئے۔ جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے"
سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں اس زمانے کے اکابر علماء اور شعر کے حالات لکھے

لال قلعہ | مرزا کا دہلی میں آنا جانا اُس وقت شروع ہُوا۔ جب شاہ عالم ثانی جنہیں غلام قادر روہیلے نے آنکھیں نکال کر اندھا کر دیا تھا۔ تختِ شاہی پر متمکن تھے۔ روہیلوں کی بغاوت کے بعد دہلی میں مرہٹوں کا اقتدار بحال ہُوا۔ تو سندھیا نے انہیں قید خانے سے نکال کر پھر بادشاہی تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کے بعد جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے سندھیا کو شکست دی اور دہلی میں انگریزی نظم و نسق قائم ہُوا تو شاہ عالم ثانی کو بدستور تخت نشین رہنے دیا گیا بلکہ مورخین لکھتے ہیں کہ بعض باتوں میں ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ مسٹر آرچیبالڈ سٹین ریذیڈنٹ دہلی۔ بادشاہ کے جذبات کا ہر بات میں خیال رکھتے تھے اور قلعہ اور شہر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی۔ بادشاہ کی جو خاصہ کی جاگیریں تھیں ان کی آمدنی بڑھ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں سکوں پر بادشاہ ہی کا نام ہوتا تھا۔ اور جاگیرداروں اور رئیسوں کی وراثت پر بادشاہ کی مہرِ توثیق کو ہی سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی۔ شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہُوئی اور ان کی بجائے شاہ اکبر ثانی تخت نشین ہُوئے۔ اس کے زمانے میں

شروع شروع میں مرزا نے شعر و سخن میں امتیاز اور ناموری حاصل کرنے
کے لئے سہل الحصول لیکن مضر اور کم مایہ طریقہ اختیار کیا اور یہ خیال کیا کہ طرز بیدل
میں جدت، بلکہ غرابت حاصل کرنے سے میں شعرا میں بے نظیر ہو جاؤں گا۔ مرزا کے
ابتدائی اشعار، ایک حد تک "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" کے مصداق ہیں لیکن وہ ازل سے
اصلاح پذیر طبیعت اور مضبوط ہوش و خرد لائے تھے۔ انہوں نے چند سالوں میں ہی
سمجھ لیا کہ یہ راستہ بحر معانی کی طرف نہیں بلکہ ایک سراب بے آب کی طرف راہنمائی کرتا
ہے۔ چنانچہ انہوں نے طبیعت کی باگ عام پسند طرز شاعری کی طرف موڑی جس میں
امتیاز دیر سے اور محنت اور سخت جانفشانی کے بعد حاصل ہوتا ہے لیکن جس میں فروغ حقیقی
امتیاز اور دائمی شہرت کا پیش خیمہ ہوا۔
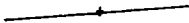
ان کے دل میں ہمیشہ کسی نہ کسی بات کا احساس کمتری ہوتا ہے۔ تو ان کے توسن ہمت کے لیے تازیانہ کا کام دیتا ہے۔ اور اس کی بدولت وہ اس بات کی کوشش اور محنت گوارا کر لیتے ہیں جس سے عام لوگ دل چراتے ہیں۔ مثلاً نپولین کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بالشت سے ٹھگنا تھا لیکن وہ بلند ہمت اور اولوالعزم تھا۔ لیکن ایک عضوی کمزوری سے جو احساس کمتری وہ احساس کرتا تھا۔ اس کی تلافی اس نے اپنا زور و اقتدار بڑھا کر اور ایک مشہور عالم فاتح بن کر کی۔ اسی طرح نپولین ثالث خود بھی اپنے ساتھیوں سے بہت چھوٹا تھا۔ اور جب اس کے ہم جماعت مذاق و حقارت سے بونا کارپورل (Little Corporal) کہا کرتے تھے۔ اس نے اپنے احساس کمتری کا جس طرح ازالہ کیا۔ اس سے ساری دنیا واقف ہے۔ غور سے دیکھا جائے۔ تو مرزا کی ذہنی نشوونما اور حالات زندگی میں بھی اس نفسیاتی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ ایک شاندار ماحول میں پیدا ہوئے۔ اور پلے۔ لیکن اس ماحول کے مقابلے میں انہیں اپنی کمزوری اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ خدا نے ہمت بلند دی تھی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ ان کوتاہیوں کی تلافی کی جائے۔ انھوں نے شعر و سخن کا رستہ چنا۔ تاکہ اس میں اتنی شہرت اور ناموری حاصل کی جائے۔ کہ اپنے ہم چشموں میں کسی سے کمتر نہ رہیں۔ اور اپنے بزرگوں کی طرح امتیاز حاصل کریں۔ وہ خود ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:-

"آہ از من کہ مرا زیاں زدہ و سوختہ خرمن آفریدند۔ نہ بآئینِ نیاگانِ خویش سلطانِ سپہ آرائے کلاہ و کمرے، ونہ بفرہنگ فرزانگانِ پیش بوعلی آسا علم و ہنرے۔ گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم۔ ذوقِ سخن کہ ازلی آوردہ بود۔ رہزنی کرد۔ و مرا بداں فریفت۔ کہ آئینہ دردوں وصورتِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است۔ سرلشکری و دانشوری خود نیست۔ صوفی گری بگراز سخن گستری روے آر۔ ناگزیر ہمچناں کردم و سفینہ در بحرِ شعر۔ رواں کردم۔"

تھا تاریا لے کا کام دیتا ہوگا +

نفسیات کے عالم کہتے ہیں کہ ایک انسان کی شخصیت اور ذہنی نشوونما کی بنیادیں مستحکم طور پر پہلے پانچ دس سال میں رکھی جاتی ہیں۔ اس مدت میں اگر کسی بچے کے ضمیر میں احساس کہتری (Inferiority Complex) گہری جگہ پا لے۔ تو وہ غیر شعوری طور پر اس احساس کا ازالہ کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتا ہے۔ جن لوگوں میں یہ احساس بے حد قوی ہوتا ہے اور ان کا ذہنی توازن جاتا رہتا ہے ان کا تحت الشعور تو اس کی تلافی، ان بیکاروں کے خیالات کو اس احساس کے متقابل دوسری انتہا پر لے جا کر کرتا ہے اور وہ ایسے وہم کے مریض بن کر اپنے آپ کو بادشاہ، نبی یا اسی طرح کی کوئی اور فوق العادت ہستی سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے انسان بالعموم عقل و ہوش سے عاری ہو جاتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے ان کی تعداد تھوڑی ہے ذہنی بے قاعدگی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک اس قدر خطرناک نہیں اس ذہنی بے قاعدگی کی ایک مثال تو ان لوگوں میں دیکھی جا سکتی ہے جو طبعاً بڑے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ اور اپنی اس باطنی کمزوری کا ازالہ بڑے بڑے جھوٹے دعوے باندھ کر یا لوگوں کو ڈرا دھمکا کر کرتے ہیں۔ احساس کہتری کے یہ مظاہر جن میں اپنی باطنی کمزوریوں کی تلافی عملی اصلاح اور ٹھوس محنت سے نہیں، بلکہ وہم و پندار کو طول دے کر، یا تعلّی اور ریاکاری کو بڑھا کر کی جاتی ہے مضحکہ خیز بلکہ افسوسناک ہوتے ہیں لیکن اگر احساس کہتری مناسب حدود میں رہے اور انسان اس کی کمی، اپنی اصلاح کرکے یا اپنی دوسری خوبیوں کو ترقی دے کر انہیں معراج کمال پر پہنچا کر، پوری کرے تو نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں خوش قسمتی سے انسانی تاریخ میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں بلکہ نفسیات کا ایک مشہور عالم ایڈلر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے فوق العادت ترقی کی ہے

پہاڑ ٹوٹے۔ لیکن اُن کے خطوں میں اس امر کا کوئی نشان نہیں۔ کہ ان کی ننھیال میں سے کسی نے آکر ان کی خبر بھی پوچھی ہو۔ ان کے خطوط میں سے کوئی خط کسی ماموں، یا ماموں زاد بھائی، یا کسی ایسے قریبی کے نام، جس کا تعلق ان کی ننھیال سے ہو محفوظ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان قرابتداروں کا ذکر بھی خطوط میں اتنا تھوڑا ہے۔ کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک اُردو خط میں مرزا اورنگ خاں کا ذکر ہے۔ جس نے مرزا کو اس زمانے باندا بلایا تھا جب وہ دربار شاہی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ یا قدر بلگرامی کے نام کے خطوط میں مرزا عباس اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا ذکر ہے۔ جو مرزا کے بھانجے تھے۔ لیکن یہ ذکر بھی اس طرح ہے، کہ مرزا عباس کی طرف سے کسی چاہ اور محبت کا نشان نہیں ملتا۔

کیا اس تمام صورتِ حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا ہوگا۔ کہ مرزا کے لئے ننھیال میں فقط خوشی اور بے فکری نہ تھی۔ کلفتیں اور باطنی کشمکش بھی تھی؟ اور پتہ نہیں۔ کہ مرزا کی ننھیال کی اپنی حالت کمزور ہو گئی۔ یا مرزا سے وہ کسی وجہ سے دلسرد ہو گئے۔ لیکن اتنا ظاہر ہے۔ کہ جو عیش و آرام انہیں ابتدا میں میسر تھا۔ اور جو پاسِ خاطر ان کا شروع میں ہوتا تھا۔ وہ اخیر تک برقرار نہ رہا۔

مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہوئی۔ اور اس نے انہیں دہلی کے ایک ممتاز ترین گھرانے سے گہرے طور پر وابستہ کر دیا۔ لیکن مرزا الٰہی بخش کی حیثیت اپنے بھائی نواب احمد بخش خاں رئیس لوہارو و فیروز پور جھرکہ کے مقابلے میں ایک 'طفیلی' کی تھی۔ اور نواب احمد بخش بھی کبھی کبھی اپنے اخراجات کی زیادتی کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ مرزا کو اس ماحول میں اپنی پستی کا احساس ہوتا ہوگا۔ جو ان کے اُس احساسِ کمتری کے لئے جو ظاہری وضعداری اور عیش و عشرت کے باوجود ان کے دماغ کی عمیق ترین گہرائیوں میں پرورش پا رہا

ان حالات اور واقعات کا اثر نہ ہوتا ہوگا؟ وہ جب اپنے گرد و پیش بڑی بڑی حویلیاں، اور
اپنے قرابت داروں میں بڑے بڑے رئیس دیکھتے ہوں گے۔ اور اپنے ہمجولیوں سے پوچھتے
ہونگے کہ میرا باپ کون تھا؟ کیا تھا؟ تو کیا اس کا جواب انہیں پسند خاطر ہوتا ہوگا اور کیا وہ
دل ہی دل میں اپنے ماحول کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور ضعیف مبادی محسوس نہ کرتے
ہوں گے۔

آگرے میں مرزا کا قیام اپنی ننھیال میں تھا ان کی ننھیال خوشحال تھی۔ اور اپنے
ماما اور مامی کو وہ بے حد عزیز ہوں گے۔ لیکن قدیم گھرانوں میں بھی اس بیٹی کی زندگی، جس کا شوہر
'خانہ داماد' ہو اور ملازمت معیشت میں بہت کامیاب نہ ہو، قابل رشک نہیں ہوتی والدین تو اپنی
بیٹی کو اور اس کی اولاد کو سینے سے لگا کے رکھتے ہیں۔ لیکن کئی دوسرے ایسے ہوتے ہیں جن کے
تعلقات اتنے قریبی نہیں ہوتے اور جو اس صورت حالات کی تلخی فریقین پرورش کرتے رہتے
ہیں مرزا کے ماما کے متعلق معلوم نہیں کہ وہ کب تک زندہ رہے۔ اور یہ بھی پتہ نہیں کہ
مرزا کے کتنے ماموں تھے۔ اور ان کے ماما کی وفات کے بعد ان کے ماموؤں اور ممانیوں کا
ان کے ساتھ کیا سلوک رہا؟ اس کے علاوہ یہ بھی ایک معمہ ہے کہ اگر مرزا کی ننھیال اس قدر
خوش حال تھی اور وہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا تو انہیں آگرہ چھوڑنے اور نواب
احمد بخش خاں کی پھوپھی کا دست نگر ہو کر دہلی جانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟۔ اس سے بھی
زیادہ تعجب انگیز امر یہ ہے۔ کہ اگرچہ جب مرزا شروع شروع میں دہلی گئے ہیں تو ماں
انہیں آگرے سے کبھی کبھار کچھ بھیج دیا کرتی تھی لیکن اس کے بعد مرزا پر سخت سے سخت
مصیبتیں آئیں ان کا بھائی دیوانہ ہو گیا۔ قرض خواہوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی۔
قمار بازی کی وجہ سے انہیں جیل جانا پڑا۔ غرضیکہ ان کے سر پر مصیبتوں اور رنج و الم کے

جب انسان بڑھاپے کو پہنچ کر (اور بالخصوص اس حالت میں جب ابتدائی ایام کے سوا
باقی ساری زندگی مایوسیوں اور کلفتوں سے بھری ہوئی ہو) اپنے بچپن اور عنفوان شباب
پر نظر ڈالتا ہے۔ تو اسے یہ سارا زمانہ ایک رنگین اور مسرت افزا عالم میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔
اس زمانے کی کلفتیں اور تکلیفیں سب بھول جاتی ہیں۔ اور صرف بے فکری اور عشق کے عالم
کے نقش نمایاں ہوتے ہیں۔ جن دو اندراجات کا ذکر ہم نے کیا ہے۔ وہ ضرور اہم ہیں۔
لیکن یہ معلوم نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا بیان کس زمانے کا ہے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے۔ کہ
اس کے بعد تنگدستی و ناخوشی کی حالت نہ رہی ہو۔ اور مرزا کے اپنے خط کے متعلق بھی نہیں کہا
جا سکتا۔ کہ مرزا کی ننھیال کی غیر معمولی خوشحالی اور فارغ البالی کب تک برقرار رہی۔ واقعہ
یہ ہے۔ کہ مرزا کے ابتدائی ایام اور ننھیال کے متعلق کئی ایسے سربستہ عقدے ہیں۔ جنہیں
یہ مان کر کہ مرزا کی طفولیت اور عنفوان شباب تمام تر خوشی اور عیش و مسرت کا گہوارہ تھا۔
ہم کسی طرح حل نہیں کر سکتے۔ اور تمام حالات اور واقعات کا جائزہ لینے سے خیال ہوتا ہے
کہ اگر مرزا کے ابتدائی ایام میں خوشی و بے فکری اور عیش و مسرت کا حصہ وافر تھا۔ تو ایسے
اثرات بھی تھے۔ جو ناگوار خاطر رہتے۔ اور جن سے مرزا کو اپنی کوتاہیوں اور اپنے گرد و پیش
کے مقابلے میں اپنی کہتری کا احساس ہوتا تھا۔ مرزا کا آگرے میں قیام ایک پھولوں کی
سیج پر تھا۔ لیکن ان پھولوں میں کانٹے بھی تھے۔ جو چبھتے تھے۔ اور جن کی خلش دیر تک
قائم رہتی۔

مرزا ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد وفات پا گئے۔ وہ جب زندہ تھے۔
تب بھی "پراگندہ روزی پراگندہ دل" رہتے تھے۔ اپنے بھائی نصر اللہ خاں کے مقابلے میں
ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ نہ کوئی ریاست نہ جاہ و ثروت! کیا مرزا کے حساس دل پر

ہوتا ہے کہ وہ غالباً پندرہ سولہ برس کے ہوں گے جب اُنھوں نے آگرہ چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کی چونکہ سسرال آگرے میں تھی۔ اس لئے وہاں اس کے بعد بھی جاتے تھے اور دیر تک مقیم رہتے۔ چنانچہ اُنھوں نے مثنی تیدوبراش کے خط میں جس پتنگ بازی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اٹھارہ انیس برس کی عمر کا واقعہ ہے اس زمانے میں مرزا کی والدہ زندہ تھیں۔ اور سسرال خوش حال ایسی حالت میں اُن کا آگرہ چھوڑنا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کے چچا مرزا نصراللہ خاں کی وفات پر اُن کی پنشن نواب احمد بخش کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی۔ اور نواب نے اس کے عوض مرزا نصراللہ خاں کے ورثا کی خورد برداخت اپنے ذمے لی تھی اس کے علاوہ نواب کی بھتیجی سے مرزا کی شادی ہو جانے کے بعد ان کے تعلقات اس خاندان سے اور گہرے ہو گئے تھے۔ اور قرین قیاس ہے۔ کہ انہی تعلقات نے مرزا کو ترک وطن پر مجبور کیا

قیام آگرہ کے اثرات

مرزا کے قیام آگرہ کے متعلق معاصرانہ تذکروں اور مرزا کی اپنی تصانیف سے جتنا بھی مواد ملتا ہے۔ اُسے ہم نے گزشتہ صفحات میں یکجا کر دیا ہے اس کے پڑھنے سے خیال ہوتا ہے۔ کہ مرزا کا قیام آگرہ انتہائی عیش و مسرت کا زمانہ تھا۔ اور ان دنوں رنج و الم یا کسی طرح کی مایوسی نے اطمینان ان کے پاس بھی پھٹکتی تھی مرزا کے بالکل ابتدائی ایام کی نسبت، ممکن ہے، یہ خیال درست ہو لیکن اتنا کہنا ضروری ہے۔ کہ غالب کے ابتدائی ایام اور ان کے تاہل کے متعلق مستند معاصرانہ اندراج تھوڑے ہیں۔ صرف نواب اعظم الدولہ کا بیان اور مرزا کا مثنی شوبراش کے نام خط ہی دو ایسے بیان ہیں۔ جنہیں اہم سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی اشعار اور خطوط مرزا کے بعد کے تاثرات کا اظہار ہیں اور اس لئے زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ کہ

اس تذکرے میں دو شعر ایسے انتخاب ہوئے ہیں۔ جو اور کہیں ہماری نظر سے نہیں گزرے ؎

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

ان تذکروں کے قلمی نسخے ہندوستان کے چند کتب خانوں میں بھی ہیں اگر ان میں کوئی ایسا مل گیا۔ جس پر تاریخ کتابت درج ہوئی تو مرزا کے چند نہایت ابتدائی اشعار کے متعلق کہا جا سکے گا۔ کہ وہ کس عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ تاہم اب بھی اتنا یقینی ہے کہ مرزا نے آٹھ نو سال کی عمر میں اردو اور دس گیارہ برس کی عمر میں فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور غالباً ان اشعار کا معتد بہ حصہ جنہیں مرزا نے پندرہ بیس سال بعد دیوانِ ریختہ سے حذف کیا۔ آگرے ہی میں لکھا جا چکا تھا۔ ان تذکروں میں سے ایک میں مرزا کے حالات اسد اور دوسرے میں غالب کے تحت میں دئے ہوئے ہیں۔ مرزا نے تمام فارسی غزلیات میں غالب تخلص استعمال کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ فارسی شعر گوئی شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے اردو میں بھی غالب تخلص لکھنا شروع کر دیا۔ اور اس کے بعد بالعموم اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یہی تخلص قائم رکھا اگرچہ شاعرانہ سہولت کی وجہ سے بعد کی چند غزلوں میں اسد بھی استعمال کیا ہے۔

نقل سکونت مرزا کا دہلی میں آنا جانا اس وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ جب ان کی عمر ابھی پانچ چھ سال کی تھی۔ لیکن یہ حقیقی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانے میں وہ مستقلاً آگرہ چھوڑ کر دہلی گئے۔ البتہ ان کے بعض خطوط سے خیال

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو   وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے   یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھو وہ برق ستم بس کہ دل بیتاب ہے   دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازہ میخانہ بولا مے فروش   اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے   رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسد   ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

مرزا کی حصول میاں ساعری کے متعلق نواب اعظم الدولہ لکھتے ہیں:۔
"در فن سخن سخی تتبع محاورات میرزا بیدل وریختہ در محاورات فارسی مو دل می کند بالجملہ مو صد طرز خود است و اکثر اشعارش در رسن سنگلاخ معانی موزوں کردہ زود خیال سخن سنج بلا مستی پیش نہاد خاطر دارد"
عیار الشعرا میں خوب چند ذکا نے اپنے استاد شاہ نصیر کی فرمائش پر غالب کے متعلق ذیل کا اندراج کیا ہے:۔
"مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبداللہ خاں عرف مرزا دولہ سبط مرزا غلام حسین خاں کمیدان ساکن بلدۂ اکبر آباد شاگرد مولوی محمد معظم شاعر فارسی ہندی"

ابتدائی اشعار

غالب نے قیامِ آگرہ کے دوران میں جو اشعار لکھے وہ نسخۂ حمیدیہ میں محفوظ ہیں لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے کونسے اشعار آگرے اور کونسے دہلی میں لکھے گئے۔ آسان نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اُردو شعرا کے دو تذکرے ہیں۔ تذکرۂ سرور اور عیار الشعرا جن میں غالب کو آگرہ کا ساکن بتایا گیا ہے۔ لیکن ان قلمی نسخوں پر تاریخِ کتابت درج نہیں۔ اور چونکہ تذکرۂ سرور کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس نے کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لئے ہوں۔ چنانچہ انڈیا آفس لائبریری میں تذکرۂ سرور کا جو نسخہ ہے۔ اس میں کئی اشعار ایسے ہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی نہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اور کسی دیوان میں نہیں مثلاً

جگر سے ٹوٹے ہوئے نوک کی ہے سناں پیدا — دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر — جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط — کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

محملِ شمعِ عذاراں ہیں جو آجاتا ہوں — شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ رہنے سے رہو — کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صبا جاتا ہوں

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو — آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو   وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے   یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے   دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش   اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے   رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسد   ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

مرزا کی خصوصیات شاعری کے متعلق نواب اعظم الدولہ لکھتے ہیں ۔
"درفن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا اسد آل در ریختہ در محاورات فارسی معمول می کند بالجملہ مخصوص طرز جدا است و اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ معانی معمول کردہ زور خیال سحر شیرازمیتی پیش نہاد خاطر دارد"
عمدۃ الشعرا میں خوب چند ذکا نے اپنے اُستاد شاہ نصیر کی فرمائش پر لکھا غالب کے متعلق ذیل کا اسلاح ہے :-
"مرزا اسد اللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ خاں عرف مرزا دولہ سبط مرزا غلام حسین خاں کمیدان ساکن بلدۂ اکبرآباد شاگرد مولوی محمد معظم شاعر فارسی ہمدی"+

ابتدائی اشعار

غالب نے قیامِ آگرہ کے دوران میں جو اشعار لکھے وہ نسخۂ حمیدیہ میں محفوظ ہیں۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے کونسے اشعار آگرے اور کونسے دہلی میں لکھے گئے۔ آسان نہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اردو شعرا کے دو تذکرے ہیں۔ تذکرۂ سرور اور عیار الشعرا جن میں غالب کو اکبرآباد کا ساکن بتایا گیا ہے۔ لیکن ان قلمی نسخوں پر تاریخِ کتابت درج نہیں۔ اور چونکہ تذکرۂ سرور کے مصنف سے غالب کی ملاقات آگرہ چھوڑنے کے بہت بعد تک ہوتی رہی۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس میں کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو اشعار ملے ہوں وہ بھی درج کر لئے گئے ہوں۔ چنانچہ انڈیا آفس لائبریری میں تذکرۂ سرور کا جو نسخہ ہے۔ اس میں کئی اشعار ایسے ہیں جو نسخۂ بھوپال میں بھی نہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو اور کسی دیوان میں نہیں ملتے۔ مثلاً

جگر سے ٹوٹے ہوئے مُو کی ہے سناں پیدا — دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر — جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط — کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

محفلِ شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں — شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ میں مَیں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبک رو کے نہ رہنے سے رہو — کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صبا جاتا ہوں

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو — آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

مرزا غالب کا سسرال

خواجہ عبدالرحمٰن

- عالم جان
- عارف جان
  - نواب احمد بخش خاں
    - فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ
    - از بہو جانم
      - شمس الدین احمد خاں، رئیس فیروزپور جھرکہ
        - والد مرزا خاں داغ
      - نواب بیگم، زوجہ زین العابدین خاں عارف
    - از بیگم جان
      - امین الدین احمد خاں، رئیس لوہارو
      - ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں
  - زوجہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں
  - الٰہی بخش خاں معروف
    - امراؤ بیگم، زوجہ مرزا غالب
    - بنیادی بیگم، زوجہ نواب غلام حسین خاں مسرور
    - علی بخش خاں رنجور
      - غلام فخر الدین خاں
  - نبی بخش خاں
    - مرزا اکبر علی خاں
      - خورشید بیگم
- قاسم جان
  - مرزا [illegible] اللہ بیگ
    - مرزا معین الدین
    - مرزا محمد حسین
    - زوجہ ضیاء الدین احمد خاں
  - محمد بخش خاں
    - مرزا [illegible] اللہ بیگ خاں
  - فیض اللہ خاں
    - سرفراز الدولہ سہراب جنگ
      - نواب غلام حسین خاں مسرور
        - زین العابدین خاں عارف
          - باقر علی خاں
          - حسین علی خاں
        - حیدر حسین خاں

مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ مرزا کی اگر ابتدائی درسی تعلیم مکمل ہوتی۔ تو وہ ادب اور شعر کے غلط راستوں پر اتنی دیر نہ بھٹکتے۔ اُن کے ابتدائی ادبی رجحانات سے ظاہر ہے۔ کہ اگرچہ مولوی محمد معظم اور ہرمزد کے زیرِ اثر انہیں فارسی زبان اور بعض فارسی شعرا کے کلام سے واقفیت ہوگئی تھی لیکن مذاق کی وہ تربیت اور اصلاح، جو بعد میں مولوی فضل حق اور نواب مصطفےٰ خاں کے اثرِ صحبت اور عُرفی و نظیری اور دوسرے نغز گو شعرا کے کلام کے مطالعہ سے ہوئی، ابھی باقی تھی +

مرزا ابھی تیرہ برس کے طفلِ مکتب تھے۔ کہ ذوق ولی عہدِ سلطنت ظفر کے اُستاد مقرر ہوگئے۔ اُس وقت ولی عہد کے اُستاد کا مشاہرہ چار روپے ماہوار تھا لیکن ولی عہد کی تختِ نشینی کے وقت اُس کے اُستاد کا اُستادِ شاہ ہو جانا لازمی تھا۔ اس لئے اس تقرر سے مرزا کا راستہ بند ہو گیا +

شادی مرزا کیلئے اس سال کا اور بھی اہم واقعہ مرزا الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے اُن کی شادی تھا۔ مرزا کی کئی تحریروں سے بالخصوص اس دردناک مرثیہ سے جو اُنہوں نے ۲۵ برس کی عمر سے پہلے لکھا۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ وہ شادی کو "دامِ سخت" ہی سمجھتے رہے اور "اُڑنے" سے پہلے "گرفتار" ہو جانا انہیں بہت ناگوار تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کیلئے یہ شادی ہزار آسانیوں اور برکتوں کا باعث ہوئی +

غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش معروف جن کے متعلق آزاد نے "آبِ حیات" میں کئی صفحے لکھے ہیں۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ اور نہایت پاکیزہ اور مؤثر شعر کہتے تھے فخر الدولہ نواب احمد بخش جو لارڈ لیک کے بڑے منظورِ نظر تھے مرزا الٰہی بخش کے بھائی تھے۔ نواب اور نواب کی اولاد سے مرزا غالب کے تعلقات کا ذکر بعد میں آئیگا۔ لیکن مندرجہ ذیل شجرۂ نسب پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ امر واضح ہو جاتا ہے۔ کہ اُنکی شادی ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جو نہ صرف جاہ و ثروت کے لحاظ سے ممتاز اور روبہ ترقی تھا۔ بلکہ شعر و شاعری سے بھی گہرا لگاؤ رکھتا تھا +

ہیں۔ کچھ بعید ہے کہ وہ تخلص کرنے پر دل مغرور رہتے ہیں اور سائر علام حسین حل کمیدان قبل اس سے متھرا دہلی (آگرہ) ہیں ان کی سکونت کا مکان اُستادان ماسٹر مثل حلیمہ معلم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی السعرا (ہیر اکبرآبادی) جو ہے بلیر رود گمہ تھے ساں سے تعلیم پائی ایام صبا سے مر برک العامیں مترکہ ان اُستادوں کے مرتبہ علم پیچھے تب اس کی فکر رسالے یہ صورت دکھائی کیوں مر جو تسکو ہوں جن کے اُستاد دو ہوں چونکہ وہ اُستاد مرگئے ۔ یہ حقہ دہلی (آگرہ) سے اُدھر گئے اب جاہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں ۔

یادگار غالب میں مرزا کے اُستاد کا نام شیخ معظم لکھا ہوا ہے آگرے کے ایک مشہور مدرس میر اعظم علی اکبرآبادی کے نام مرزا کا ایک فارسی خط تیغ آہنگ میں درج ہے عالباً یہ بزرگ مرزا کے اُستاد رہے تھے ۔ لیکن خط میں بڑی عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے اور چونکہ میر اعظم علی بڑے عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے عجب نہیں کہ شاگرد نہ ہونے کے باوجود مرزا نے ان سے کسب فیض کیا ہو۔ میر اعظم علی نے ۱۸۰۸ء میں جب مرزا ابھی نو سال کے تھے ۔ سکندر نامہ کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ اور ۱۸۴۵ء تک ان کا سلسلہ تصنیف و تالیف جاری رہا ۔

مرزا کی تعلیم کے متعلق جو منتشر اطلاعات ملتے ہیں ان سے ایک دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرزا کو سپاہیانہ ماحول کی تعلیم جسے حاصل کرکے وہ اپنا آبائی پیشہ جاری رکھ سکتے تھے نہ ملی۔ دوسرے اگرچہ ادبی اور عام دینی علوم سے انہیں اتنی واقفیت حاصل ہوگئی تھی کہ اس کے بعد وہ اپنے مطالعہ اور اہل علم کی صحبت سے اس میں اضافہ کر سکے۔ اور اس مختصر سی بنیاد پر ایک گراں قدر قصر ادب کی تعمیر کر گئے ۔ لیکن اس تعلیم کو کسی طرح

سے زیادہ جو چیز مرزا کو ممتاز کرتی ہے۔ وہ فارسی زبان اور ادب سے واقفیت اور اس زبان میں قدرتِ اظہار ہے۔ اُنہوں نے گیارہ برس کی عمر میں ہی فارسی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں ظہوری کا کلام اور دوسری کتابیں زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ فارسی سے دلچسپی مولوی محمد معظم کی شاگردی کے زمانہ سے ہی ہوگئی تھی۔ لیکن شاید اس بارے میں مُلا عبدالصمد ہرمزد کے احسانات ان پر سب سے زیادہ ہیں۔ ہرمزد ۱۸۱۰ء کے قریب آگرے میں ایک سیّاح کے طور پر آیا تھا۔ وہ دو سال تک مرزا کے ساتھ رہا۔ اور جب مرزا آگرہ چھوڑ کر دہلی آئے۔ تو وہ بھی ہمرکاب تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ مرزا کا اتالیق مقرر ہو گیا ہو گا۔ یا مرزا میں اس کی دلچسپی بہت گہری ہو گی۔

مرزا اپنی تعلیم کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا۔ بعد اسکے لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور، عیش و عشرت میں منہمک ہوگیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسانِ پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد و صوفی صافی تھا۔ میرے شہر میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحت (خالص) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبانِ دری سے پیوندِ ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا۔ حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطرنشان ہو گئی۔"

تذکرۂ گلشنِ بے خزاں میں مرزا کی تعلیم کی نسبت ذیل کا اندراج ہے :۔

"غالب و اسد تخلص۔ اسداللہ خاں نام۔ ملقب بمرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے

آتش ہنگامہ سخن داشتی   داغ مغاں شیوہ بتاں داشتی
بود بہ تیغ و خم سودائے کار   کار تو چوں زلف بتاں تار و مار
بسکہ ہمی تیرہ تر از شام بود   روز تو داغ دل ایام بود
چشم پریشاں نظرے داشتی   جلوہ بہ ہر رہگذرے داشتی
بسکہ بلا را تر انداختے   دیدہ بصد جا سپر انداختے
زاں ہمہ صحرا رمایکہ رفت   واں ہمہ جو بارہ فشانی کہ رفت
سرچہ کشوں میرسدم در نظر   شاہد و شمع است و شراب و شکر
حیف بسا روز گذشت اینچنیں   آہ زعمرے کہ گذشت اینچنیں!

تعلیم مرزا کے عنفوانِ شباب کا بیشتر حصہ کھیل کود اور لہو و لعب میں صرف ہوا لیکن اس میں شک ہے کہ ان کی تعلیم سے بے توجہی نہیں برتی گئی۔ مرزا کی والدہ خود پڑھنا لکھنا جانتی تھیں اور قرینِ قیاس ہے کہ انہوں نے مرزا کی تعلیم کا خاص خیال رکھا ہوگا معاصرانہ تذکروں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے اور مرزا کے اساتذہ میں آگرہ کے دو مشہور مدرسین (نظیر اکبرآبادی اور مولوی محمد معظم) کے نام لئے جاتے ہیں مرزا کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ علوم مروجہ سے انہیں کافی واقفیت تھی منطق فلسفہ اور علم ہیئت کی اصطلاحیں ان کے بالکل ابتدائی کلام میں موجود ہیں اسلامی نظام تعلیم کے ماتحت علم طب کی تھوڑی بہت واقفیت ہر ذی علم کے لئے ضروری تھی، اور مرزا کی تصانیف اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طب کی مشہور کتابوں سے واقف تھے۔ عربی صرف و نحو سے بھی وہ ناواقف نہ تھے اور بقول حالی جو ٹیڑھی ردیفوں میں انہوں نے غزلیں لکھی ہیں ان میں شعر گوئی علم عروض کی واقفیت کے بغیر ناممکن تھی۔ لیکن ان علوم کی دقیقت

مجنونے، وہنوز آں بقعہ را در ہر کفِ خاک چشمۂ خونے ست۔ روزگارے بودے کہ دراں سرزمین جز مہر گیاہ نہ رُستے۔ و ہیچ نہال جز دل بار نیاوردے۔ نسیم صبح دراں گل کدہ بہ مستانہ وزیدن دلہا را آں مایہ از جا برانگیختے۔ کہ رندان را ہوائے صبوحی از سرو پارسایان را نیتِ نماز از ضمیر فرو ریختے۔ ہر چند ہر ذرۂ خاکِ آں گل زمیں را از من پیامے بود دلنشیں و ہر برگِ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطر نشاں، اما تازگیٔ وفتِ شمار را در نظر داشتہ در دو پردہ شور پرسش انگیختہ بود و چشم براہ داشت کہ کے نویسند و دریغ کہ ہیچ گاہ نہ نوشتند۔ کہ رخش سنگیں (یعنی اسپ سنگیں کہ در اکبرآباد معروف است) دعائے مرا بکدام ادا پذیرفت و دریا بپاسخ سلامِ من بزبان موج چہ گفت؟"

مرزا کا عنفوانِ شباب رنگ رلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ان کی یاد بھی ایک لحاظ سے نشاط انگیز تھی۔ لیکن مرزا کو ان کا خمیازہ بڑا سخت بھگتنا پڑا۔ اور جب وہ ٹھنڈے دل سے ان ایام کی بے حاصلگی، اور اوقاتِ عزیز کی تلفی پر غور کرتے۔ تو دل میں رنج و کرب اور مایوسی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ ہم مہرِ نیمروز سے وہ اقتباس درج کر چکے ہیں جس میں انہوں نے اپنی بے راہروی پر، اور ان قیمتی لمحوں کی یاد میں جو بے نتیجہ بلکہ مضر دلچسپیوں میں تلف ہوئے، آنسو بہائے ہیں۔ ان احساسات کا اظہار اشعار میں بھی کئی جگہ ہے۔ ایک فارسی مثنوی میں جو ان کی باطنی کشمکش کا آئینہ ہے۔ اور جو کسی ایسے زمانے میں لکھی گئی جب وہ کوشش اور ہمت سے اپنے آپ کو انحطاط اور مایوسی کے گڑھے سے نکال رہے تھے۔ اور اپنی پراگندہ قوتوں کو مجتمع کر کے اپنے آپ کو ایک بلند تر مطمحِ نظر کے قابل بنا رہے تھے۔ وہ اس زمانے کی نسبت لکھتے ہیں ؎

گر مے خونت کہ ازیں بیش بود   صرف بر انداختنِ خویش بود

ہر جلوہ یار من تقاضائے دلبری　　　　از عمرہ بود محمل یارے سرگرار
ہم بیسیار یارستے حمایتیہ دلبراں　　　　در مہنگ کاروائی میداد روزگار
ہم دید دارادائے سحان شیرہ شاہداں　　　　پیوستہ بود نامۂ امدوہ انتظار
ہموارہ ذوق مستی دلبہود سرور شد
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

جوانی میں تھوڑی بہت دل لگی کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن مرزا غالب کا یہ زمانہ اس قدر رنگینیوں سے بھرا ہوا تھا کہ معاصرانہ تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ نواب اعظم الدولہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"اسد اللہ خاں اسد عرف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند مولدش اکبرآباد، جوان قابل، یار باش، درد مند، ہمیشہ مصروف معاشی بسر بردہ　　　　در خاطر متمکن عمہائے عشق مجاز، رہین جامۂ دشکدہ مجاز "

اصل کر مل گلیوں سے محبت ہو جاتی ہے جہاں بچپن کے دن گزرے ہوں اور اگر ان گلی کوچوں سے رنگین اور پُرکیف لمحوں کی یاد وابستہ ہو تو ان سے تعلق خاطر اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ مرزا کو بھی آگرے کے گلی کوچے عزیز تھے اور جب ایک دفعہ نواب ضیاء الدین خاں آگرے گئے ہیں تو انہوں نے بڑے ولولہ انگیز طریقے سے اپنے "وطن" کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا لکھتے ہیں :۔

۔۔ سلام کر شوق دور اندیش دیدہ و دل را دریں سفر پاسبان فرستاد تا ہمدریں عزیمت آں شادمانی دیدار وطن سپر توانم داد رسیدار اکبرآباد را ہیچ کم نگیرد دارداگرد رمائے آں دیار الحفیظ گوے والامان سرائے گردد کہ آں آباد چند ویراں فتاں و ویرانہ آباد یاری گاہ بود

لیکن غالب کے سبھی ہمجولی اور ساتھی اس طرح بلند رتبہ اور عالی خاندان کے نہ تھے۔ بلکہ ان کے ایک بیان سے خیال ہوتا ہے۔ کہ مرزا کی آزادہ روی انہیں بُری صحبت میں بھی لے گئی۔ وہ مہرِ نیمروز میں اپنے ابتدائی ایام پر تاسف کر کے لکھتے ہیں۔

"سینۂ من نفسے داشت بروان آسانی نسیمے کہ از نسترن زار وزد۔ زبان زدہ من! کہ دم جز بہ نابالیست نزدم وبنانِ مرا قلمے بود بہ دجلہ باری ابرے کہ از قبلہ خیزد بہیدہ کہ بن من کہ باراں بشورہ زار فرو ریختم ؎

با ایں فروغ گوہر درخشانی نہاد　　زیں ساں سیاہ روزِ کرا کرد روزگار

با فرو مہنگ بیگانہ و با مام و ننگ دشمن، با فرومایگاں ہمنشیں و باداماش ہمرنگ، یائے بیراہہ پوئے دزباں بیصرفہ گوئے، در شکست خویش گردوں را دستیاد و در آزار خویش دشمن را آموزگار"۔

منشی شیو نراین کے نام مرزا نے جو خط لکھا ہے۔ اس میں اپنی شطرنج بازی اور بتنگ بازی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ مرزا کی دلچسپیاں انہی تک محدود تھیں۔ وہ اس وقت جوان تھے۔ ننھیال خوشحال تھی۔ اس لئے عیش و آرام اور لہو و لعب کے سارے وسیلے میسر تھے۔ اور اس پر اضافہ یہ کہ والد کا سایہ سر پر نہ تھا۔ کہ کوئی خاص روک ٹوک ہوتی۔ وہ تو حافظ کا شعر بزبانِ حال پڑھتے ہوں گے ؎

شہریست پُر ز خوباں وز ہر طرف نگارے　　یاراں صلائے عام است گر می کنید کارے

اُن کے ایک ابتدائی قصیدے کی تشبیب ہے ؎

آں بلبلم کہ در چمنستاں بشاخسار　　بود آشیانِ من شکن طرۂ بہار

ہر غنچہ از دمم بفضائے شگفتگی　　فیض نسیم و جلوۂ گل داشت پیشکار

ہمارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ باتیں میرے ہوش سے
پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے
ساتھ ہیں اور انہوں نے جو کیٹھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر
اس امر کے مدعی ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید
منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس[19] بیس برس کی
میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر
جاتی تھی۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے
بس ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان میں
تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازہ
کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور
سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور
اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک اور کٹڑہ کہ وہ
کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ
بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

عنفوانِ شباب

مندرجہ بالا اقتباس سے ایک تو کچھ اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے
کہ غالب کی حویلی کس قدر متمول تھی اور ان کا سلسلہ کیسا
وسیع تھا اور دوسرے غالب کے مشاغل سے متعلق بھی کچھ پتہ چلتا ہے۔ راجہ
بلوان سنگھ (جن کا اس خط میں ذکر ہے) بنارس کے راجہ چیت سنگھ کے (جس کی
وارن ہیسٹنگز سے کشمکش تاریخِ ہند کا ایک اہم باب ہے) صاحبزادے تھے۔

روپے سالانہ نقد سرکار کو دیتے تھے۔ معاف کر دئے جائیں۔ یہ فیصلہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو کو ہوا۔ اور اس کے مطابق یہ طے ہوا۔ کہ پندرہ ہزار روپیہ نواب احمد بخش پچاس سوار کے دستہ پر خرچ کریں۔ اور باقی رقم اپنے بہنوئی کے ورثا کی نگہداشت پر +

ننھیال

مرزا غالب ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "نصر اللہ بیگ خاں بہادر میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبیدار تھا۔ اس نے مجھے پالا" اور یہ بھی صحیح ہے۔ کہ چچا کی وفات کے بعد اس کا وارث ہونے کی بنا پر سرکارِ انگلشیہ کی طرف سے مرزا کی پرورش پرداخت کا انتظام کیا گیا۔ لیکن ان کا بچپن اپنے چچا کے ہاں نہیں بلکہ اپنے نانا کے ہاں گزرا۔ مولینا حالی لکھتے ہیں۔ "مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی۔ اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔" مرزا غالب کے ابتدائی حالات سے واقف ہونے اور ان اثرات کا مطالعہ کرنے کے لئے جنہوں نے ان پر اُس زمانے میں اثر ڈالا۔ جب انسانی ذہن ایک لوح سادہ کی طرح اثر پذیر ہوتا ہے۔ ہمیں اس کے ناہیال کے حالات سے آگہی کرنی چاہئے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے متعلق بہت تھوڑی مستند اور معاصرانہ معلومات حاصل ہیں۔ البتہ اس اردو خط سے جو مرزا نے اخیر عمر میں منشی شیونرائن کو لکھا، پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کی ننھیال آگرے کے ممتاز ترین گھرانوں میں سے تھی۔ اور یہاں انہیں ہر طرح کا عیش و آرام اور ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ وہ منشی شیونرائن مالک مطبع مفید خلائق کو اپنے اور ان کے خاندان کے تعلقات کا حال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"تمہارے دادا کے والد عہدِ نجف خاں ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو

مرزا عبداللہ بیگ خاں کے تین بچے تھے مرزا غالب، مرزا یوسف اور چھوٹی خانم

مرزا غالب جن کا پورا نام اسداللہ بیگ خاں اور عرف مرزا نوشہ تھا، شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے جس وقت ان کے والد کی وفات ہوئی وہ فقط پانچ سال کے تھے۔ اس کے بعد ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے انہیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ مرزا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے صوبیدار تھے۔ لیکن جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دی اور آگرے اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تو یہ عہدہ جاتا رہا اور ان کی جگہ ایک انگریز کمشنر مقرر ہوا لیکن فخرالدولہ نواب احمد بخش نے جنکی بہن ان سے منسوب تھیں اور جن کے لارڈ لیک سے دوستانہ مراسم تھے، اس وقت مرزا نصراللہ خاں کی مدد کی اور انہیں انگریزی فوج میں چار سو سوار کے ایک دستے کا رسالدار مقرر کرا دیا نواح آگرہ کے دوسرے ساحل پر کے سونک اور سونسہ مرزا نصراللہ خاں کی ذات اور رسالے کے اخراجات کے لئے انہیں مین حیات تعویض ہوئے لیکن ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ وہ چل بسے اور سارا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ اس وقت نواب احمد بخش نے ایک دفعہ پھر اپنے اثر و رسوخ اور حکمت عملی کا وار چلایا انہیں لارڈ لیک کی فتوحات کے بعد فیروز پور جھرکہ اور کچھ اور علاقہ جس خدمت کے عوض اس شرط پر ملا تھا کہ وہ سرکار انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دیں اب مرزا نصراللہ کی وفات پر انہوں نے فیصلہ کیا کہ چار سو سوار کا جو رسالہ مرزا نصراللہ سے وابستہ تھا وہ توڑ دیا جائے۔ اور اس کی جگہ پچاس سوار کے ایک دستے کا وجود بدستور قائم کریں جو بشرط ضرورت حاضر ہو اور اس کے ساتھ وہ مرزا نصراللہ کے ورثا کی پرورش و راحت کا بھی اہتمام کریں جس کے عوض میں پچیس ہزار

تھے۔ اس لئے انہیں مناسب منصب حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک کے پاس ملازم ہوئے۔ اور جب وہ وفات پا گئے۔ تو دہلی پہنچ کر نواب ذوالفقار الدولہ کی وساطت سے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور ایک بیر حاصل پرگنہ (پہاسو) اپنی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے حاصل کیا۔

مرزا کے دادا کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک بیٹے کا نام مرزا عبداللہ بیگ خان تھا۔ اور عرف مرزا دولہا۔ اُن کی شادی آگرے کے ایک معزز گھرانے میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی عزت النسا سے ہوئی۔ وہ پیدا تو دہلی میں ہوئے تھے۔ لیکن جب والد کی وفات کے بعد پہاسو کی جاگیر جاتی رہی۔ تو انہیں تلاش ملازمت کیلئے جا بجا پھرنا پڑا۔ پہلے وہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے۔ پھر حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں وہ کئی برس تک تین سو سواروں کے افسر رہے۔ لیکن حیدر آباد کی پرانی خرابی یعنی "خانہ جنگی کے بکھیڑے" میں یہ نوکری جاتی رہی۔ اس کے بعد انہوں نے الور کا قصد کیا۔ ابھی انہیں الور میں کوئی خاطر خواہ ملازمت نہ ملی تھی۔ کہ اتفاق سے انہیں دنوں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے بھڑ گئے۔ اور جو فوج باغیوں کی سرکوبی کے لئے گئی۔ اس کے ساتھ مرزا عبداللہ خاں کو بھی بھیجا گیا۔ یہاں بدقسمتی سے انہیں پہنچتے ہی گولی لگی۔ جس سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ راج گڑھ ہی میں دفن ہوئے[۱]۔

---

[۱] مرزا کے ایک خط میں لکھا ہے "میرا باپ مہاراجہ بختاور سنگھ کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام برجاری ہوئی۔ اور ایک گاؤں جسکا تالڑا نام ہے مجھ کو برائے دوام ملا"۔

تذکرہ

باب اوّل

اکبر آباد

مغلوں کے جاہ وجلال کا اصل گہوارہ شاہجہاں آباد تھا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ نہ
صرف اس کے فن تعمیر کا شاہکار اکبرآباد میں ہے۔ بلکہ اس کے سب سے بڑے شاعر
اور اس کی تہذیب وتمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی یہی بلدہ حسن وشعر ہے
میاں غالب خود مغل تھے اور ان کے دادا ان کے پہلے بزرگ تھے جنہوں نے
مرزا کی پیدائش سے پچاس ساٹھ سال پہلے سمرقند چھوڑ کر ہندوستان میں رہائش اختیار
کی مرزا کے دادا کی زبان ترکی تھی یہاں کی زبان بہت کم سمجھتے تھے لیکن اعلٰے خاندان کے

مرزا کو تو غالباً یہ تصویر نہ ملی۔ اور انہوں نے پھر عالمِ ضعیفی میں وہ تصویر کھچوائی۔ جو اب عام طور پر ملتی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کی ایک نقل ہمارے ہاتھ آ گئی۔ اور محکمۂ آثارِ قدیمہ کی اجازت سے ہمیں موقع ملا۔ کہ اسے اہلِ نظر کے پیش کریں۔

اس تصویر میں دورِ حاضر کے کسی موقلم نے رنگ آمیزی نہیں کی۔ اور اس کا پسِ منظر بہت روشن نہیں۔ لیکن اس کے مستند اور معاصرانہ ہونے میں کلام نہیں۔ اور شاید مرزا کی کسی تصویر سے ان کی رئیسانہ تمکنت، عقابی تیز نگہی اور بشرے کی ذہانت اس طرح نمایاں نہیں ہوتی۔ جس طرح اس تصویر سے +

کلیم الدین احمد کی تصانیف کے بعد شروع ہو گئی ہے۔ اس کی روشنی میں
اپنے طریق کار کی وضاحت کریں گے۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ اس کی فرصت
نہ ملی۔ اور معاملہ آئندہ اشاعت تک ملتوی رہا۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب کی دوسری اشاعت
میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان شائع کیا ہے۔ جس میں مولانا
نے مرزا غالب کی ان مستند اور معاصرانہ تصاویر کی فہرست دی
ہے۔ جو ان کی نظر سے گزری ہیں۔ اس فہرست میں وہ تصویر
نہیں۔ جو غالب نامہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اور بعض حضرات
کو خیال ہوا ہے۔ کہ شاید یہ تصویر اصلی اور معاصرانہ نہیں جن
اصحاب نے ہم سے لکھ کر دریافت کیا۔ ہم نے ان کی تشفی کر دی
لیکن اگر ان کے علاوہ کوئی اور بزرگ اس معاملے میں شبہ رکھتے
ہوں تو ہم ان کی اطلاع کے لئے فقط یہی کہنا چاہتے ہیں۔ کہ جس
تصویر کو پہلے پہل شائع کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہوا تھا۔ وہ
وہی تصویر تھی۔ جس کی نسبت مرزا نے اپنے رقعات میں لکھا
ہے۔

"ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے۔ اگر
ہاتھ آجاوے گی۔ تو وہ ورق بھیج دوں گا۔"

صفحاتِ آئندہ میں اُس کام کی تکمیل کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کی ابتدا غالب نامہ کے مقدمہ سے ہوئی تھی۔ اساس وُہی ہے۔ لیکن عمارت میں گوناگوں اضافے ہُوئے ہیں۔ کتاب کا حجم قریب قریب دُگنا ہوگیا ہے۔ دوسرے حصّے میں جو غالباً بعض لحاظ سے کتاب کی جان ہے، متعدد مباحث بالکل نئے ہیں۔ مثلاً غالب کی عشقیہ شاعری، غالب اور مغلیہ تہذیب کی ترجمانی، غالب اور اقبال، غالب اور میر، غالب کے اُردو خطوط اور نثرِ اُردو میں ان کا مرتبہ۔ بعض مضامین ایسے ہیں۔ جن کا سُراغ غالب نامہ میں بھی مل جائے گا۔ لیکن جو اب نئے سرے سے طویل تصحیح و اضافہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ مثلاً غالب کا فلسفہ، غالب اور حبِ وطن وغیرہ۔ سوانحی حصہ میں اس قدر نمایاں تبدیلیاں نہیں۔ جس قدر حصۂ تنقید میں لیکن یہاں بھی بعض اجزا بہت حد تک بالکل نئے ہیں (مثلاً بابِ اوّل) بعض باتیں ایسی ہیں۔ جو غالب نامہ میں قطعاً درج نہ تھیں (مثلاً غالب کی گرفتاری کے متعلق منشی گھنیشام لال عاصی دہلوی کا معاصرانہ بیان)۔ ان کے علاوہ مکاتیبِ غالب کی اشاعت سے فرمانروایانِ رام پور، مرزا اور مرزا کی بیگم کے متعلق جو نئی معلومات فراہم ہوئی تھیں۔ وہ بھی درجِ کتاب کر لی گئی ہیں۔

کتاب میں اس قدر اضافہ اور تغیر و تبدّل ہُوا ہے۔ کہ شاید نام کی تبدیلی کو ناجائز نہ سمجھا جائے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ کتاب کے شروع میں آئینِ تنقید کے متعلق چند صفحے لکھیں گے۔ اور قدیم اور جدید کی جو بحث ڈاکٹر لطیف اور ڈاکٹر

دیباچہ

آج سے کوئی آٹھ سال پہلے ہم نے غالب نامہ کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں مرزا غالب کی زندگی اور تصانیف کے متعلق ہماری تحقیق اور ریسرچ کے نتائج جمع تھے کتاب کا بیشتر حصہ غالب کے اُردو اور فارسی کلام کے طویل انتخاب پر مشتمل تھا جسے تاریخی ترتیب سے مدوّن کیا گیا تھا۔ اور شروع میں قریباً ڈیڑھ سو صفحے کا مقدمہ تھا۔ جس میں مرزا کے حالاتِ زندگی کا خلاصہ اور ان کی نظم و نثر اور شخصیت پر تبصرہ تھا۔

غالب نامہ ایک خشک سی تحقیقی اور تنقیدی کتاب تھی۔ جسے بعض اُردو تذکرہ نگاروں کی روش کے مطابق قصص و لطائف سے' یا مرزا غالب کے بہار آفریں قلم سے نکلے ہوئے خطوط کے طویل اقتباسات اور اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تھی۔ کتاب میں عام پسند کی کوئی چیز نہ تھی لیکن پھر بھی اسے توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی علامہ اقبالؒ۔ مرزا محمد سعید ڈاکٹر عابد حسین اور دوسرے اہلِ نظر نے کتاب کے متعلق حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔ اور عامۃ الناس میں بھی کتاب اس درجہ مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصے میں اسکے دو ایڈیشن ختم ہو گئے۔

تبصرہ

غالب کے تذکرہ نگار

غالب کا ادبی ارتقا

تبصرۂ عمومی

فہرست

مرکنٹائل پریس لاہور میں شیخ محمد اقبال ایم۔اے پرنٹر و پبلشر
نے چھپوا کر تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی سے شائع کیا۔

آثارِ غالب

مرزا اسد اللہ خان غالب کی زندگی اور تصانیف کا تفصیلی مطالعہ
جدید علم نفسیات اور فنِ تنقید کی روشنی میں

از

شیخ محمد اکرام۔ ام۔ اے۔ ایم۔ آر۔ سی۔ اے۔ ایس
آئی۔ سی۔ ایس

ناشر۔ تاج آفس، محمد علی روڈ۔ بمبئی